بابر

(ایک معرکہ آرا تاریخی ناول)

YOUSUF LIBRARY
Lal chand Bagh Sir syed
Road Mirpurkhas 69000

— از —
رئیس احمد جعفری

— ناشر —
بک کارپوریشن، آرام باغ روڈ
کراچی

شہنشاہ بابر

(تاریخی ناول)

پہلا اڈیشن
سنہ ۱۹۶۵ء

تعداد اشاعت
ایک ہزار

مطبوعہ
نظام سنز پریس کراچی

انتساب

○

اولوالعزم بابر کی قائم کی ہوئی سلطنت کے آخری تاجدار
بہادر شاہ ظفر کے نام
جن کی حالت بقول خود یہ تھی
نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا سرور ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

○

پیش لفظ

ہندوستان کی سرزمین پر مختلف اطراف سے حملے ہوئے۔ سکندر اعظم سے لے کر، محمود غزنوی ـــــ جو کسی طرح سکندر اعظم سے کم نہ تھا ـــــ تک، اس ملک پر نہ جانے کتنے عظیم المرتبت اور جلیل القدر فرماں رواؤں نے چڑھائیاں کیں، اسے فتح بھی کیا، لیکن وہ ایک طوفان کی طرح آئے اور ایک طوفان کی طرح واپس چلے گئے۔

لیکن فرغانہ کا وہ من چلا، اور جسور و غیور نوجوان ـــ بابر ـــ جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو واپس نہ جانے کے ارادہ سے، وہ فاتح کی حیثیت سے آیا اور پھر یہیں کا باشندہ بن گیا۔ اس نے اس ملک کو بہت کچھ دیا، باغات، نہریں، پھل، پھول، عمارتیں، نئی تہذیب، نئی زبان، اور نئے اقدار۔

بابر کی نسل میں جتنے بڑے لوگ پیدا ہوئے شاید ہی کسی بادشاہ کی نسل میں متواتر ایسے اعاظم پیدا ہوئے ہوں، ہمایوں، اکبر۔ جہانگیر، شاہجہان عالمگیر تک تو سب اتنے بڑے ہیں کہ ان کی بڑائی سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا، پھر زوال آشنا ہونے کے بعد بھی اس خاندان میں اچھے اور بڑے لوگ پیدا ہوتے رہے، یہاں تک کہ ظہیر الدین بابر کی قائم کی ہوئی حکومت سراج الدین بہادر

شاہ ظفر پر ختم ہوگئی۔ ظفر اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا لیکن عظمت کا تاج انگریز بھی اس سے نہ چھین سکے۔

خالص تاریخی واقعات کا جہاں تک تعلق ہے، ان کا حاشیہ میں ذکر کر دیا گیا ہے جس سے ان کے استناد کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

رئیس احمد جعفری
۹۸ ٹیگور پارک لاہور

گردشِ آسماں

○

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے
(اقبال)

(۱)
خانقاہ

۱۴ر فروری ۲۷ء

رات کا وقت ہے!

بجلی چمک رہی ہے، بادل گرج رہے ہیں بارش ہو رہی ہے۔ ابھی دو دن پہلے زبردست برفباری ہو چکی ہے۔ سردی ویسے ہی کچھ کم نہ تھی، اس برفباری نے اور آج کی بارش نے سارے شہر کو سرد خانہ بنا دیا ہے۔ ہر شخص بستر میں دبکا ہوا ہے۔ امیروں و دولت مندوں، اور رئیسوں کے ہاں انگیٹھیاں جل رہی ہیں، دورِ شراب جاری ہے، مصاحبوں اور ندیموں کی جماعت موجود ہے۔ غریبوں اور ناداروں کے ہاں، کوئی گدڑی میں، کوئی کمبل میں لپٹا ہوا کروٹیں بدل رہا ہے۔ خدا کو یاد کر رہا ہے اور دعا مانگ رہا ہے کہ اس طوفان باد و باراں سے نجات ملے۔

تمام راستے سنسان پڑے ہوئے ہیں۔ سڑکوں پر سناٹا چھایا ہوا ہے۔ لوگ گھروں میں، جانور کھیتوں میں پناہ گزیں ہیں۔

شہر سے کئی میل کے فاصلہ پر ایک خانقاہ ہے۔ خانقاہوں میں ویسے ہی کونسی رونق اور چہل پہل ہوتی ہے، یہاں نہ جام کھنکتے ہیں، نہ بادہ و ساغر کا شغل ہوتا ہے

نہ سیم وزر کی نمائش ہوتی ہے، نہ دولت و ثروت کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ نہ قوت و طاقت، اقتدار اور اختیار اور سطوت و شوکت کی نمائش ہوتی ہے، نہ ملک گیری اور کشور کشائی کی تدبیریں سوچی جاتی ہیں، نہ جاگیر، مال غنیمت اور انعام و اکرام کے منصوبے تیار ہوتے ہیں، نہ جوڑ توڑ کا یہاں چلن ہے، نہ ریشہ دوانی، اور سازش کی کارفرمائی، یہاں تو بس وہ چند لوگ رہتے تھے جنھیں نہ دنیا سے مطلب ہے نہ دنیا والوں سے، دنیا ان کے پیچھے پیچھے دوڑتی ہے مگر یہ اس سے نفرت کرتے ہیں، گریزاں رہتے ہیں، نہ انھیں مرغ و ماہی کی لذت سے سروکار ہے، نہ حریر و پرنیاں سے کوئی واسطہ نان جویں ان کی غذا ہے، جامۂ تار تار، ان کا لباس، شاعروں کے تصیدے اس محفل میں بار نہیں پاسکتے، مصاحبوں اور ندیموں کا یہاں گزر نہیں۔ امور دنیا اور ارباب دنیا کا اس جگہ پرچا نہیں ہوتا۔ یہاں تو نماز اور روزہ، تسبیح و درود، عبادت و ریاضت اور قال اللہ و قال الرسول کے سوا نہ کوئی ذکر تھا نہ شغل،

وظیفے سب چھٹے اک نام تیرا
دعائے شام ہے ورد سحر ہے

یہ نفوس قدسی جو اس خانقاہ میں رہتے تھے، کچھ عجیب تیور اور عجیب ڈھب کے لوگ تھے، ان کی تربیت میر خانقاہ ـــــ حضرت ناصر الدین خواجہ احرار ـــــ نے کچھ اس طرح کی تھی کہ شاہوں اور شہنشاہوں کے سامنے ان کی گردن اکڑی ہوئی رہتی تھی مگر خدائے نادیدہ کے تصور میں یہ ہمہ وقت سربسجود رہتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ امرائے دولت، خاندان شاہی اور خود شاہ فرغانہ عمر شیخ کی طرف سے گراں بہا ہدیے پیش ہوئے، جاگیریں پیش کی گئیں، سونے اور چاندی کے سکے پیش کئے گئے مگر حضرت نے نگاہ غلط انداز سے بھی ان چیزوں کی طرف نہ دیکھا اور کیوں دیکھتے؟ جو خدا کا ہو رہتا ہے پھر وہ نہ کسی کے سامنے جھکتا ہے نہ دست سوال دراز کرتا ہے۔

حضرت خواجہ احرار کی بزرگی اور کرامت کا ہر چہار طرف شہرہ تھا۔ آپ صوفی باصفا تھے۔ مرد حق آگاہ تھے۔ درویش پاک باطن تھے۔

کتنے گمراہ تھے جو اس آستانے پر آکر، راہ یاب ہو گئے۔ کتنے ہوا و ہوس کے بندے تھے جو اس بارگاہ میں پہنچنے کے بعد عابد و زاہد ہو گئے۔ کتنے شرابی اور مجرم تھے جو یہاں پہنچے اور ایک ہی نگاہ کیمیا تاثیر کے باعث سب کچھ چھوڑ چھاڑ صرف خدا کے ہو رہے۔ زن و فرزند، مال و متاع کسی چیز میں بھی کشش باقی نہ رہی۔

یوں تو فرغانہ کا بچہ بچہ حضرت خواجہ احرار کا معتقد اور آستانہ بوس تھا لیکن شاہ فرغانہ عمر شیخ کو بھی حضرت کی ذات گرامی سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ اس نے بارہا حاضر باشی اور آستاں بوسی کی اجازت طلب کی مگر جواب ہر مرتبہ نفی میں ملا۔ حضرت ارشاد فرمایا کرتے تھے:

بادشاہ کو فقیر سے اور فقیر کو بادشاہ سے کیا کام؟ فقیر کا جھونپڑا بادشاہ کی پذیرائی نہیں کر سکتا۔ بادشاہ کا محل فقیر کے لیے تنگ ہے۔"

جب بھی عمر شیخ کے دل میں حاضر ہونے کی لہر اٹھتی یہی جواب ملتا اور وہ ایک آہ سرد بھر کر خاموش ہو جاتا۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ خلاف مرضی حاضر ہو جاتا۔

(۲)

مہمان کا انتظار

بارش اسی طرح جاری تھی!

بجلی چمک رہی تھی، بادل گرج رہے تھے، اور اب بڑے بڑے اولے بھی گرنے لگے تھے۔

سردی اور زیادہ چمک گئی تھی ـــ بہت زیادہ!

رات کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے۔ حضرت اوراد و وظائف سے فارغ ہوئے۔ خادم خاص سلیمان نے حاضر ہو کر خانقاہ کا دروازہ بند کرنے کی اجازت طلب کرتے ہوئے عرض کیا۔

"حضور اب ذرا دیر آرام فرمائیں، کچھ عرصہ بعد تہجد کا وقت آجائے گا اور پھر فجر تک آپ ....."

حضرت نے قطع کلام کرتے ہوئے فرمایا:

"سلیمان! نیند انھیں زیادہ آتی ہے جو شکم سیر ہو کر کھاتے ہیں، آرام کی ضرورت انھیں زیادہ ہوتی ہے جو راحت و آسائش کی زندگی کے خوگر ہوتے ہیں ـــ اگر تمہیں نیند آرہی ہے تو جاؤ سو رہو جا کر!"

"اور حضور ـــ"

"ہم خود ہی دروازہ بند کر دیں گے!"

"لیکن اب تو رات بہت زیادہ آگئی ہے۔"

"ہاں آگئی ہے، ہم جانتے ہیں لیکن ابھی ہم انتظار کریں گے!"

سلیمان چونک پڑا!

وہ سوچنے لگا، حضرت کس کا انتظار کر رہے ہیں؟ کون ہے جو اس وقت آئے گا؟ اور وہ شخصیت کس کی ہو سکتی ہے جس کے انتظار میں حضور سراپا اشتیاق و انتظار بنے ہوئے ہیں؟

بادشاہ فرغانہ عمر شیخ کی؟

نہیں! ـــ عمر شیخ کی شخصیت میں یہ کشش کہاں؟

میں خود اس حقیقت کا گواہ ہوں کہ بیچارے نے بارہا حاضر ہونے اور آستاں بوس ہونے کی اجازت طلب کی، مگر کبھی بھی اذن باریابی عطا نہ ہوا۔

پھر وہ کون ہو سکتا ہے؟

سلیمان یہی سوچ رہا تھا کہ حضرت نے فرمایا:

"سردی بڑھتی جا رہی ہے، ہوا کے جھکڑ چل رہے ہیں تمہاری آنکھیں بھی خواب آلود ہو رہی ہیں، جاؤ سو جاؤ!"

سلیمان نے عرض کیا "جب تک وہ نہ آجائے جس کے حضور منتظر ہیں میں بھی نہیں سو سکتا۔"

حضرت کے لب مبارک ذرا دیر کے لیے تبسم سے آشنا ہوئے پھر آپ نے فرمایا:

"ہم تمہیں منع نہیں کرتے!"

مشکل سے چند لمحے گزرے ہوں گے کہ سنسان سڑک پر گھوڑے کی ٹاپوں کی صدا بلند ہوئی۔

حضرت نے سلیمان سے کہا:-

" ہمارے سرہانے جو کوزہ رکھا ہے اس میں چند کھجوریں پڑی ہیں ایک لے آؤ!"

سلیمان بھاگ کر گیا اور ایک کھجور لاکر حضرت کی خدمت میں پیش کردی، لیکن دل ہی دل میں وہ سخت متحیر تھا کہ اسی وقت کھجور طلب کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ سوار خانقاہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔

وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ گھوڑے سے اترا، وہ ایک کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ گھوڑے کی لگام اس نے دروازے کی زنجیر سے باندھ دی اور آہستہ آہستہ اسی حجرے کی طرف بڑھا جو حضرت کا مسکن تھا!

---

(۳)

بادشاہ فقیر کے دربار میں

سوار آہستہ آہستہ قدم رکھتا حجرے تک پہنچ گیا اور دروازے پر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

حجرے کے اندر ایک شمع جل رہی تھی، حضرت اپنی مسند پر جلوہ فرما تھے سلیمان ادب سے سر جھکائے سامنے کھڑا تھا — اور وہ سوار دروازے پر اس طرح کھڑا ہوا تھا، جیسے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ ہے۔ نہ حجرے میں داخل ہو سکتا ہے نہ واپس جا سکتا ہے!

سلیمان نے سوالیہ نظروں سے حضرت کی طرف دیکھا، آپ نے فرمایا:-

" بلا لو!"

سلیمان اسے اپنے ساتھ لے آیا۔

یہ ایک دراز قامت، وجیہ اور بارعب شخص تھا، اس کے چہرے پر شاہانہ تمکنت تھی، اس کی آنکھوں سے جلال شہریاری ہویدا تھا اس کے انداز و اطوار سے شان خسروانہ کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ سلیمان سخت حیرت میں تھا کہ یہ کون شخص ہے اور اس وقت کیوں آیا ہے؟ اتنے میں سوار نے کچھ عرض کرنے کے لیے لب کشائی کی مگر حضرت نے

اسے بولنے کا موقعہ نہ دیا، فرمایا:۔

" کھڑے کیوں ہو؟ عمر شیخ: بیٹھو، بیٹھ جاؤ!"

یہ ہے عمر شیخ؟

یہ ہے فرغانہ کا شہنشاہ اعلیٰ؟

یہ ہے وہ فرماں روا جس کی نہیب شمشیر سے دشمن کانپتے ہیں؟ جس کی تیغ براں کا لوہا سب مانتے ہیں؟ جس کی سطوت و حشمت کے سامنے حریف پنجۂ فگن کانپنے اور لرزنے لگتا ہے؟

یہ ہے وہ سلطان ذی حشم جو آستانۂ فقر پر سر جھکائے حاضر ہوا ہے؟

سلیمان یہی سوچ رہا تھا کہ عمر شیخ نے کہا:

" میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ حضرت کی زیارت ہوگئی"۔۔۔

حضرت نے تبسم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

" لیکن عمر شیخ، اس مرتبہ تم نے اجازت نہیں طلب کی اور آ گئے؟"

عمر شیخ نے سراپا التجا اور نیاز بنتے ہوئے جواب دیا:

" غلام میں یہ تاب و تواں کب تھی لیکن۔۔۔

حضرت نے قطع کلام کرتے ہوئے فرمایا:

" لیکن تم آئے نہیں بھیجے گئے ہو؟ ۔۔۔ کیا یہی بات ہے؟

عمر شیخ نے ایک جھرجھری لے کر عرض کیا:

" بجا ارشاد ہوا، غلام حاضر نہیں ہوا، بھیجا گیا ہے، اور آج غلام نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ حضرت کا دیدار حاصل کر کے اور ۔۔۔ دعائے خیر و برکت لے کر واپس جائے گا۔

" لیکن اتنی رات گئے؟"۔۔۔ اگر ہم سو رہے ہوتے؟"

" میرا بھی خیال تھا کہ حضرت آرام فرما رہے ہوں گے اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس

آستانہ گرامی پر بیٹھ جاؤں گا"

" رات بھر؟"

" رات بھر بیٹھا رہوں گا صبح جب حضرت برآمد ہوں گے تو قدمبوسی کی سعادت حاصل کر کے واپس جاؤں گا"

" لیکن آنے کا مقصد؟"

" یوں تو ایک عرصہ سے حاضری کا اشتیاق تھا لیکن اس سگ آستاں کو اجازت ہی نہ ملی کہ حاضر ہو سکتا اور آج ۔۔۔

" ہاں آج کیا خاص بات ہوئی؟"

" آج خدا نے میری ایک حسرت دیرینہ پوری کر دی ہے ۔۔۔

حضرت نے ایک عجیب کیف کے عالم میں فرمایا:

" وہ خدا ہی ہے جو سب کا سہارا ہے۔ مایوس اس کے در سے امیدوں اور آرزوؤں میں کامیاب ہو کر واپس آتے ہیں۔ فقیر اسی سے مانگتے ہیں اور انھیں شہنشاہی عطا ہو جاتی ہے۔ شہنشاہ اسی سے گڑگڑا گڑگڑا کر دشمن پر فتح یابی کی دعا مانگتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ اولاد صالح کی التجا کرتے ہیں اور ۔۔۔

بے تابانہ جوش کے ساتھ عمر شیخ نے کہا:

" غلام نے بھی فرزند کی دعا مانگی تھی وہ آج پوری ہو گئی۔ میرے اندھیرے گھر میں اجالا ہو گیا۔ میری آرزو پوری ہو گئی، اب میں لاولد نہیں ہوں۔ اب مجھے یہ فکر نہیں ہے کہ میرے بعد میرا نام روشن کرنے والا۔ میرے آباء اجداد کا جھنڈا لہرانے والا۔ میری سلطنت کا سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے۔ خدا نے مجھے ایک بچہ مرحمت فرمایا ہے اور اسے لے کر اس سردی اور بارش میں اس نفس سی جان کو لے کر میں آستانہ عالیہ پر حاضر ہوا ہوں۔ میری، اور مجھ سے زیادہ اس نومولود کی ماں کی یہ خواہش ہے کہ یہ بچہ حضور کے

قدموں میں ڈال دیا جائے۔ حضور ہی اپنی زبان مبارک سے اس کا نام تجویز فرمائیں تاکہ اس برکت سے خدا اسے عمر دراز عطا فرمائے، اسے اقبال بخشے، اسے قابل بنائے کہ لوگ کہہ اٹھیں "اگر پدر نتواند پسر تمام کند!"

یہ کہہ کر عمر شیخ نے وہ کمبل جو ادھڑے ہوئے تھا ہٹایا۔ سینے پر گردن سے بندھی ہوئی ایک گٹھڑی لٹک رہی تھی۔ وہ گٹھڑی اس نے نکالی اور حضرت کے سامنے رکھ دی۔ اس میں ایک ننھا سا بچہ تھا! ـــــ جو ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا اور رونے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس بچہ کو دیکھ کر حضرت پر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی۔ حضرت نے فرمایا:

"عمر شیخ؟"

عمر شیخ نے ادب سے آنکھیں اٹھا کر حضرت کی طرف دیکھا اور خاموش رہا۔ آپ نے فرمایا:۔

"ہم نے اس کا نام ظہیر الدین رکھا!" ـــــ یہ ظہیر الدین ہے، ظہیر الدین، یعنی دین کا پشت پناہ، دین کا حامی اور نگہبان۔

عمر شیخ کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ اس نے والہانہ انداز میں کہا۔

"ظہیر الدین، کتنا مبارک نام ہے، بے شک حضور کا رکھا ہوا نام بے اثر نہیں ہو سکتا۔ بے شک یہ دین کا پشت پناہ ثابت ہوگا۔ یہ دین کا حامی اور نگہبان ہوگا۔"

حضرت نے اور زیادہ کیف کے عالم میں فرمایا:۔

"یہ مرد غازی ہے، دنیا اسے غازی کے نام سے پکارے گی۔"

دفور مسرت سے عمر شیخ کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"حضور کا نفس اسے غازی ہی بنا سکتا ہے!"

حضرت نے اسی کیفیت کے عالم میں فرمایا:۔

"یہ حامی دین متین ہے۔ یہ مرد غازی ہے، یہ کشور کشا ہے، یہ نصیر الدین ہے یہ جلال الدین ہے، یہ نور الدین ہے۔ یہ شہاب الدین ہے، یہ محی الدین ہے۔

عمر شیخ محویت کے عالم میں حضرت کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا اور آپ فرما رہے تھے۔

"اس کی نسل میں وہ لوگ پیدا ہوں گے، جو ہمایوں بخت ہوں گے جنھیں دنیا شہنشاہ اکبر کے نام سے یاد کرے گی، جو اپنے وقت کے جہانگیر ہوں گے۔ جو شاہجہاں کہلائیں گے جن کی حکومت عالمگیر ہوگی۔"

اس طرح جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ اس طرح جیسے کوئی محویت اور استغراق کے عالم میں ہو، عمر شیخ حضرت کو تکے جا رہا تھا۔ اس کی زبان خاموش تھی۔ لیکن دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، اس کی زبان خاموش تھی لیکن تخیل کی دنیا میں، تصور کی دنیا میں وہ نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا ہوا تھا۔

وہ ایک چھوٹی سی حکومت کا تاج دار تھا۔ وہ جہانگیری اور عالمگیری کا متمنی نہیں تھا۔ وہ تو صرف یہ چاہتا تھا کہ یہ نومولود بڑا ہو کر اس کی جگہ سنبھال لے۔ جو حکومت اسے وراثت میں ملے گی اسے قائم رکھ سکے لیکن یہاں آ کر تو اس نے جو کچھ سنا وہ کچھ اور ہی تھا۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

یہ باتیں تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھیں جو حضرت ارشاد فرما رہے تھے اور چونکہ حضرت ارشاد فرما رہے تھے اس لیے اس کے غلط ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کیا واقعی یہ ننھا سا بچہ، جو آج اتنا بے بس ہے کہ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتا ایک ایسا زمانہ آئے گا جب اپنے وقت کا شہنشاہ بن جائے گا؟

مرد غازی بن جائے گا ؟ اس کی نسل میں وہ لوگ پیدا ہوں گے جو ہمایوں بخت ہوں گے جو شہنشاہ اکبر کہلائیں گے۔ جو اپنے وقت کے شاہجہاں ہوں گے، جو جہانگیر اور عالمگیر ہوں گے ؟

اولاد کو باپ پر فخر ہوتا ہے۔ حضرت کے فیض سے یہ نومولود بچہ فخرِ آب و جد ہوگا۔ میں اس پر فخر کروں گا اس کے آباد و اجداد اس پر فخر کریں گے ؟

یہ سوچتے سوچتے اس نے وہ گٹھڑی اٹھا کر پھر ایک مرتبہ سینہ سے لگائی،

حضرت نے فرمایا :۔

" عمر شیخ جلدی نہ کرو ـــــ ظہیر الدین ہمارا مہمان ہے۔ ہمیں اس کی کچھ خاطر تواضع تو کر لینے دو! "

عمر شیخ نے وہ گٹھڑی پھر حضرت کے سامنے رکھ دی،

ابھی تھوڑی دیر پہلے حضرت نے سلیمان سے ایک کھجور کا دانہ منگوایا تھا اور وہ اب تک حضرت کی مٹھی میں تھا۔ آپ نے مٹھی کھولی۔ کھجور کا ذرا سا ٹکڑا چبایا اور اس کے بعد اس کے منہ میں رکھ دیا، پھر فرمایا :

" اب تم ہمارے مہمان کو واپس لے جا سکتے ہو "

عمر شیخ نے وہ گٹھڑی پھر گلے سے باندھ لی، اذن رخصت طلب کیا، الٹے پاؤں واپس ہوا اور گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

سلیمان سراپا حیرت بنا یہ منظر دیکھ رہا تھا، حضرت نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا :۔

" سلیمان اب تم سو جاؤ " بہت رات آ گئی ہے "

سلیمان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آہستہ آہستہ حجرے سے باہر نکلا، خانقاہ کا دروازہ بند کیا اور اپنے حجرے میں آ کر لیٹ گیا۔

(۴)

محلسرا میں

شاہی محل میں ولی عہد سلطنت کی پیدائش نے ایک عجیب گہما گہمی اور رونق کا عالم پیدا کر رکھا ہے۔

یہ بچہ ظہیر الدین جس کا عرف " بابر " تھا، سارے محل کی آنکھ کا تارا بنا ہوا تھا یہ اگر باپ کی آنکھ کا نور تھا تو ماں کے دل کا سرور، یہ اگر دوستوں کے لیے ایک گل خندیدہ تھا تو دشمنوں اور حریفوں کے لیے خار دامن۔

اب اس کی عمر ایک سال سے کچھ زیادہ کی ہو چکی تھی۔ شریفہ ایک معزز خاندان کی خاتون تھی، یہ بابر کی رضاعی ماں تھی وہی اسے دودھ پلاتی تھی۔

ایک روز ننھے بابر نے نہ جانے کیوں شریفہ کی چوٹی زور سے پکڑ لی، ان ننھے سے ہاتھوں میں کچھ اس بلا کی قوت تھی کہ شریفہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ قتلغ نگار خانم عمر شیخ کی بیوی اور بابر کی ماں نے اسے با چشم پر آب دیکھ کر پوچھا :

" کیا بات ہے شریفہ! "

اس نے سر جھکائے جھکائے جواب دیا :

" دیکھ لیجیے! "

قتلغ نگار خانم نے دیکھا شریفہ کی چوٹی اب تک بابر کے ہاتھ میں ہے اور وہ کسی طرح اس مار پیچاں کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہے، وہ جلدی سے اٹھی اور اس نے بڑی مشکل سے شریفہ کی چوٹی اس کی گرفت سے آزاد کی اور کچھ غصہ، کچھ مسرت، کچھ ناز سے اسے دیکھتے ہوئے کہا،

"ابھی سے یہ لچھن ہیں تو آگے چل کر کیا کرے گا؟"

شریفہ جواب آزاد ہو چکی تھی کہنے لگی۔

"وہی کرے گا جو دادا اور نانا کرتے چلے آئے تھے۔ آخر تیمور کا پوتا، اور چنگیز کا نواسا[۱] لوگوں کی گردنیں نہیں کاٹے گا تو اور کیا کرے گا؟"

قتلغ نگار خانم کھلکھلا کر ہنس پڑی، اس نے زور سے بابر کے گال میں چٹکی لی اور کہا،

"کیوں رے تو بھی اپنے دادا اور نانا کے نقش قدم پر چلے گا؟"

شریفہ نے طنز بھرے لہجہ میں کہا

"چلے گا کیوں نہیں — آپ کو تو دعا کرنی چاہئے کہ چلے!"

قتلغ نگار خانم نے پندار اور رعونت کے ساتھ جواب دیا۔

"ہاں ہمارے ہاں تو ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے، نہ جانے کتنی مرتبہ دشمنوں کے کٹے ہوئے سروں کے مینار بنائے گئے[۲] بھیڑ اور بکری کی طرح دشمن قتل کیے گئے، اور یہی سچ بھی یہ ہے کہ جب تک مرد آدمی میں شیوۂ سپاہیانہ نہ ہو وہ مرد ہی کیا ہوا؟

[۱] بابر ماں کی طرف سے مغل اور باپ کی طرف سے ترک تھا۔ عمر شیخ تیمور کی اولاد میں تھا اور قتلغ نگار خانم کا باپ یونس خاں، چغتائی پسر چنگیز کی اولاد تھا۔
BABUR : DIAVIOT & DESPOT, P. 16

[۲] تاریخ ہند ذکا ماخذ)

شریفہ نے اور زیادہ کہا:

"ہاں اور کیا بہادری یہی تو ہے کہ اپنے جیسے آدمیوں کو بھیڑ بکری کی طرح ذبح کر کے کٹے ہوئے سروں کا مینار کھڑا کر دیا جائے — توبہ ہے، سوچتی ہوں تو ہول ہونے لگتا ہے!"

اور پھر دفعتہً شریفہ نے لپک کر بابر کو گود میں اٹھا لیا۔ سینہ سے لگایا۔ خوب سا پیار کیا اور کہنے لگی:

"نہیں میرا بچہ سنگ دل اور بے رحم نہیں ہو سکتا، وہ کٹے ہوئے سروں کے مینار نہیں بنائے گا۔ وہ — وہ —"

قتلغ نگار خانم نے تیوری پر بل ڈال کر کہا:

"شریفہ تم میرے بچہ کو بد دعا دے رہی ہو، آخر کیا کہنا چاہتی ہو تم؟ وہ کیا بنے گا؟"

شریفہ نے سہم کر جواب دیا:-

"بہت اچھا بادشاہ"

قتلغ نگار خانم نے اس کے ہراس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا:

"پگلی کہیں کی — اچھا بادشاہ، رحم دل نہیں ہو سکتا، میرا بچہ شہنشاہ بنے گا، ساری دنیا اس کے زیر نگیں ہوگی۔ وہ دشمنوں کے سر کاٹے گا اور ان کے مینار بنائے گا۔ وہ دشمنوں کو بھیڑ بکری کی طرح ذبح کرے گا اور اپنا سکہ چلائے گا اس کی تلوار سے خود سروں، سرکشوں اور باغیوں کا خون ٹپکا کرے گا۔ اس کی فوج ظفر موج، ساری دنیا پر قبضہ کرے گی۔ وہ کشور کشا ہوگا، فاتح ہوگا۔ نغمہ و سرود اور راگ رنگ سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہوگی!"

شریفہ اس طرح قتلغ نگار خانم کی باتیں سن رہی تھی جیسے وہ جو کچھ کہہ رہی ہے

وہ عالم وجود میں آچکا ہے وہ جیسے خوف زدہ سی ہوگئی۔ اس نے سہمگیں آنکھوں سے باہر کو دیکھا اور پھر اسے بستر پر لٹا دیا۔ قتلغ نگار خانم کہنے لگی۔

"ڈر گئیں شریفہ بیگم؟"

وہ بولی "مجھے تو ان باتوں کے سننے سے ہول آتا ہے۔ نہ جانے آپ کس طرح یہ باتیں کر لیتی ہیں۔"

قتلغ نگار خانم نے اور زیادہ لطف لیتے ہوئے پوچھا:-

"کبھی کسی جنگ میں بھی شریک ہوئی ہو؟"

وہ ہراساں ہو کر گویا ہوئی:

"خدا نہ کرے میری سرکار، بھلا عورتوں کو جنگ سے کیا کام؟"

قتلغ نگار خانم نے سوال کیا۔

"کیا میں عورت نہیں ہوں؟"

وہ اور زیادہ سہم کر گویا ہوئی:

"ہیں تو، ــــ مگر"

قتلغ نگار خانم نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے پوچھا،

"مگر کیا؟ ــــ کیا تمہیں شبہ ہے کچھ؟"

وہ بولی "نہیں سرکار یہ بات تو نہیں۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ کو تو بے شک یہ باتیں زیب دیتی ہیں۔"

قتلغ نگار خانم نے پھر سوال کیا:

"مجھ میں کون سے ــــ ایسے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں جیسی تم عورت ہو ویسی میں بھی ہوں؟"

شریفہ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"آپ ٹھہریں چنگیز کی بیٹی، تیمور کی بہو، آپ شیر دل نہ ہوں گی تو کون ہوگا؟ کیا شریفہ؟ جو چنگیز اور تیمور کا نام سن کر دہل جاتی ہے؟ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جس کے بدن کے؟"

قتلغ خانم نے مسکراتے ہوئے کہا:

"پھر تو تمہیں انسان کے بجائے بلی یا بکری ہونا چاہیے تھا!"

---

(۵)

جنگل کا بادشاہ

بابر اب بارھویں سال میں قدم رکھ چکا تھا، اگرچہ اس کی پرورش ناز و نعم میں ہوئی تھی، لیکن، وہ ایک شاہزادہ تھا، ایک مملکت کا، گو وہ بہت بڑی نہ ہو ولی عہد تھا۔ آگے چل کر اس کو "نام حکومت ہاتھ میں لینی تھی"، یہ ساری باتیں عمر شیخ کی نظر میں تھیں اور یہی سوچ کر اس نے اپنے لاڈلے اور چہیتے بیٹے کو فنونِ سپہ گری میں ابھی سے طاق کر دیا تھا۔ وہ بہترین تیر انداز تھا، اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا تھا۔ وہ بہت اچھا شمشیر زن تھا۔ سیر و شکار میں بھی مشغول رکھا جاتا تھا تاکہ حوصلہ بڑھے، مشق بڑھے، تجربہ میں اضافہ ہو۔ سیر و شکار کے دوران میں کئی مرتبہ بعض نازک مرحلے پیش آئے لیکن اس نے حواس بجا رکھے اور اپنی چستی اور دلیری سے اپنی جان بھی بچائی اور اپنے ساتھیوں کی بھی۔

عمر شیخ کو اپنے بیٹے پر فخر تھا،

عمر شیخ کو یقین تھا حضرت خواجہ احرار نے جو پیش گوئی اس نونہال کے لیے کی تھی، وہ ضرور پوری ہوگی، بابر کے طور طریقے، وضع و انداز، ہر چیز سے اندازہ ہوتا تھا کہ آگے چل کر یہ کچھ ہونے والا ہے — سالے کرنکوست از

بہارش پیدا۔

ایک مرتبہ بابر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ شکار کو گیا۔ بڑی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بہت پرندے مار لیے اور اب جھولی بھر کر یہ لوگ واپس آ رہے تھے کہ دفعتہً بابر کا گھوڑا بھڑکا، اور آگے بڑھنے سے کنی لگا لاکھ مہمیز لگائی گئی مگر اس نے ایک قدم بھی جنبش نہیں کی۔ دوسرے ساتھیوں کے گھوڑوں پر بھی ہراس طاری تھا اور وہ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایک ساتھی نے عرض کیا "ضرور اس طرف شیر ہے"۔

دوسرے نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"یہی وجہ ہے کہ گھوڑے بھڑک رہے ہیں"۔

تیسرے نے سہمے ہوئے انداز میں کہا:

"پھر ہمیں اپنی سمت بدل دینی چاہیے"۔

قریب تھا کہ سب لوگ باگیں موڑ کر پیچھے مڑیں کہ بابر کی آواز فضا میں گونجی،

"ایسا نہیں ہو سکتا!" — ہم اپنا راستہ نہیں بدلیں گے!"

ساتھیوں نے حیرت سے بابر کی طرف دیکھا مگر کسی میں یارا نہ تھا کہ کچھ کہتا۔ بابر نے شیر کی طرح گرجتے ہوئے کہا:

"ہم اپنا راستہ نہیں بدلیں گے، گھوڑا ایک جانور ہے، شیر بھی ایک جانور ہے، ہم انسان ہیں، اشرف المخلوقات، اگر گھوڑے آگے بڑھتے ہوئے جھجکتے ہیں تو اتر پڑو۔ چھوڑ دو انھیں ان کے حال پر۔ ہم پاپیادہ جائیں گے اور اسی راستے پر جائیں گے ہمیں اپنے دست و بازو پر، اپنی شمشیر خون آشام پر، اور سب سے بڑھ کر اپنے خدا پر بھروسہ ہے"۔

بابر کی یہ گفتگو جاری تھی، ساتھی "ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم" کے مصداق

اس کی طرف تک رہے تھے۔ نہ آگے بڑھنے کا یارا تھا نہ پیچھے ہٹنے کا حوصلہ، نہ تعمیل حکم کی جرأت تھی اور نہ نافرمانی کی ہمت۔ گھوڑے بھڑک رہے تھے، ٹاپیں مار رہے تھے، پیچھے کی طرف ہٹ رہے تھے، اور یہ سوار، یہ ساتھی ہراساں اور پریشان کاٹھی پر اس طرح جمے ہوئے تھے جیسے ایک بت!

بابر نے انتظار نہیں کیا وہ گھوڑے سے اتر پڑا اب کسی کے لیے بھی گاٹھی پر بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ سب اتر پڑے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قتل کی طرف جانے کے لیے اترے ہیں۔ جیسے زندگی سے مایوس ہو گئے ہیں۔

یہ سب لوگ اپنی جگہ کھڑے تھے کہ دفعتہً سامنے کی جھاڑیوں میں جنبش ہوئی، اور جنگل کا بادشاہ شاہانہ جاہ و جلال اور شوکت و عظمت کے ساتھ نمودار ہوا، وہ اپنی مقناطیسی آنکھوں سے، اس فوج کی طرف گھورنے لگا۔ گھوڑے بھڑک کر پیچھے بھاگے، کئی ساتھی بھی بدحواس ہو کر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئے اور داہنے بازو پر جو ایک ٹیلا تھا اس پر چڑھ گئے، لیکن بابر اپنی جگہ کھڑا تھا۔ اس طرح ثابت قدم جیسے ایک ہی وار میں وہ اس کی گردن اڑا دے گا، یہ آمنا سامنا ایک انسان اور ایک شیر کا نہ تھا، دو بادشاہوں کا تھا۔

اور کوئی بادشاہ اپنے حدود مملکت میں کسی حریف کا وجود گوارا نہیں کر سکتا وہ اگر رحم اور رواداری کا مظاہرہ کرے تو اس کی بادشاہت نہیں قائم رہ سکتی۔

جنگل کے بادشاہ نے اپنے پایۂ تخت کے مقابل اور اپنی نظروں کے بالکل سامنے ایک حریف کو آمادۂ جدال و قتال دیکھا اور پھر وہ ضبط نہ کر سکا۔

وہ دھاڑا اور اس گرج سے سارا جنگل ہل گیا۔

پرندے اپنے نشیمنوں میں چھپ گئے۔ دوسرے چوپائے جائے پناہ تلاش کرنے لگے۔

لیکن یہ ۱۲ سال کا نوعمر سلطان بدستور اپنی جگہ کھڑا تھا، بلکہ اب اس کی تلوار میان سے نکل آئی تھی، جو چند جاں نثار ساتھ تھے وہ بھی سوچنے لگے کہ جان کس طرح بچائی جا سکتی ہے؟ یہ جاں نثار مسلح دشمن کا مقابلہ کر سکتے تھے، فوج کا مقابلہ کر سکتے تھے لیکن ——

لیکن شیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی خونخوار آنکھوں اور خوں آشام پنجوں کا مقابلہ کرنے کی ان میں سکت نہیں تھی۔

شیر نے ایک جست لگائی۔ اور بابر کے ایک باڈی گارڈ اسماعیل کو چھاپ بیٹھا شاید اس کا پہلا حملہ بابر ہی پر ہوتا لیکن اس کا قد اپنے ہم عمروں میں دراز قامت ہونے کے باوجود اس شخص سے کم تھا۔ اسماعیل شیر کی گرفت میں پورے طور پر آچکا تھا، جو چند جاں نثار بابر کے ساتھ رہ گئے تھے، اب وہ بھی اسماعیل کا یہ حشر دیکھ کر گو ثابت قدم تھے، یعنی اپنی جگہ پر قائم تھے لیکن مفلوج ہو چکے تھے، ان میں جنبش کرنے کی سکت نہ تھی، وہ ایک لقمہ تر کی طرح شیر کے سامنے موجود تھے کہ اسماعیل سے فارغ ہو کر انھیں چبا ڈالے۔

لیکن بابر پر نہ ہراس تھا، نہ دہشت، اس نے شیر کو دوسرا حملہ کرنے کا موقع نہ دیا اور بجلی کی سی تیزی سے تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ اسماعیل کی ساکت لاش کے سامنے اس کا جسد بے جان بھی پھڑکنے لگا۔

بابر نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔

"اب تم لوگ آسکتے ہو۔ خطرہ ختم ہو گیا۔"

---

(۶)

شکار

سب لوگ ڈرے اور سہمے ہوئے حاضر ہوئے، سب کے چہروں سے ندامت آشکار تھی اور ساتھ ہی ساتھ دہشت بھی۔ دہشت اس بات کی کہ اب کیا ہوگا؟ اس فرض ناشناسی کی سزا کیا ملے گی؟ بابر نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ گھوڑے واپس لائے گئے، ان کی تلاش و جستجو میں بھی کافی وقت صرف ہوا اور پھر یہ مختصر سا قافلہ فرغانہ کی سمت روانہ ہوگیا۔

شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک دستۂ سپاہ، ہر طرح کے ہتھیاروں سے مسلح ملا۔ اس کی کمان شجاع کے ہاتھ میں تھی۔ یہ عمر شیخ کا مصاحب اور ندیم تھا اور فرغانہ کے رؤسا میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ عمر شیخ اور شجاع بچپن کے دوست تھے اور ایک دوسرے کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ شجاع کوئی بات کہے اور عمر شیخ اسے نہ مانے، یہی وجہ تھی کہ بابر اسے چچا کہا کرتا تھا۔ شجاع کو دیکھ کر بابر گھوڑے سے اتر پڑا۔ شجاع بھی گھوڑے سے کود پڑا۔ بیتابی کے ساتھ لپکا، اسے سینہ سے لگا لیا اور پھر اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹے کہاں رہ گئے تھے تم ــــ؟ بھلا سیر و شکار میں کوئی اتنی دیر بھی لگاتا ہے؟

تمہاری ماں نے روتے روتے برا حال کرلیا ہے اپنا اور تمہارے والد بھی سخت پریشان ہیں۔ مجھ سے یہ کیفیت نہ دیکھی گئی، تمہاری تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔"

پھر اس کی نظر، اسماعیل کی لاش اور شیر کے جسد بے جان پر پڑی، اس نے حیرت اور کسی قدر پریشانی کے ساتھ پوچھا،

"یہ کیا ہوا؟ ــــ اسماعیل کو کس نے قتل کیا؟"

بابر نے شیر کی طرف اشارہ کیا۔

"اس نے! ــــ لیکن میں نے اسے مار ڈالا!"

اور پھر اس نے شجاع کو ساری داستان از اول تا آخر سنا ڈالی۔ شجاع یہ باتیں سنتا جاتا تھا اور وفور غضب سے اس کا چہرہ تمتماتا جاتا تھا۔ اس نے خونی آنکھوں سے ان لوگوں کی طرف دیکھا اور خشونت بھرے لہجہ میں کہا:

"نمک حرامو! اس طرح حق نمک ادا کیا جاتا ہے؟ اگر شیر نے میرے بچے پر حملہ کردیا ہوتا تو کیا ہوتا؟ آج تمہاری خیریت نہیں۔ واپس چلو اور دیکھ لو اس نمک حرامی کی کیا سزا ملتی ہے؟ بے شک شیر سے تم بچ گئے، لیکن شمشیر سے نہ بچ سکو گے۔"

ان سب کے بدن کا خون خشک ہوچکا تھا، سب کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی، سب کو اپنا انجام صاف نظر آرہا تھا، لیکن بابر نے شفاعت کی اور کہا۔

"عم محترم انھیں کافی سزا مل چکی ہے، یہ خود اپنے دل میں نادم ہیں اور ضمیر کی خلش سے بڑھ کر کوئی سزا نہیں، میں نہیں چاہتا کہ آپ قبلہ و کعبہ (عمر شیخ) سے انھیں سزا دلائیں۔ ان کے لیے دوسری موزوں ترین سزا جو ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ انھیں ملازمت سے برطرف کردیا جائے اور کبھی سلطنت کی کسی ملازمت میں داخل نہ کیا جائے!"

شجاع اب تک دانت پیس رہا تھا اس نے نقشۂ بابر کے شانے پر ہاتھ رکھا، اور کہا،

خیر ان معاملات کا فیصلہ وہیں چل کر ہوگا، چلو!"

لیکن بابر اڑ گیا، اس نے کہا۔

" وعدہ کیجئے، آپ انھیں اس سے زیادہ کوئی سزا نہیں دلائیں گے جو میں ابھی عرض کرچکا ہوں۔"

شجاع نے بابر کی بات مان لی، اور سب ساتھ ساتھ روانہ ہوئے۔ بہت جلد فرغانہ پہنچ گئے۔

بابر جب محل میں پہنچا تو قتلغ نگار خانم کی آنکھیں روتے روتے سوج چکی تھیں وہ مصلے پر بیٹھی دعا مانگ رہی تھی اور شریفہ اس کے پاس بیٹھی زبان حال سے آمین کہہ رہی تھی، اسے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور قتلغ نگار خانم سے کہا:

" مبارک، میرا شہزادہ آگیا۔"

اور پھر اس نے اسے کلیجہ سے لگا لیا اور رونے لگی۔ اس حملے سے ابھی وہ سنبھلنے نہ پایا تھا کہ قتلغ نگار خانم غصے سے اٹھ کر اس طرف آئی، ماں کو دیکھ کر وہ بیتابانہ آگے بڑھا اور اس نے کہا:

" آپ اس قدر پریشان کیوں ہوگئی تھیں؟ کیا آپ کا خیال تھا، میں مر جاؤں گا، یا کوئی مجھے ہلاک کردے گا؟ نہیں امی حضور آپ کا بیٹا بزدل نہیں ہے، جب تک اس کے ہاتھ میں تلوار چلانے کی سکت ہے وہ کسی سے شکست نہیں کھا سکتا۔ کوئی اسے ہلاک نہیں کرسکتا!"

شریفہ سے ضبط نہ ہوسکا، کہنے لگی:

آئے بڑے بہادر، چھوٹے چھوٹے جانوروں اور پرندوں کا شکار کرنا کیا سیکھ لیا ہے اپنے آپ کو رستم داستاں سمجھنے لگے ہیں۔ کبھی شیر کا شکار کرو تو جانیں!"

بابر مسکرانے لگا، اس نے پوچھا" پھر کیا انعام دوگی مجھے؟"

شریفہ نے سینہ ٹھونک کر کہا" جو مانگو گے وہ ملے گا!"

بابر ہنسنے لگا" اور اگر ابھی اور اسی وقت اپنے شکار کیے ہوئے شیر کی لاش تمہارے قدموں پر لاکر ڈال دوں تو؟"

وہ بے اعتباری کے لہجہ میں بولی" ہاں کیوں نہیں تم تو شیر ببر کا شکار ابھی کر لاؤ گے جاکر جنگل سے!"

بابر نے شوخی کے ساتھ کہا" ابھی لو، پلک جھپکاتے ہیں!"

اور پھر چند لمحوں کے بعد، واقعی اس کے شکار کیے ہوئے شیر کی لاش محل کے صحن میں شریفہ کے پاؤں کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ بابر نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا:

" یہی ہے شیر ببر؟"

شریفہ ڈر کے مارے دور ہٹ گئی، قتلغ نگار خانم نے وقار اور تمکنت کے ساتھ پوچھا:

" بابر کیا تو نے اسے مارا ہے؟"

بابر نے ادب سے سر جھکا کر عرض کیا۔

" جی امی حضور، یہ کام آپ کے غلام نے انجام دیا ہے، اور وہ بھی تن تنہا، اور پھر صرف ایک ضرب میں!"

شریفہ کی دہشت اب کم ہوچکی تھی، وہ پھر اپنی جگہ پر آموجود ہوئی، کہنے لگی۔

" بیٹے اتنی بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔ خدا نظر بد سے بچائے ابھی سن ہی کیا ہے ذرا بڑے ہو تو پھر بے شک شوق سے شکار کرنا شیر کا!"

بابر نے پوچھا" تو گویا تمہیں اب تک یقین ہی نہیں آیا؟"

وہ گویا ہوئی" بیٹے میں صرف سچی باتوں ہی پر یقین کرتی ہوں!"

بابر کچھ جواب میں کہنے والا تھا کہ عمر شیخ آتا ہوا نظر آیا، اسے دیکھ کر بابر خاموش ہو گیا

باہر چلا گیا، عمر شیخ نے اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
نگار خانم، تمہارا یہ لڑکا تو بہت منچلا ہوتا جاتا ہے دن بدن!"

وہ ایک ادائے تفاخر کے ساتھ بولی:

"ہاں دیکھ لیا میں نے بھی، آج اس نے شیر مارا ہے!"

عمر شیخ نے سراپا مسرت بن کر کہا "ہاں، لیکن کس طرح یہ بھی سنا؟"

نگار خانم سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی اور عمر شیخ نے وہ ساری داستان سنا دی جو شجاع سے ابھی سنی تھی۔ مشرلیفہ نے یہ داستان سن کر کہا:

"کیوں نہ ہو، آخر کس باپ کا بیٹا، کس دادا کا پوتا، اور کس نانا کا نواسہ ہے؟"

نگار خانم سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی "اور ابھی تو تم اسے چھوٹا کہہ رہی تھیں؟"

وہ بولی "ملکہ عالیہ سچ تو یہ ہے کہ اگر جہاں پناہ نے تصدیق نہ کردی ہوتی تو میں اس بات کو غلط ہی سمجھتی۔ ابھی اللہ رکھے اس کی عمر ہی کیا ہے، لیکن ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، ماشاءاللہ ابھی سے آثار دلیری عیاں ہیں!"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک چوبدار ہانپتا کانپتا حاضر ہوا اور اس نے ادب سے سر جھکا کر عرض کیا،

"جہاں پناہ کے برادر عزیز سلطان احمد شاہ کی سواری حدود مملکت میں داخل ہو چکی ہے ——"

عمر شیخ نے کہا "ہم اس کے استقبال کو جائیں گے!"

---

(۵)

عائشہ

سلطان احمد کے آنے سے محل میں دھوم مچ گئی، یہ سمرقند کا بادشاہ تھا۔ اور اپنی حدود مملکت میں جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کر رہا تھا، بہادر تھا، زیرک تھا، ہوشیار تھا۔ اس کا علاقہ عمر شیخ کے علاقہ سے زیادہ سرسبز و شاداب، اور زرخیز تھا۔ ان بھائیوں میں کبھی ان بن ہو جاتی، کبھی تعلقات خوشگوار ہو جاتے، کبھی ٹھن جاتی، کبھی ایک دوسرے کے فداکار بن جاتے۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے تعلقات خوشگوار ہی چلے آ رہے تھے۔ آج سے چھ سال پہلے جب بابر کی عمر صرف چھ سال تھی عمر شیخ، اور قتلغ نگار خانم کی استدعا پر سلطان احمد نے اپنی ننھی سی لڑکی عائشہ کی منگنی اس سے کر دی تھی۔ یہ گڑیا گڈے کی منگنی تھی۔ بابر کو پتہ بھی نہیں تھا کہ منگنی کیا ہوتی ہے، یا شادی کسے کہتے ہیں؟ اس منگنی کو وہ ایک کھیل ہی سمجھا تھا، اور تھوڑے دنوں کے بعد اسے بھول بھی گیا تھا کہ عائشہ کوئی لڑکی تھی اور وہ اس کی منگیتر تھی۔ منگنی کے دن عائشہ کی عمر اور کم تھی، مشکل سے اس نے زندگی کی چار بہاریں دیکھی ہوں گی لیکن اب اس کی عمر دس برس کی تھی اور وہ خود بہار کا روپ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ پہلے وہ ایک نیم شگفتہ کلی تھی اور اب گل نودمیدہ کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ابھی تک وہ الھڑ تھی، نادان تھی، معصوم تھی۔ نہ دین سے واقف تھی

نہ دنیا کے امور سے ، لیکن اب وہ زمانہ غیر محسوس طور پر قریب آتا جا رہا تھا جب وہ پھول بن جائے گی " بہار بن جائے گی ۔ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے گی اور ایک بادشاہ کی ملکہ بن کر کاروبار مملکت میں حصہ لے گی ، شریفہ نے " قتلغ نگار خانم نے اور عمر شیخ نے اس معصوم سی ، لیکن شوخ اور شریر لڑکی کو اسی نظر سے دیکھا تھا۔

بابر نے کئی دفعہ عائشہ کو قریب سے دیکھا لیکن کوئی بات نہ کی ، نہ جانے کیوں وہ گم سم سا رہا ۔ عائشہ نے بھی اسے کئی مرتبہ دیکھا لیکن نظر بھر کر نہیں ۔ اس لیے بھی کسی قسم کی گفتگو نہیں کی ۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے ۔

ایک روز عائشہ " قتلغ نگار خانم کے پاس بیٹھی تھی وہ اس سے پیار کی باتیں کر رہی تھیں ۔ اتنے میں بابر آ گیا ' وہ بھی بیٹھ گیا اور باتوں میں شریک ہو گیا ۔ عائشہ نے کہانی کی فرمائش کی اور نگار خانم نے اسے ایک اچھی سی کہانی سنا دی ، پھر وہ کسی کام سے اٹھ کر محل کے دوسرے حصہ کی طرف گئیں ۔ عائشہ نے بھی اٹھنا چاہا لیکن بابر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا :

" فرغانہ تمہیں پسند آیا عائشہ ؟

عائشہ نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ کھلکھلا کر ہنس پڑی ، اور ایسا معلوم ہوا جیسے اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا ہے ۔ اس عجیب ہنسی سے لطف اندوز تو وہ کیا ہوتا چڑ گیا ۔ اس نے ذرا برہم لہجہ میں سوال کیا ۔

" کیا میرا یہ سوال اتنا مضحکہ خیز تھا ؟ آخر تم ہنس کیوں رہی ہو ؟

عائشہ نے ہنسی کو روکتے ہوئے جواب دیا ،

" ہنسی آپ کے سوال پر نہیں آئی ، آپ پر آئی ۔"

یہ مزید عجیب بات سن کر بابر اور زیادہ چکرا گیا ، اس نے غصہ کو دباتے ہوئے

بڑا نرم لہجہ میں سوال کیا ۔

" تمہیں مجھ پر ہنسی آئی ؟"

" جی ہاں آپ پر ! "

" لیکن کیوں ، کس بات پر ؟

وہ پھر ہنسنے لگی ، بابر نے پھر ایک مرتبہ اپنے غصہ کو ضبط کیا اور کہا ۔

" مجھے دیکھ کر اگر کوئی ڈر جائے تو ذرا حیرت نہ ہو ، کیونکہ اس محل میں اس شہر میں ، اس ملک میں ایسا کون ہے جو مجھ سے نہ ڈرتا ہو ، لیکن مجھے دیکھ کر اگر کوئی ہنسنے لگے ــــ

" لیکن بات بھی تو ہنسی کی ہے ! "

" وہی بات تو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں ؟

نہایت سادگی اور معصومیت کے ساتھ عائشہ نے کہا :

" میں سمجھتی تھی آپ گونگے ہیں ؟"

بابر پر گھڑوں پانی پڑ گیا ، سارا غصہ کافور ہو گیا ، اس نے کچھ جھینپتے ہوئے پوچھا ۔

" تم مجھے گونگا سمجھتی تھیں ؟ ــــ آخر کیوں ؟"

وہ بولی " اس لیے ، کہ میں نے آج پہلی مرتبہ آپ کو بات کرتے دیکھا ہے ، آپ کو بولتے سنا ہے !"

بابر نے کہا " اچھا یہ بات ہے ؟

اور پھر وہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا ، اور بڑی دیر تک ہنستا رہا ، جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا ہو اس پر ، پھر اس نے کہا :

" تم تو بڑی دلچسپ باتیں کرتی ہو عائشہ ! ــــ میں گونگا نہیں ہوں ، لیکن نہ جانے کیا بات ہے ، تمہیں جب بھی امی حضور کے پاس بیٹھا دیکھا جی چاہا میں بھی بیٹھوں ،

باتوں میں حصہ لوں، باتیں کروں، آیا، بیٹھا، باتوں میں حصہ لیا، لیکن باتیں نہ کر سکا!"

"کیوں؟ کس لیے؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا، کئی مرتبہ خود میں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا، مگر کوئی جواب نہ دے سکا!"

"پھر آج دفعتہً کیسے بول پڑے؟"

"یہ بھی ٹیڑھا سوال ہے!" —— جواب میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ بس بول پڑا۔"

"واہ یہ کیا بات ہوئی؟"

"سچ کہتا ہوں عائشہ آج بھی میں نے خاموش رہنے کی کوشش کی تھی، لیکن نہ جانے کہاں سے وہ قوت گویائی جو یہاں آکر معدوم ہو جایا کرتی تھی، واپس آگئی اور میں بولنے لگا۔"

"لیکن ایک بات تو بتائیے!"

"ضرور بتاؤں گا پوچھیے!"

"اب تو کبھی آپ گونگے نہیں بنیں گے؟"

بڑی مستعدی کے ساتھ بابر نے کہا "ہرگز نہیں"

عائشہ نے سوال کیا:

"تو پھر امتحان دوں آپ کا؟"

اس سوال پر بابر ایک مرتبہ پھر چکرا گیا۔ یہ کس قسم کی لڑکی ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ نہ جانے کیا امتحان لے گی، اگر کہیں فیل کر دیا تو اور مصیبت آجائے گی، پھر ہنسنا شروع کر دے گی میرے اوپر۔ میرے سامنے۔ پھر مجھے غصہ آئے گا۔ لیکن عادت، طبیعت اور مزاج کے خلاف پھر میں اسے ضبط کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا، کیوں مجبور ہو جاؤں گا؟ یہ کیا کیا کرلے گی میرا؟ یہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ —— یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، لیکن میں اس پر غصہ نہیں کر سکتا۔ اس سے لڑائی نہیں کر سکتا، اسے خفا نہیں کر سکتا۔ آخر کیا بات ہے اس میں

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ میں اس کے سامنے اپنے آپ کو کمزور کیوں محسوس کرنے لگتا ہوں؟ یہ مجھے اتنی اچھی کیوں لگتی ہے؟ اس کی باتیں اتنی دلچسپ کیوں ہوتی ہیں؟ یہ جی کیوں چاہتا ہے کہ بس اسی کے پاس بیٹھے رہیں، یا اس کی باتیں سنتے رہیں؟ ——

—— یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟

بابر کا جوش دیکھ کر عائشہ پہلے تو مسکرائی، پھر اس کے تیور بدلے، اور اس نے جبین پر شکن کے ساتھ سوال کیا:

"آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟ کیا پھر سے گونگے ہو گئے؟"

عالم خیال سے بابر چونک پڑا، اس نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا:

"نہیں عائشہ، یہ بات نہیں ہے"

وہ بولی "تو پھر میرے سوال کا جواب دیں کیا آپ امتحان دینے کو تیار ہیں؟"

تھوڑے سے تامل کے بعد وہ گویا ہوا "ہاں تیار ہوں میں امتحان دوں گا؟"

"اور اگر فیل ہو گئے؟"

"تو فیل کر دینا!"

وہ ہنس پڑی، پھر اس نے ایسے لہجہ میں جس میں التجا بھی شامل تھی، اصرار بھی، اور تحکم بھی، کہا:

"کوئی بڑی اچھی سی چٹ پٹی سی کہانی سنائیے۔"

"کہانی؟ ——"

"ہاں، کیا آپ کو کہانی نہیں آتی؟"

"سننی آتی ہے، کہنی نہیں آتی۔"

"سنا ہے آپ بڑے اچھے شکاری ہیں؟"

"کس سے سنا ہے؟"

"شریفہ خانم سے، اور چچی حضور سے!"

"ہاں ہوں تو!"

"تو پھر اپنے کسی شکار کی کہانی سنائیے، ــــ لیکن سچی!"

"سچی؟ ــ تو کیا میں جھوٹ بولتا ہوں؟"

آپ کے بارے میں تو مجھے نہیں معلوم، لیکن شریفہ خانم کے جھوٹے ہوئے ہیں تو ذرا بھی شبہ نہیں،

"ارے تم انھیں جھوٹا کہہ رہی ہو، وہ تو بڑی سچی ہیں۔"

"میں نہیں مانتی!"

"لیکن آخر اس بے اعتباری کا سبب بھی تو ہوگا؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ کل یہاں کہہ رہی تھیں کہ آپ نے چند روز ہوئے ایک شیر مارا تھا، کیا واقعی مارا تھا؟"

"ہاں بھائی، بالکل سچ، جس سے چاہو پوچھ لو!"

"بتائیے زخم کہاں ہیں آپ کے بدن پر؟"

"زخم؟ ــ زخم کیسے؟"

"آپ نے اتنا بڑا شکار کیا۔ لیکن آپ کے خراش تک نہیں آئی، کیا وہ کبوتر تھا کہ آپ نے پنجے سے گردن مروڑ دی اور وہ وہیں دم گھٹ کر مر گیا؟ اس نے بھی تو ہاتھ پاؤں چلائے ہوں گے؟ ایک آدھ پنجہ تو ضرور مارا ہوگا؟ لیکن آپ کے بدن پر کہیں زخم کا نشان نہیں نظر آتا، خراش تک کا نشان نہیں ہے!" ــ پھر بھی آپ کہیں گے کہ شریفہ خانم سچی ہیں؟"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ نہ جانے کہاں سے شریفہ خانم خود ہی ٹپک پڑیں۔ کہنے لگیں۔

"میرا نام کیوں لیا جا رہا ہے؟"

باہر کو راہ نجات مل گئی اس نے عائشہ سے کہا

"لو بھئی یہ شریفہ خانم آ گئیں۔ اب تم ان سے نمٹ لو!"

اور پھر شریفہ خانم سے کہا

"عائشہ کا خیال ہے کہ تم جھوٹ بولتی ہو!"

اور پھر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد شریفہ خانم نے شکوہ سنج انداز میں عائشہ کی طرف دیکھا اور پوچھا:

"کیوں بیٹی میں جھوٹی ہوں؟" وہ ہنسنے لگی، شریفہ خانم چڑ گئیں اور گویا ہوئیں،

"تم میرا مذاق اڑاتی ہو؟ ــــ یہ تمیز ہے؟"

وہ بدستور ہنستی ہوئی بولی،

"نہیں میں آپ کا مذاق نہیں اڑاتی لیکن جو آپ کا مذاق اڑاتا ہے اس سے تو کچھ نہیں کہتیں مجھ سے خفا ہو رہی ہیں۔"

شریفہ خانم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ ــــ"

وہ بولی "جی میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے آپ کو جھوٹا کبھی نہیں کہا!"

"تو کیا وہ جھوٹ بول رہا تھا؟"

"جی وہی جسے آپ نہ جانے کیا سمجھتی ہیں!"

شریفہ خانم کے لبوں پر تبسم رقصاں ہو گیا، کہنے لگیں:

"لڑکا ہے، بچہ ہے، اس عمر میں سب ہی شریر ہوتے ہیں!"

وہ بولی "لیکن میں تو شرارت نہیں کرتی ــــ"

"ہاں بیٹی تم کیا جانو شرارت کسے کہتے ہیں؟ ــ ابھی کل کی بات ہے

کسی نے میرے دودھ میں نمک گھول دیا تھا، اور میں اس کی پیٹھ پیچھے کھڑی یہ
تماشہ دیکھ رہی تھی، کیا اس کا نام بتاؤں ؟ ——
عائشہ ہنستی کھلکھلاتی بھاگ گئی۔
خود شریفہ خانم بھی اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کر سکیں۔
لیکن لڑکی کی ذہانت نے انھیں بہت متاثر کیا۔

ترکِ تیغ زن

(۱)

صفِ ماتم

اور ایک روز فرغانہ میں صف ماتم بچھ گئی!

عمر شیخ کا انتقال ہوگیا!"

یہ بہت بڑا حادثہ تھا، یہ بہت بڑا المیہ تھا، اس ایک شخص کی وفات نے ساری مملکت کا مستقبل تاریک کر دیا تھا، سارے ملک کو مبتلائے خطرات کر دیا تھا ہر سو اندیشہ و اضطراب کی کارفرمائی شروع ہوگئی تھی!

ہر شخص کے دل میں ایک ہی سوال تھا، ایک ہی بات تھی،

"اب کیا ہوگا؟"

بادشاہ آتے ہیں۔ اور جاتے ہیں، مسند نشین ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کرتے ہیں اور پیام قضا قبول کر کے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، پھر نیا بادشاہ آتا ہے اور مسند نشین حکومت ہو جاتا ہے۔ کاروبار مملکت میں کسی طرح کا اختلال واقع نہیں ہوتا۔ کام اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

لیکن عمر شیخ کی وفات ایک حادثہ تھی، ایک المیہ تھی!

اس لیے کہ اس کے سب سے بڑے بیٹے — بابر — کی عمر صرف ۱۲ سال کی تھی۔

یہ لڑکا، یہ بارہ سال کا لڑکا، بادشاہ ہوکر، تاج و تخت کس طرح سنبھال سکے گا؟ نظم مملکت کس طرح قائم رکھ سکے گا؟

دشمنوں کو کس طرح زیر کر سکے گا؟ اور امن و امان کیونکر قائم کر سکے گا؟

یہ تھا سوال جو ہر شخص کے دل میں تھا، ہر شخص کی زبان پر تھا۔

بے شک بابر بہادر تھا، جری تھا، حوصلہ مند تھا، دلیر تھا، جنگ جو تھا، صف شکن تھا، تیغ زن تھا، لیکن ——

لیکن ناتجربہ کار تھا، سرد و گرم زمانہ سے ناواقف تھا، دوستوں کی پرکھ اور دشمنوں کی شناخت سے عاری تھا، نظم مملکت اور رموز سلطنت سے ناواقف تھا، ایسا لڑکا اگر تخت حکومت پر بیٹھا بھی تو کتنے دن بیٹھ سکے گا؟ کتنے دن حکومت کر سکے گا؟ اس کا ساتھ دینا، اس کی رفاقت کرنا، اس سے جاں نثاری کا دعویٰ کرنا، نہ حال کے لیے سود مند ہے نہ مستقبل کے لیے خوش آئند!

پھر کیا ہوگا؟

وہ لوگ، جن کی وفاداری کی قسمیں کھائی جاتی تھیں جنھیں اس خاندان کی جاں نثاری پر فخر تھا، جو عمر شیخ کے دامن سے وابستگی پر نازاں تھے، اب وہ بھی پہلو بدل رہے تھے، سوچ رہے تھے کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ کس طرف کا رخ کریں؟

اس لیے کہ اس لاوارث حکومت کے بہت سے مدعی تھے۔ اس لڑکھڑاتی ہوئی حکومت کے تاجدار سے پرخاش رکھنے والوں کی کمی نہ تھی، اور یہ دشمن، یہ موقع پرست یہ اپنے مفاد و اغراض کی خاطر تلوار سونت کر میدان میں آجانے والے لوگ، دشمن نہ تھے، مخالف نہ تھے، اپنے تھے، عزیز قریب تھے۔ ہم جد اور ہم خاندان تھے۔ خجند کا فرماں روا سلطان احمد مرزا تھا، اور یہ سلطان احمد مرزا سگا چچا تھا، سمرقند کی حکومت جس شخص کے ہاتھ میں تھی وہ بھی کوئی غیر نہ تھا، چچا تھا، خسر تھا، باپ کی جگہ تھا، کاشغر کی

حکومت ابوبکر میرزا دوغلات کے ہاتھ میں تھی، اور یہ سب تاک میں تھے کہ موقع ملے اور فرغانہ کو ہڑپ کر لیں، اپنے حدود مملکت میں توسیع کریں۔ اور اس یتیم اور نوعمر بادشاہ کو تاج و تخت سے محروم کر دیں، اور ان لوگوں کے یہ ارادے ڈھکے چھپے نہ تھے، ان کی نیت اور ان کے عزائم کا سب کو علم تھا اور یہی سبب تھا کہ قبل اس کے کہ فرغانہ پر سمرقند یا خجند، یا کاشغر، یا کسی اور طرف سے حملہ ہو، بہت سے پرانے وفادار اور جاں نثار سنجیدگی کے ساتھ سوچنے لگے تھے کہ کیا کریں؟ کدھر جائیں؟ کس کا ساتھ دیں؟

اور بابر خود بھی ان خطرات سے ناواقف نہ تھا۔

باپ کی زندگی میں اسے کوئی فکر نہ تھی، وہ ہر وقت خوش رہتا تھا، صید و شکار میں مصروف رہتا تھا، دوستوں، مصاحبوں اور ندیموں کے جمگھٹ میں شب و روز بسر کرتا تھا، کبھی کبھی عائشہ کی من موہنی باتیں یاد کر لیتا تھا، کبھی کبھی عالم تصور میں اس کے روئے زیبا کا نظارہ کر لیتا تھا، اور پھر عیش و نعم میں مصروف ہو جاتا تھا، جیسے عائشہ بھی اس کی ہے، فرغانہ کی حکومت بھی اس کی ہے بلکہ یہ ساری دنیا اس کی ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے، اس کی کوئی خواہش اور آرزو ایسی نہیں جو چشم زدن میں پوری نہ ہو سکے۔ لیکن اب

لیکن اب، —— باپ کے مرتے ہی، انقلاب عظیم رونما ہو گیا، گو وہ مالک تاج و تخت تھا، اور اس کے سامنے جو لوگ تھے، وہ اس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے، اسے رستم و افراسیاب کا مدمقابل قرار دے رہے تھے، اس کے بہترین مستقبل کی پیشین گوئیاں کر رہے تھے، اس کے ایک اشارہ پر ہزار جانیں قربان کر دینے کا اعلان کر رہے تھے، زندگی کی آخری سانس تک پیمان وفا نباہنے کا عہد کر رہے تھے، لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی زبانیں میرے ساتھ ہیں، لیکن دل میرے ساتھ نہیں ہیں ان کے منہ سے

نکلے ہوئے الفاظ صرف الفاظ ہیں ان کی پشت پر نہ خلوص ہے، نہ صداقت، نہ وفا!

باپ کی آنکھیں بند ہوئیں اور اس کی آنکھیں کھل گئیں!

وہ سوچنے لگا، میرا، میرے خاندان کا، اور میرے ملک کا مستقبل کیا ہوگا؟ یہ سلطنت جو میرے باپ نے بڑی محنت سے قائم کی تھی، اب میرے ہاتھوں، میرے زمانہ میں قائم رہ بھی سکے گی یا نہیں؟ ایک وہ اولاد ہوتی ہے جو باپ کی جانشین بن کر اس کا نام روشن کرتی ہے۔ اس کے کارناموں کو حیات تازہ بخشتی ہے، اس کی ناتمام حسرتوں اور آرزوؤں کو پورا کرتی ہے۔ کیا میں بھی ایسا ہی بیٹا بن سکوں گا؟ کیا میں اپنے باپ کا نام روشن کرسکوں گا؟ کیا میں اپنے مرحوم باپ کی ناتمام حسرتوں اور آرزوؤں کو پورا کرسکوں گا؟ ——— اور اس مرنے والے کی حسرت اور آرزو اس کے سوا اور کیا تھی کہ فرغانہ کی حکومت قائم رہے؟

کیا میں اتنا بھی نہیں کرسکتا؟

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ شجاع آتا نظر آیا، یہ وہی شخص تھا جس کی عمر شیخ صدر جہ تعظیم و تکریم کیا کرتا تھا، جس کے خلوص اور صداقت پر اسے غیر معمولی اعتماد تھا جسے ہمیشہ وہ "بھائی" کے خطاب سے یاد کیا کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ بابر اسے عم محترم کہہ کر پکارتا تھا، شجاع کو آتا دیکھ کر بابر کے دل میں کچھ تقویت سی پیدا ہوگئی۔ وہ بیتابانہ اٹھا اور اس کے گلے سے لگ گیا۔

شجاع کی آنکھیں پرنم تھیں، اس کی چشم نمناک دیکھ کر بابر کی آنکھیں بھی پرآب ہوگئیں۔ شجاع نے شفقت اور محبت کے ساتھ بابر کے سر پر ہاتھ پھیرا پھر پیار بھرے لہجہ میں گویا ہوا۔

"بیٹا، بہت بڑی ذمہ داری تم پر آپڑی ہے۔ خدا کرے خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس گراں بار ذمہ داری کو تم سرانجام دے سکو!

بابر نے ان الفاظ سے اپنا حوصلہ ابھرتا ہوا محسوس کیا، اس نے کہا،

"عم محترم! میں نہیں کہہ سکتا کہ ان گراں بار ذمہ داریوں کو اچھی طرح سرانجام دے سکوں گا یا نہیں لیکن ایک بات ضرور عرض کرسکتا ہوں، وہ یہ کہ جب تک زندہ ہوں فرغانہ کا پرچم سرنگوں نہ ہونے دوں گا!"

یہ کہہ کر بابر نے کچھ اور حوصلہ افزا الفاظ سننے کے لیے پرامید نظروں سے شجاع کی طرف دیکھا، لیکن اس کے چہرے پر گرم جوشی کے بجائے سرد مہری کے آثار نظر آئے، اس نے کہا۔

"بیٹے تم نے بڑے شاندار الفاظ استعمال کیے ہیں!"

یہ کہہ کر وہ چپ ہورہا۔ بابر کے سینہ پر شجاع کے یہ الفاظ تیر کی طرح لگے، لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور بجھے ہوئے لہجہ میں گویا ہوا،

"کیا آپ کی سرپرستی، شفقت، اور رہنمائی قدم قدم پر مجھے حاصل نہیں رہے گی؟"

شجاع نے ایک لمحہ تامل کے بعد جواب دیا۔

"میں تمہارا خیر خواہ ہوں، یہ اندیشہ نہیں۔ میری دلی آرزو ہے کہ تم شاد کام، اور بامراد زندگی بسر کرو۔ لیکن بیٹے اس بڑھے کی نصیحت کان کھول کر سن لو ———"

بابر نے کان کھول لیے اور گوش ہوش سے عم محترم کی باتیں سننے لگا۔ عم محترم نے فرمایا،

"بے شک تم صید و شکار کے فن میں ماہر ہو، لیکن جنگ کیا ہوتی ہے یہ نہیں جانتے ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ ———"

بابر یہ باتیں سن کر چونک پڑا، اس نے کہا،

"جنگ؟ ——— لیکن میں تو کسی کا دشمن اور بدخواہ نہیں ہوں، نہ کسی سے جنگ کرنا چاہتا ہوں، اور میرا خیال ہے کہ کم از کم فی الحال کوئی معلوم یا نامعلوم دشمن فرغانہ پر حملہ بھی کرنے والا نہیں ہے۔ اس وقت تو ضرورت داخلی امن و سکون کی ہے!"

شجاع نے ایک منجم کی طرح آسمان کی طرف دیکھا اور کہا،

"پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہونے والا ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا، کوئی فرد و بشر بھی امورِ غیب کا علم نہیں رکھتا لیکن میں نے غلط نہیں کہا کہ تم ابھی نوآموز اور ناتجربہ کار ہو، تم شیر کا شکار کر سکتے ہو، لیکن فوج کی کمان نہیں کر سکتے۔ تم کلہ یہ کلہ حریف سے جنگ کر سکتے ہو لیکن، دشمن کی فوج کو شکست نہیں دے سکتے۔ تم نے ابھی کہا تھا۔ جب تک زندہ ہو فرغانہ کا پرچم سرنگوں نہیں ہونے دو گے۔ میں کہتا ہوں، زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے، فرغانہ کا پرچم بھی کوئی پہاڑ نہیں ہے کہ سرنگوں نہ ہو سکے۔"

بیتابانہ اور بے ساختہ بابر نے کہا۔

"عم محترم یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

عم محترم نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا،

"بڑی بڑی حکومتوں کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ نہ اب بند ہوا ہے نہ آئندہ کبھی بند ہوگا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "تلک الایام نداولھا بین الناس" یہ حکومت بھی ایک آنی جانی چیز ہے۔ فرغانہ کی حکومت ہمیشہ سے، جب سے فرغانہ عالم وجود میں آیا ہے، عمر شیخ کے ہاتھ میں نہیں رہی اور یہ حکومت جو آج تمہارے ہاتھ میں ہے ہمیشہ یعنی جب تک فرغانہ موجود رہے گا تمہارے ہاتھ میں نہیں رہے گی، ملک بھی بدلتے ہیں، بادشاہ بھی، سب کچھ ہوا ہے، سب کچھ ہو سکتا ہے، سب کچھ ہوگا، پس بہتر یہ ہے کہ جذبات کے بجائے عقل کی رہنمائی قبول کی جائے ——"

ان الفاظ میں دھمکی بھی تھی، نصیحت بھی، ہدایت بھی، لیکن ان کی شان نزول بابر کی سمجھ میں نہ آئی، مگر فوراً ہی سمجھ میں آ ہی گئی۔ دفعتہً شجاع نے کہا،

"میں تم سے رخصت ہونے آیا ہوں۔"

بابر نے بے ساختہ کہا۔

"آپ مجھ سے رخصت ہونے آئے ہیں؟ کہاں کا ارادہ ہے؟ کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

شجاع نے بہت مختصر سا جواب دیا۔

"سمرقند!"

بابر سب کچھ سمجھ گیا، پھر اس نے کچھ نہ کہا، خاموش ہو گیا۔

---

(۲)

غدّار

بابر کا جی چاہا کر شجاع سے پوچھے،

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ہاں بے شک میں نو عمر ہوں، ناتجربہ کار ہوں، لیکن آپ تو پختہ سال ہیں۔ آپ تو تجربہ کار ہیں، آپنے تو جنگیں لڑی اور جیتی ہیں آپ تو معرکوں میں شریک رہے ہیں۔ آپ نے تو دشمنوں کو کتنی ہی جھکائے ہیں، آپ تو میرے مرحوم باپ کے یاد وفادار ہیں! آپ تو میرے عم محترم ہیں، آپ کی ذات پر میرا حق ہے فرغانہ کا حق ہے۔ آپ کے ہم وطنوں کا حق ہے۔ آپ مجھے، فرغانہ کو اور اپنے اہل وطن کو چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟ کیوں جا رہے ہیں؟

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی؟

یہ وقت یہاں رہنے کا ہے، یا سمرقند جانے کا؟ اس وقت آپ کو، فرغانہ کے لیے، کمر کس کر میدان میں آنا چاہیے تھا۔ آپ فرغانہ کی قسمت کا سودا کرنے اس کا مستقبل فروخت کرنے، اپنے وطن کی آبرو لٹنے کے لیے سمرقند کیوں جا رہے ہیں؟

لیکن وہ یہ کچھ نہ کہہ سکا۔

وہ اگر چاہتا تو ابھی اور اسی وقت عم محترم کو گرفتار کر کے نذر زنداں کر دیتا،

وہ ایسا کر سکتا تھا لیکن اگر ایسا کرتا تو حالات بہت زیادہ ابتر و نازک ہو جاتے، ملک میں فتنہ و فساد برپا ہو جاتا، ہنگامے اٹھ کھڑے ہوتے۔ شجاع اکیلا نہ تھا، اس کے ساتھ بہت سے لوگ تھے۔ یہ بول جو اس کے منہ سے نکلے تھے وہ اس کے نہ تھے۔ بہت سے اہل شہر کے ترجمان تھے۔ شجاع تنہا نہ گرفتار ہوتا اس کے ساتھ اور بھی نہ جانے کتنے لوگوں کو گرفتار کرنا پڑتا، اور پھر دفعتہً سارا ملک خانہ جنگی میں مبتلا ہو جاتا۔

فرغانہ کا دوست اس وقت کوئی نہیں ہے، دشمن بہت ہیں لیکن ان دشمنوں کی طرف سے ابھی تک فرغانہ پر حملہ نہیں ہوا ہے، ان دشمنوں میں سے کسی نے اب تک فرغانہ پر چڑھائی نہیں کی ہے، ممکن ہے حملہ ہو، ممکن ہے چڑھائی کی جائے لیکن نہ جانے کب؟ ہو سکتا ہے چند ہفتوں بعد، چند ماہ بعد، یا چند سال بعد، یا پھر کبھی نہیں۔ لیکن شجاع میں لیکن بھڑ کے چھتے میں اگر ہاتھ لگایا گیا تو امروز اور فردا کا سوال نہیں رہے گا، ابھی اور اسی وقت خون کی ندیاں بہنے لگیں گی۔

بابر یہی سوچتا رہا اور شجاع کبر و نخوت کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا رخصت ہو گیا، جب تک وہ نظر سے اوجھل نہیں ہو گیا بابر ٹکٹکی لگائے اس کی پیٹھ کی طرف دیکھتا رہا۔

شجاع کے جانے کے بعد بابر پر اضطراب اور وحشت کی کیفیت طاری ہو گئی، وہ خاموشی کے ساتھ ٹہلنے لگا، اور سوچنے لگا، یہ کیسی حکومت مجھے وراثت میں ملی ہے جس کا ایک لمحہ بھی میرے لیے مبارک اور مسعود نہ ثابت ہو سکا؟

کیا کیا کروں؟

کیا تخت حکومت سے دستبردار ہو جاؤں؟

اگر میرے دست بردار ہونے سے حالات رو براہ ہو جائیں۔ فرغانہ مایوسی اور تاریکی کے گرداب سے نکل کر، کامیابی اور نشاط کا پیکر بن جائے تو میرا یہ اقدام بجا اور درست ہو سکتا ہے

لیکن میں جانتا ہوں ایسا نہیں ہوگا۔

میرے تخت حکومت سے دستبردار ہوتے ہی نئے نئے فتنے اٹھ کھڑے ہوں گے، ایک ایسی آگ بھڑک اٹھے گی جو سارے فرغانہ کے خرمن امن و اماں کو خاکستر کر کے رکھ دے گی۔

پھر؟ ——

پھر، مجھے کیا کرنا چاہیے؟

میری راہ عمل کیا ہونی چاہیے؟

اپنے ملک کو اس گرداب بلا سے میں کس طرح اور کیونکر نجات دے سکتا ہوں؟

یہی سوالات تھے جو بار بار اس کے ذہن اور دماغ سے ٹکرا رہے تھے، مگر راہ عمل مسدود نظر آ رہی تھی، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی، امید کی کرن ایک بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

یکایک پردے کو جنبش ہوئی اور قتلغ نگار خانم سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

ماں کو یوں بے سان و گمان اپنے سامنے دیکھ کر بابر چونک پڑا۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گیا اس نے ادب کے ساتھ پوچھا،

"مادر مہربان آپ نے یہاں تک آنے کی زحمت کیوں گوارا فرمائی؟ مجھے یاد فرمایا ہوتا، میں حاضر ہو جاتا۔"

نگار خانم نے چند قدم آگے بڑھ کر بابر کے سر کو اپنے سینے سے لگایا اور کہا:

"میں ضبط نہیں کر سکتی تھی بیٹے —— میں نے وہ ساری گفتگو جو تمہارے اور شجاع کے مابین ہوئی ہے اس پردے کی اوٹ میں کھڑی رہ کر سنی ہے، ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف"

بابر نے آہ سرد کے ساتھ کہا:

"آپ نے وہ ساری باتیں سن لیں؟"

نگار خانم نے جواب دیا "ہاں میرے چاند سن لیں!" "توجین!"

بابر نے حیرت سے ماں کی طرف دیکھا اور سوال کیا،

"توجین؟ —— یہ آپ کیا فرما رہی ہیں امی حضور؟ توجین سے آپ کی مراد کیا ہے؟"

نگار خانم نے شفقت اور محبت کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بیٹے میں ایک کہانی سنانا چاہتی ہوں تجھے، کیا سنے گا؟"

بابر نے اور زیادہ متحیر ہو کر پوچھا۔

"آپ سنائیں گی تو ضرور سن لوں گا، لیکن ایسے موقع پر کہانی کہنے اور سننے کا کیا تک ہے؟"

وہ بولی "نہ ہوتا تو کہتی کیوں؟"

بابر نے اسی طرح ادب کے ساتھ عرض کیا،

"تو فرمائیے، میں سن رہا ہوں!"

نگار خانم نے کہانی شروع کر دی۔

"آج سے بہت دنوں پہلے کی بات ہے کہ تقریباً تیری ہی عمر میں توجین یتیم ہو گیا تھا، اور قبیلہ کی سرداری کا بوجھ اس کے دوشِ ناتواں پر آ پڑا تھا، اہل قبیلہ نے یہ سوچ کر کہ یہ نوعمر چھوکرا ہماری سرداری کیا خاک کر سکے گا؟ وہ سر کشی کرنے لگے، ساتھ چھوڑنے لگے، اور نئے سرداروں کے پاس پہنچنے لگے مگر توجین نے ہمت نہیں ہاری۔ اسے اس بات پر اصرار تھا کہ میں سردار ہوں، میں سردار ہوں گا۔ سب کو میری اطاعت کرنی ہوگی جو اطاعت نہیں کرے گا اس کا سر قلم کر دوں گا —— اور بیٹے اس نے اپنے اس کہے پر عمل بھی کیا۔ وہ نہایت شان اور ٹھاٹھ سے سرداری کی مسند پر بیٹھ گیا جس نے حق وفا ادا کیا اسے نوازا جس نے سرکشی اور نافرمانی کا ارادہ بھی کیا، اس کی گردن قلم کر دی ——

بیٹے سن رہا ہے تو؟"

"امی حضور بڑی توجہ سے سن رہا ہوں!"

"ہاں تو جس نے سرکشی اور نافرمانی کا ارادہ بھی کیا اس کی گردن قلم کر دی، اپنی

سرداری کی ساکھ قائم کرنے اور اپنی سرداری کا لوہا منوانے میں تموجین کو بڑی بڑی مصیبتوں اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ پیدا ہوئی، اس کے تیور میں فرق نہ آیا، اس کے عزم محکم میں خلل نہیں پڑا۔ وہ گھر سے بے گھر ہو کر دشمنوں کے ہاتھ میں قید ہوا۔ اس کی ساری پونجی لوٹ لی گئی اس کی آخری پونجی اس کے صبا رفتار گھوڑے لوٹ لیے گئے، لیکن وہ دھن کا پکا، اپنی سرداری کا خواب دیکھتا رہا، اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھا جب تک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو گیا ـــــ بیٹے اس کا مقصد صرف قبیلہ کی سرداری نہ تھا، دنیا پر حکومت کرنا تھا، وہ ایک صحرانشین تھا، اس نے کبھی کسی شہر کی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ وہ جاہل مطلق تھا، نہ لکھ سکتا تھا، نہ پڑھ سکتا تھا، وہ تہذیب و تمدن کے نام سے بھی بیگانہ تھا، وہ اجڈ، وحشی، اور گنوار تھا۔ لیکن اتنے بڑے مقصد کا خواب اس نے دیکھا اور جب تک اس خواب کی تعبیر نہ مل گئی وہ برابر یہ خواب دیکھتا رہا اور بالآخر اس نے بام دنیا پر حکومت کی، اس نے آدھی دنیا فتح کر لی، اس نے بڑی بڑی مہذب اور متمدن حکومتوں کا تختہ الٹ دیا، اس نے روس فتح کر لیا، اس نے چین پر اپنا پرچم فتح و ظفر لہرایا، اس نے مشرق کو ویران کر دیا، اس نے مغرب کو تاراج کر ڈالا۔ اور چنگیز کے نام سے مشہور ہوا۔ تموجین چنگیز خاں بن گیا تو چنگیز کا نواسا ہوتا ہے۔ تیری ماں جو تیرے سامنے کھڑی تجھ سے باتیں کر رہی ہے اسی چنگیز کی اولاد ہے، میرے بچے تیری رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے اس میں چنگیز خاں کا لہو بھی شامل ہے، اس لہو کی لاج رکھ، ہمت نہ ہار، حوصلہ سے کام لے، آگے بڑھ، اور اعلان کر دے کہ میں فرغانہ کا تاج دار ہوں، جو وفادار اور مطیع ہے اسے نوازا جائے گا جو نافرمان اور سرکش ہے، اس کی گردن اڑا دی جائے گی، خواہ وہ کوئی ہو، کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو ـــــ

"شجاع بھی ہو ـــــ خواہ وہ شجاع ہی کیوں نہ ہو؟"

"ہاں، ـــــ خواہ شجاع ہی کیوں نہ ہو، وہ شجاع نہیں، بزدل ہے، نمک حرام ہے وہ زندہ رہنے کے حق سے محروم ہو چکا ہے تو نے غلطی کی جو اسے جانے دیا ـــــ"

"تو کیا کرتا پھر؟"

"تجھے چاہیئے تھا اپنی تلوار، وہی تلوار جس سے تو نے شیر کا شکار کیا تھا ـــــ میان سے نکالتا اور اس بزدل کی گردن قلم کر دیتا۔"

"لیکن ـــــ"

"لیکن ویکن کچھ نہیں، تو نے غلطی کی جو اسے جانے دیا، لیکن ابھی وقت ہے، ابھی وہ فرغانہ میں موجود ہے، ابھی وہ سمرقند نہیں گیا ہے، تو اسے طلب کر اور بغیر کچھ پوچھے گچھے بغیر کسی سوال و جواب کے، اس کی گردن کاٹ کر اپنے ہاتھ سے گھوڑے پر پھینک دے۔ اور غداروں، منافقوں، موقع پرستوں، اور طالع آزماؤں کو بتا دے کہ گو تو نوعمر ہے لیکن ایک بہادر باپ کا بیٹا ہے۔ تیمور تیرا دادا، چنگیز نانا، عمر شیخ باپ اپنے اجداد کے نام کو بٹہ نہیں لگا سکتا۔ تو انھیں بتا دے، ہر غدار، باغی، منافق اور سرکش کا یہی حشر ہوگا۔ فرغانہ کا کوئی رہنے والا فرغانہ سے غداری کر کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ آج فرغانہ کی طرف سے ان لوگوں کا امتحان ہے جو حب وطن کے ترانے گایا کرتے تھے، جو اس امتحان میں پورا اترے گا، اسے سب کچھ ملے گا، جو پورا نہیں اترے گا، وہ سب کچھ کھوئے گا۔

---

(۳)

من چلا بادشاہ

بابر نے وہی کیا جو نگار خانم نے اسے بتایا تھا ! اس نے شجاع کو قتل کر دیا، اس کی املاک و جائداد ضبط کر لی، اس کی شاندار حویلی منہدم کرا دی اور اس پر ہل چلوا دیئے۔

یہ ایسا اقدام تھا جس کی بابر جیسے نوخیز اور نوعمر فرماں روا سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی، اس واقعہ نے ہر شخص کو انگشت بدنداں کر دیا۔ ہر شخص زبان حال سے کہہ رہا تھا۔

مارا آزیں گیاہ ضعیف ایں گماں نہ بود

لیکن ساتھ ہی ساتھ بابر کی دہشت بھی قائم ہو گئی، نافرمانوں اور سرکشوں اور باغیوں کے حوصلے پست ہو گئے، جو لوگ فرغانہ میں رہ کر جاسوسی کر رہے تھے، اور دشمنوں کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے، وہ راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے اب فرغانہ کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہو گئی تھی، اب انھیں یہاں پناہ نہیں مل سکتی تھی۔

جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ بابر پکے ہوئے پھل کی طرح دشمن کی گود میں آ گرے گا وہ اب یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گئے کہ وہ لوہے کا چنا ہے جس سے

دانت ٹوٹ سکتے ہیں لیکن جسے چبایا نہیں جا سکتا،

اس اقدام کا ایک اور بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کچھ مدت تک وہ یکسوئی کے ساتھ امور مملکت کی ترتیب و تنظیم میں منہمک اور مشغول رہ سکا، ورنہ شجاع نے صورت حالات ایسی پیدا کر دی تھی کہ شاید ایک دن بھی آسائش اور راحت کا میسر نہ آتا۔

خوش قسمتی سے اسے ایک باہمت، وفادار اور دلیر رفیق سید قاسم میسر آ گیا تھا یہ بڑا جیالا، اور جنگ آزمودہ نوجوان تھا اور بابر پر جان دیتا تھا، اس کے پسینہ پر خون بہانے کو تیار رہتا تھا، سایہ کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا تھا، تمام مشوروں میں شریک رہتا تھا اور تمام منصوبوں کو روبہ عمل لانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیتا تھا، کسی بڑے سے بڑے خطرے کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، اپنے آقا، اپنے ملک اور اپنی قوم کے وقار کے لیے بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرانے کو آمادہ رہتا تھا، کئی نازک موقع آئے۔ جب بہت سے معتمد دوستوں اور ساتھیوں نے ساتھ چھوڑ دیا، دغا دے گئے لیکن سید قاسم ہر کٹھنائی، اور ہر مصیبت میں دل و جان سے حق رفاقت ادا کرتا رہا۔ نہ کبھی اس کا حوصلہ پست ہوا، نہ اس کی ہمت میں فرق آیا۔

ایک مختصر سی مدت تو امن و امان کے ساتھ گذری، لیکن بہت جلد ہر طرف سے فتنے سر اٹھانے لگے۔ اندرونی خلفشار بھی رونما ہوا، اور بیرونی یورشوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا، حکومت ہاتھ سے گئی۔ تاج و تخت چھنا، اور کبھی یوں لگتا جیسے دشمن نے ہار مان لی اور میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔

سب سے بڑا ستم یہ تھا کہ دشمن کوئی ایک نہ تھا، بلکہ ان کی تعداد حد سے فزوں تھی۔ دوست بھی دشمن تھے، عزیز بھی، ہمسائے بھی اور وہ بھی جن سے دیرینہ خاندانی تعلقات تھے۔ ایک دشمن ہو تو اس سے نپٹ لینا آسان ہوتا ہے،

لیکن جب ہر طرف دشمن ہی دشمن نظر آئیں، تو ان سے عہدہ برآ ہونا، اور وہ بھی ایک کم عمر اور ناتجربہ کار شخص کا، کچھ آسان نہ تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ تموجن — چنگیز خاں — کی طرح، امیر تیمور نے بھی ساری دنیا کو دہلا رکھا تھا۔ اس نے بھی ایک بہت بڑے حصہ پر دنیا کے قبضہ کر لیا تھا اس کی نہیب شمشیر سے بڑے بڑے بہادر کانپتے تھے۔ اس کا نام سن کر وقت کے کشور کشاؤں اور فاتحوں کے چہرے زرد پڑ جاتے تھے اور یہ بابر، یہ کم سن بادشاہ چنگیز اور تیمور کی عظمت رفتہ کا مالک تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ سارے ماوراء النہر پر، سارے مشرق پر، دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ پر تموجین کی طرح تیمور کا سکہ چل رہا تھا اور اب وہ زمانہ تھا کہ چنگیز اور تیمور کا یہ جانشین، از پی سوراندہ و از آں سو درماندہ نظر آ رہا تھا نہ اسے اپنے ملک میں قرار و ثبات حاصل تھا نہ ملک کے باہر کوئی جگہ ایسی تھی جہاں اسے پناہ مل سکتی، اس کی زندگی یکسر اضطراب، اضطرار اور فکر و اندیشہ کی زندگی تھی، صبح، شام، دوپہر، ہر وقت اسی فکر میں رہتا تھا کہ کیونکر دشمنوں کے وار سے اپنے چھوٹے سے ملک کو بچائے۔ اب وہ اپنے اجداد کی طرح سارے ماوراء النہر کا، پورے مشرق کا، اور ایک بڑے حصۂ عالم کا مطلق العنان فرماں روا نہیں تھا، وہ ایک چھوٹی سی مملکت — فرغانہ — کا تاجدار تھا، لیکن یہاں بھی وہ بے خل و غش حکومت نہیں کر سکتا تھا۔ دشمنوں نے اس کا دن کا چین، اور رات کا آرام چھین لیا تھا، اس کی مملکت کے مختلف اور متعدد حصوں پر رفتہ رفتہ وہ قابض ہوتے جاتے تھے، اور اگر صورت حال یہی رہتی تو شاید ایک دن بیک جنبش دو دوگوش اسے اپنی راج دھانی بھی ان دشمنوں کے لیے خالی کر دینی پڑتی۔ گو ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی تھی، لیکن دھڑکا ہر وقت لگا ہوا تھا۔

سید قاسم ایک روز اپنے آقا کے دربار خاص میں حاضر تھا۔ بابر نے جس کی عمر اب

۱۸ سال کی ہو چکی تھی، اس سے کہا

"خجند اور بعض دوسرے مقامات پر احمد مرزا کا قبضہ ہے، اور ہم اسے گوارا نہیں کر سکتے!"

سید قاسم نے جواب دیا،

"میرے آقا، غلام تو کئی مرتبہ عرض کر چکا ہے کہ جب تک ہم فرغانہ سے باہر نکل کر دشمن کی سرکوبی نہیں کریں گے اس وقت تک ہماری حکومت مضبوط اور مستحکم نہیں ہو سکتی!"

بابر نے جھلا کر جواب دیا،

"ہاں تم کئی مرتبہ کہہ چکے ہو۔ اور ہم کئی مرتبہ سن چکے ہیں لیکن، کام صرف کہنے اور سننے سے تو نہیں بنا کرتا، وسائل جب تک نہ ہوں کیا کیا جا سکتا ہے ؟"

سید قاسم نے بے جھجک جواب دیا۔

"وسائل ؟ — سب سے بڑا وسیلہ آپ کی ذات ہے۔ اگر آپ کمر ہمت چست کریں تو کس کی مجال ہے جو ہمارا مد مقابل بن سکے ؟"

بابر نے سوال کیا اور اگر ہم خجند پر چڑھائی کا فیصلہ کریں تو کتنی فوج ہر طرح کے اسلحہ سے مسلح ہو کر ہمارے ساتھ جا سکتی ہے ؟

سید قاسم نے بتایا "اتنی ہی، بلکہ اس سے کچھ زیادہ جتنی کی ضرورت ہو۔"

بابر ہنسنے لگا، اس نے کہا،

"اور یہاں کا انتظام کسے سونپا جائے ؟"

سید قاسم نے عرض کیا۔

"یہاں کا انتظام سونپنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا!"

"یہ کیوں ؟"

"اس لیے کہ یہاں آپ حسب سابق تشریف فرما رہیں گے۔"

"اور یہ مہم کون سر کرے گا؟"

"آپ کا یہ غلام!"

"کیا تمہارا مقصد یہ ہے کہ ہم یہاں عیش و نشاط کی زندگی بسر کریں، اور تم موت سے کھیلنے کے لیے خجند روانہ ہو جاؤ؟"

"غلام اور ہوتے کس لیے ہیں؟ کیا ایک غلام کے لیے اس سے بڑھ کر بھی خوشی اور مسرت کا کوئی موقع ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آقا پر اپنی زندگی قربان کر دے؟"

قاسم کی ان باتوں سے بابر بہت متاثر ہوا۔ اس نے کہا،

"ہمیں تم پر اعتماد ہے، تمہاری وفاداری پر فخر ہے ہمیں۔ ہم جانتے ہیں اور یہ تمہارے دل کی آواز ہے کہ تم ہم پر بڑی خوشی سے اپنی جان قربان کر سکتے ہو۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم یہاں رہیں اور تم موت سے کشتی لڑنے کے لیے خجند روانہ ہو جاؤ، یہ ہمارا کام ہے، ہم کریں گے، ہمیں کو یہ کام کرنا چاہیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے پیچھے تم یہاں کا انتظام و انصرام سنبھالو۔

"کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ خود تشریف لے جائیں اور مجھے یہاں چھوڑ جائیں بابا؟"

"ہاں، ــــ ہمارا مقصد یہی ہے!"

"لیکن واپس آ کر آپ اپنے غلام کو زندہ نہیں پائیں گے!"

"یہ کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ خودکشی کر چکا ہوگا!" . . . . . .

. . . . وہ اس ننگ کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کا آقا میدان جنگ کا رُخ کرے اور وہ آرام سے انتظام و انصرام مملکت کے کام میں مصروف رہے ــــ میرے آقا یہ کام دوسرے لوگ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن غلام تو اپنے آقا کے ساتھ جائے گا اور اسی کے ساتھ واپس آئے گا!"

بابر نے قاسم کی بات مان لی اور دوسرے ہی روز ایک فوج گراں لے کر خجند کی طرف روانہ ہو گیا[1] اور نہایت مختصر سی مدت میں اس نے خجند کو تسخیر کر لیا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس کامیابی نے جہاں دشمن کا حوصلہ پست کر دیا، وہاں اس کا حوصلہ بڑھا دیا، کچھ ہی عرصہ کے بعد اس نے سمرقند کا رخ کیا[2]۔

"سمرقند کو ماوراء النہر کا دار السلطنت امیر تیمور نے مقرر کیا تھا، ربع مسکوں میں اس سے بڑھ کر شہر زیبا کوئی نہ تھا۔ اب تک کسی باغی یا دشمن نے قہر و غلبہ سے اس پر قبضہ نہیں پایا تھا اس لیے اس کو بلاد محفوظہ کہتے ہیں۔ مغول والوس ترک اس کو سمر کنتا کہتے ہیں حضرت عثمان کی خلافت میں یہ شہر مسلمان ہوا۔ اب سارے بائندے اس کے پاک مذہب و منشرح و پاک دین ہیں، ماوراء النہر میں جیسے ائمہ اسلام پیدا ہوئے ہیں معلوم نہیں کہ کسی اور ولایت میں بھی پیدا ہوئے ہوں۔ شیخ ابو المنصور بایزیدی ائمہ کلام میں سے ہیں۔ بایزید سمرقند کے ایک محلہ کا نام ہے، دوسرے امام بخاری خواجہ اسمٰعیل احرار بھی ماوراء النہری ہیں صاحب ہدایہ مرغینان کے ہیں جو ولایت فرغانہ کا ایک حصہ ہے۔ مذہب حنفیہ میں ہدایہ سے زیادہ معتبر کتاب فقہ میں کوئی نہیں سمرقند کے باغات، مساجد، مدارس اور عمارات بے مثل و بے نظیر ہیں، ایک مسجد کی تعمیر اس صنعت سے کی گئی کہ اگر اس کے صحن پر لات ماریئے تو ٹن ٹن کی آواز نکلتی ہے۔ ایک جامع مسجد پتھر کی ہندوستان کے سنگ تراشوں نے بنائی ہے اس کے پیش طاق کے کتابے میں قرآن کی آیات ایسی جلی لکھی ہیں کہ ایک کروہ کے فاصلہ سے آدمی آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔ ایک کوشک کلاں میں امیر تیمور کی جنگ ہندوستان کی تصویر بنی ہوئی ہے، مرزا الغ بیگ نے بہت سی عمارات بنائی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک عمارت عالیشان رصد ہے کہ زیچ بنانے کے آلات وہاں موجود

---

[1] ۱۴۹۵ء

[2] مئی ۱۴۹۷ء

ہیں، الغ بیگ مرزا نے اس رصد سے ایک زیج گورگانی لکھی ہے، جس پر اب عمل ہوتا ہے پہلی زیچیں سب اس کے سامنے معطل ہیں۔ اس سے پہلے زیج ایل خانی پر عمل ہوتا تھا، جس کو خواجہ خضر نے ہلاگو خاں کے زمانے میں لکھا تھا، غالباً دنیا میں آٹھ سات رصدوں سے زیادہ نہیں بنائی گئی۔ خلیفہ ہارون رشید نے ایک رصد بنائی تھی جس سے زیج مامونی بنائی گئی ہے۔ پھر بطلیموس رصد بنائی گئی ہندوستان میں راجہ بکرماجیت کے عہد میں اجین میں کہ مالوہ میں واقع ہے، رصد (جنتر منتر) بنائی گئی تھی، جس پر ہندوؤں نے عمل کر کے زیج بنائی ہے، اس پر ۱۵۸۴ برس گزر چکے ہیں یہ نسبت اور زیچوں کے ناقص ہو گئی ہے۔

ایک تخت پتھر کا ہے، جس کا طول تخمیناً چودہ پندرہ گز کا ہے، اور عرض سات آٹھ گز کا اور ما[1] ایک گز کا، ایسے سنگ کلاں کو دور سے لانے میں درز پڑ گئی، بعض مکان چینی کے بنے ہوئے ہیں، سمرقند کے شہر میں ایک خصوصیت ہے جو اور شہروں میں نہیں ہے کہ ہر ایک حرفہ کا بازار جدا جدا ہے، کوئی مخلوط نہیں۔ مخمل، قرمزی اور کاغذ یہاں کا مشہور ہے، امیر تیمور نے جو کہا تھا کہ میرے پاس ایک باغ ہے جس کا طول تیس فرسنگ (۱۴۰ میل) ہے وہ باغ سعد میں تھا جو ماوراءالنہر کا ایک بڑا شہر ہے، وہ سمرقند کے میوے کا محتاج نہیں، سے مستغنی ہے۔ اہل شہر کی زبان فارسی ہے اور قصباتی و دیہاتی لوگوں کی زبان ترکی ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تزک بابری۔

(۴)

سمرقند پر قبضہ

سمرقند پر اب ایک غاصب — شیبانی خاں — کا قبضہ تھا،

شیبانی خاں ایک چالاک ہوشیار، اور حد درجہ موقع پرست آدمی تھا۔ اس نے بہت بڑی تعداد میں لشکر فراہم کیا اور سمرقند پر قابض ہو گیا۔

بابر سمرقند پر، ایک غاصب کا قبضہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اس شہر کے ساتھ اس کے خاندان کی بیسیوں شاندار روایات وابستہ تھیں!

یہ شہر امیر تیمور صاحب قران گورگانی کا پایۂ تخت — امیر تیمور جسے فرنگی مورخین دشمنی اور بغض و حسد کے باعث حقارت سے "تیمور لنگ" کے نام سے یاد کرتے ہیں — امیر تیمور جس کی شمشیر آبدار نے دشمنوں سے اپنا لوہا منوا لیا تھا، جس سے شاہان عالم بید لرزاں کی طرح کانپتے تھے۔

تیمور کے پایۂ تخت پر ایک غاصب قابض تھا، بابر کے لیے یہ صورت احوال قطعاً ناقابل برداشت تھی۔ وہ ہر قیمت پر سمرقند واپس لے لینا چاہتا تھا، خواہ اس راستے میں اسے اپنی زندگی ہی کی قربانی کیوں نہ دینا پڑے، یہ خاندان کے مجد و شرف اعلیٰ کے ناموس کا سوال تھا۔ اسے کمزوری کے پردے میں چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔

آخر وہ بیدِ قاسم کی معیت میں سمرقند کی طرف روانہ ہوا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں اپنے تھوڑے لشکر سے شیبان خان سے نہیں لڑ سکتا، اس لیے وہ کیش چلا آیا، یہاں اس کو راستہ طے کرنے میں بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑیں، لوگوں کی بدسلوکیوں کی وجہ سے اسے بہت رنج اٹھانے پڑے۔ اب اس کے پاس دو سو چالیس آدمی تھے، اس نے مشورہ کیا کہ سمرقند شیبان خاں کے ہاتھ ابھی آیا ہے، شہر کے آدمی بھی اس سے مانوس نہ ہوئے ہوں گے۔ ہمتا سے سمرقند کو لے لیجئے، جس وقت اہلِ شہر ہم کو دیکھیں گے تو ناگزیر ہماری مدد کریں گے، غرض اس نو عمر بادشاہ نے سمرقند پر چڑھائی کی، اسّی یا ستر آدمیوں نے زینے لگائے اور فصیل پر چڑھ کر شہر کے اندر داخل ہوئے۔ دروازے کے پہرہ داروں کو مار کر اس کا قفل پتھر سے توڑا اور بابر اس دروازے سے رات کو دو سو چالیس آدمیوں کو ہمراہ لے کر شہر میں داخل ہوا جس نے نیند سے آنکھ کھول کر اُسے دیکھا اس کے قدموں پر گرا، اور دعائیں دینے لگا، چند روز میں ساری خلقت اس کا دم بھرنے لگی، اور ازبکی آدمیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اینٹ اور پتھروں اور لکڑیوں سے مارنے لگی، شیبان خان خود کسی مہم پر گیا ہوا تھا اس کی طرف سے خان وفا مرزا حکومت کر رہا تھا، وہ یہ حال دیکھ کر بھاگا اور اپنے بادشاہ کے پاس پہنچا اور سب حال کہا، صبح کو شیبان خان پانچ آدمیوں کو ہمراہ لے کر دروازہ آہنی پر آیا، اس وقت اگر بابر کے پاس بہت آدمی ہوتے وہ قابو میں آجاتا، شیبان خان نے دیکھا کہ وہ یہاں کچھ کام نہیں کر سکتا اس لیے وہ یہاں سے بخارا روانہ ہوا۔

بابر کو لوگ مبارک باد دیتے تھے کہ ایک سو چالیس سال سے آپ کے خاندان میں یہاں کی سلطنت چلی آتی ہے۔ یہ باغی کہاں سے گھس آیا تھا۔ خدا تعالیٰ نے پھر یہ ہاتھ سے گیا ہوا ملک واپس دلوایا ہے۔ اس انیس سال کے نوجوان بادشاہ نے

کس غضب کا کام کیا کہ گو تجربہ کار نہ تھا مگر اس نے شیبان خاں جیسے تجربہ کار اور کلاں سال سے ملک لے لیا، جہاں وہ خود موجود تھا، اس فتح کی تاریخیں کہی گئی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے ؎

باز گفتا خرد کہ تاریخش　　فتح بابر بہادر است بداں

جب سمرقند فتح ہو گیا تو بابر نے خواقین و سلاطین و امرا سرحد و اطراف و جوانب کے پاس امداد و استعانت کے لیے متواتر و متعاقب ایلچی بھیجے کہ ہم سب کو چاہیے کہ مل کر ازبکوں کو ماوراءالنہر سے نکال دیں۔ ہم نے ان کے ہاتھ سے تکلیفیں اٹھائی ہیں اور اٹھائیں گے، مگر باوجود اس تجربہ کے بعض نے سہل انگاری کی بعض نے توہمات کے سبب تغافل کیا؛ بعض نے کمک بھیجی وہ کافی دکھنی کچھ عرصہ تک بابر روبہ عروج اور شیبانی خاں کا زمانہ مائل بہ تنزل رہا۔ بابر بے فکری کے ساتھ اپنے اس آبائی شہر پر حکومت کرتا رہا۔

---

(۵)

نئی افتاد

لیکن زمانہ صدا یکساں نہیں رہتا۔

سمرقند پر چڑھائی کے لیے جب بابر اپنی راج دھانی سے باہر نکلا تو اس نے تنبل خاں کو نظم مملکت سپرد کیا تھا۔ اس کی وفاداری اور صلاحیت پر اسے کافی اعتماد تھا۔ لیکن جب وہ سمرقند کو فتح کر چکا تو خبر ملی کہ تنبل خاں نے خود اپنی حکومت کا اعلان کر دیا ہے اور اب فرغانہ کا بادشاہ بابر نہیں، تنبل خاں ہے۔

اس خبر وحشت اثر کو سنتے ہی بابر اپنے حواس کھو بیٹھا؛ اوّل تو اسے تنبل خاں سے اس غداری اور بے وفائی کی امید نہیں تھی، دوسرے وہ سمرقند لے کر، فرغانہ کو دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

آخر سمرقند کو خدا کے حوالے کر کے، وہ پھر فرغانہ کی طرف پلٹا۔

بابر کی ایک بہت بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ اسے جم کر بیٹھنے اور حکومت کرنے اور نظم مملکت قائم کرنے کا ایک دن بھی موقع نہیں ملا۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑے، جس روز وہ تخت حکومت پر متمکن ہوا، اسی دن سے آفتیں اور بلائیں اس کا پیچھا کرنے لگیں، یہی وجہ تھی کہ اس کی فوج کی تعداد ہمیشہ محدود اور مختصر رہی، اسی محدود اور مختصر سی فوج کو لے کر

اس نے سمرقند پر چڑھائی کی تھی، اور خدا کے فضل سے کامیاب ہوا تھا اور یہی محدود اور مختصر سی فوج لے کر وہ فرغانہ کی طرف بڑھ رہا تھا، جہاں تنبل خاں بادشاہ بنا بیٹھا تھا۔

لیکن ان مساعد حالات کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری، وہ آیا اور اس نے حملہ کر دیا۔

تنبل خاں بھی غافل نہیں بیٹھا تھا، وہ جانتا تھا کہ بابر اسے معاف نہیں کر سکتا۔ وہ ضرور اپنا ملک واپس لینے کی کوشش کرے گا۔ اس نے مقابلہ کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں، اور ایک بڑی فوج تیار کر لی تھی، چنانچہ بابر کو اپنے سامنے ایک مکمل فوج مقابلہ کے لیے تیار ملی۔

جنگ ہوئی اور زور شور سے ہوئی، لیکن ایسا معلوم ہوتا کہ تنبل خاں کا پلہ بھاری رہے گا۔ اور بابر کی مختصر سی فوج شکست کھا جائے گی، کبھی ایسا نظر آتا کہ تنبل خاں کی فوج ظفر موج بابر کے چھوٹے سے لشکر سے شکست کھا جائے گی، اور بابری لشکر کے دلیر اور من چلے سپاہی، اس کا خاتمہ کر دیں گے، اس جنگ میں سید قاسم نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ جنگ سمرقند کے موقع پر بھی اس نے غیر معمولی ہمت و شجاعت کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن آج اس کی جنگ کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ اس نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر قسم کھائی تھی کہ جب تک تنبل خاں کا سر نہیں کاٹ لے گا، اس پر کھانا پینا اور دنیا کی ہر لذت حرام ہے۔ وہ بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا، وہ بار بار تنبل خاں کے پاس پہنچنے کی کوشش کرتا تھا لیکن فوج مخالف کی آہنی دیوار اس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔

جنگ صبح شروع ہوئی تھی اور اب سورج غروب ہو رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، تھوڑی دیر کے بعد، یہ جنگ کل پر ملتوی ہو جائے گی کیونکہ تاریکیٔ شب میں اس کا جاری رکھنا کسی طرح ممکن نہ تھا، اور بابر کے تھوڑے سے سپاہیوں میں سے کافی تعداد لقمۂ اجل ہو چکی تھی، جو بچ رہے تھے وہ اب لڑنے سے جی چرانے لگے تھے۔ تنبل خاں نے یہ رنگ دیکھ کر محسوس کیا

کہ اس جنگ کو ختم کرنے کا اس سے بڑھ کر عمدہ وقت کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اس نے اپنی فوج کو للکارا، اور اسے ترغیب دی کہ ایک ہی وار میں ان مٹھی بھر سپاہیوں کا مع ان کے سردار —— بابر —— کے خاتمہ کردے، اور پھر ہر وہ انعام حاصل کرے جس کی اسے طلب و جستجو ہے۔

تنبل خاں کے اس اعلان نے اس کی فوج میں ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا کردیا۔ وہ اور زیادہ جوش و خروش سے لڑنے لگی۔ بابر کے سپاہیوں کی حالت اور زیادہ ناگفتہ بہ ہونے لگی۔ بابر انتہائی دلیری اور ہمت کے ساتھ لڑ رہا تھا اور اپنے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا، یہی کیفیت سیّد قاسم کی بھی تھی۔

اور عین اسی وقت جب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے بابر کے لیے شکست مقدر کردی ہے، اس کی فوج پیچھے ہٹ رہی تھی اور دشمن کی سپاہ فتح و ظفر کا پرچم لہراتی آگے بڑھ رہی تھی سیّد قاسم اور تنبل خاں کا آمنا سامنا ہو گیا۔

سیّد قاسم نے اسے للکارا۔

" نمک حرام، تجھے بابر کے تخت پر بیٹھنے اور اس کا تاج زیب سر کرتے شرم نہ آئی؟"

تنبل خاں کچھ کھسیانا سا ہو گیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے سامنے سے ہٹ جانا چاہا، سیّد قاسم نے پھر للکارا۔

" تو صرف نمک حرام ہی نہیں بزدل بھی ہے، بھاگ کیوں رہا ہے، اگر مرد ہے تو آ مرد کا سامنا کر!"

یہ سن کر تنبل خاں نے گھوڑے کی باگ موڑی اور سیّد قاسم کے روبرو آکر کھڑا ہو گیا اور تلوار کا ایک زبردست وار کیا۔

سیّد قاسم نے جھکائی دے کر اس کا وار خالی دیا اور نعرہ لگایا —— "تو ضربے زدی، ضرب من نوش کن!"

اور پھر کہا " ہمہ شادی از دل فراموش کن!"

اور اس کے بعد تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ لگایا کہ اس کی گردن کٹ کر دور جا پڑی۔

تنبل خاں کی کٹی ہوئی گردن دیکھ کر اس کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس طرح آن کی آن میں اس جنگ کا فیصلہ ہو گیا، جس کے جیتے جانے کی بظاہر کوئی امید نہیں رہ گئی تھی۔

---

(۶)

جشنِ شادی

۱۴۹۹ء !

بابر اب ۱۸ سال کا جوان رعنا تھا !

واقعی تموجین (چنگیز خاں) اور بابر کے حالات میں کتنی مماثلت تھی ؟ وہ بھی نوعمری میں یتیم ہوا، اور بڑی بڑی کٹھنائیاں جھیل کر قبیلہ کا سردار بنا، یہ بھی ۱۲ سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہوا، اور باپ کے مرتے ہی، آفات و مصائب کے گرداب میں گرفتار ہوگیا۔ تموجین نے بھی، بالکل نوعمری کے عالم میں برتائی کو دیکھا تھا، اور ہزار جان سے اس پر عاشق ہوگیا تھا۔ بابر بھی بالکل نوعمری میں عائشہ سے مڈبھیڑ ہوئی، اور غیر محسوس طور پر وہ اسے اپنا دل دے بیٹھا۔ تموجین نے بھی حالات کے روبراہ ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ برتائی کو بیاہ لایا تھا اور بابر نے بھی حالات کے ذرا سازگار ہوتے ہی سب سے پہلے عائشہ سے شادی کی، اور اسے اقلیم دل سونپ دی۔

شادی دھوم دھام سے ہوئی، یہ ایک نوجوان، اولوالعزم، اور من چلے بادشاہ کی شادی تھی۔ یہ وہ دن تھا ـــــ دن گنے جاتے ہیں جس دن کے لیے!

بابر نے جب پہلی مرتبہ عائشہ کو دیکھا تھا، تو دل میں ایک انجانا سا جذبہ محسوس

کیا تھا، عشق، محبت، چاہت، یہ الفاظ ابھی پوری معنویت کے ساتھ اس کی سمجھ میں نہیں آسکے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ عائشہ سے محبت کرنے لگا تھا، یہ جانے بغیر کہ اسے چاہتا ہے۔

اور اب عائشہ اس کی رفیقۂ حیات تھی۔ اب اس نے اپنا گوہر مقصود پالیا تھا اور اس گوہر مقصود کے پاتے ہی، کم از کم عارضی طور پر ان تمام پریشانیوں اور درماندگیوں کو اس نے فراموش کر دیا تھا، جو ایک عرصہ سے اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ایک روز وہ عائشہ کے پاس بیٹھا تھا، اس نے محبت بھری نظروں سے عائشہ کو دیکھا اور کہا،

"عائشہ! میں بہت خوش ہوں، ـــــ کیا بتا سکتی ہو کیوں خوش ہوں؟"

وہ ایک ادائے حجاب آمیز کے ساتھ گویا ہوئی،

"میں نے تو آپ کو ہمیشہ خوش ہی دیکھا ہے!"

بابر نے ایک عجیب تاثر کے عالم میں کہا،

"ہاں عائشہ، تمہارے ہوتے، تمہاری موجودگی میں، غموں اور تکلیفوں سے میں اپنا رشتہ نہیں قائم رکھ سکتا۔"

وہ بولی، "کیا غموں اور تکلیفوں سے بھی رشتہ قائم کیا جاتا ہے دنیا میں؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

جیسے بابر کو کچھ یاد آگیا، جیسے بابر کو بہت کچھ یاد آگیا، اس نے بے کلی اور اضطرار کے ساتھ پہلو بدلتے ہوئے کہا:

"ہاں عائشہ، ایسا معلوم ہوتا ہے، میں اسی لیے پیدا کیا گیا ہوں، تمہارا وجود اگر بیچ سے ہٹ جائے تو میری زندگی صرف پریشانیوں، دکھوں، غموں، اور مصیبتوں ہی سے عبارت رہ جائے گی! کون ہے جو میرے راستے میں کانٹے نہ بچھاتا ہو؟ کون ہے جو دوست کے بھیس میں دشمن نہ ہو؟ اس مختصر سی عمر میں کیسے کیسے عجیب اور ہولناک تجربوں سے

دوچار ہونا پڑا ہے، ـــــ عائشہ بتاؤ تم بھی تو مجھے نہیں چھوڑ دو گی نہ؟"

عائشہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، اس نے کہا "آپ کا دل کیا کہتا ہے؟ میں آپ سے سوال کرتی ہوں، بتائیے کہیں میں بھی تو آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ دوں گی؟"

بابر کے چہرے پر رونق آگئی اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

"نہیں تم میرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتیں، ساری دنیا میری دشمن ہو جائے تو بھی تم میری اور صرف میری رہو گی۔ مجھے کہیں پناہ نہ ملے، تو بھی صرف تمہارے دامن میں مجھے پناہ ملے گی آسودگی ملے گی، مسرت ملے گی ـــــ کیوں عائشہ میں غلط تو نہیں کہتا؟"

وہ تبسم کی بجلیاں گراتی ہوئی بولی "اپنے دل کا بھید آپ ہی جان سکتے ہیں۔ میں کیا جانوں؟"

بابر کے سامنے شراب کی صراحی رکھی ہوئی تھی، اس نے ایک ساغر بھرا اور عائشہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"میں تمہارے ہاتھ سے پیوں گا!"

عائشہ ذرا پرے ہٹ گئی، اس نے کہا،

"آپ کو اپنے ہاتھ سے بھی نہ پینی چاہیے!"

بابر نے ایک ہی گھونٹ میں ساغر ختم کر دیا، اور کہنے لگا،

"تم نہیں جانتیں یہ کیا چیز ہے؟"

بڑی معصومیت کے ساتھ اس نے سوال کیا:

"کیا یہ شراب نہیں ہے؟"

وہ بولا، "ہاں، ـــــ یہ شراب ہے، یہ بادۂ ناب ہے، یہ داروئے غم ہے، اسے پینے کے بعد، انسان غموں کو فراموش کر دیتا ہے، پریشانیوں کو بھول جاتا ہے ـــ"

عائشہ نے اسی معصومیت کے ساتھ پھر سوال کیا:

"کیا مجھے پا لینے کے بعد بھی آپ غمگین اور پریشان ہیں؟ کیا شراب آپ اس لیے پیتے ہیں کہ غموں کو بھول جائیں یا پریشانیوں کو فراموش کر دیں؟ ـــــ آخر وہ کون سے غم ہیں، کیسی پریشانیاں ہیں؟"

اتنی دیر میں بابر ایک دوسرا جام بھر چکا تھا، اس نے ایک گھونٹ پیا، اور کہنے لگا،

"اگر تم مجھے نہ مل جاتیں تو شاید میں، مایوس ہو کر خودکشی کر لیتا ـــــ"

عائشہ نے اپنا دست نازک اس کے منہ پر رکھ دیا، اور بولی،

"ایسی باتیں نہ کیجیے، مجھے وہم آنے لگتے ہیں ـــــ"

لیکن بابر نے سنی کی ان سنی کرتے ہوئے کہا:

"دیکھو تو سہی عائشہ، بظاہر میں بادشاہ ہوں، مالک تخت و تاج ہوں، فرغانہ میری مملکت ہے، لیکن ـــــ"

ایک گھونٹ اور حلق سے اتارنے کے بعد، سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا،

"لیکن، ایک پل بھی مجھے نہ اطمینان میسر ہے، نہ سکون، نہ ذہنی اور دماغی آسائش!"

"وہی تو پوچھتی ہوں، کیوں کس لیے؟"

"اس لیے کہ میں ہر طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوں، میرے ملک پر قبضہ کرنے کی تدبیریں ہو رہی ہیں، سمرقند پر شیبان خاں قابض اور مسلط ہے، فرغانہ پر وہ اور دوسرے لوگ، قبضہ کرنے اور تسلط جمانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، میرے پاس نہ اتنی فوج ہے کہ ان کا مقابلہ کر سکوں، نہ اتنا روپیہ ہے کہ دشمنوں سے دوستی خرید سکوں!"

عائشہ ہنسنے لگی، بھلا دوستی بھی خریدی جا سکتی ہے کہیں؟ ـــــ اور وہ بھی دشمنوں کی؟"

بابر نے عائشہ کے اس طنز لطیف کا کچھ زیادہ خیال نہیں کیا، اپنی دھن میں کہتا رہا:

"اگر میرے پاس روپیہ ہو تو میں ان دشمنوں کو دوست بنا سکتا ہوں جو فرغانہ میں

رہتے ہوئے میرے خلاف سازشیں کر رہے ہیں اور اگر فوج ہو تو ان دشمنوں کا قلع قمع کر سکتا ہوں، جو میرے آبائی وطن پر قابض ہیں ——"

اور پھر دفعتاً اس کے چہرے کا رنگ بدلا، اس کی آنکھوں سے آگ برسنے لگی، اسی جوش و خروش کے عالم میں سلسلۂ کلام جاری رکھا؛

"لیکن حالات کتنے ہی نازک اور مایوس کن ہوں مگر میں ہتھیار نہیں ڈال سکتا، شکست نہیں قبول کر سکتا، کبھی اور کسی حالت میں بھی اپنے حق اور اپنے مطالبے سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ میں لڑوں گا، میدان میں لڑوں گا، بیابانوں میں جنگ کروں گا، کوہستانوں میں دعوت مبارزت دوں گا۔ اس وقت تک جنگ جاری رکھوں گا جب تک دشمنوں کو سرنگوں نہ کر لوں، جب تک انھیں شکست نہ دے لوں!"

عائشہ نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا،

"تو کیا ہوا؟ اگر دشمن آپ کے راستے میں کانٹے بچھا رہے ہیں؟ یہ تو آپ کے خاندان کی پرانی ریت ہے، کیا تیمور کے ساتھ اور چنگیز کے ساتھ بھی یہی نہیں ہوا تھا؟ جس طرح انھوں نے ہمت نہیں ہاری تھی، آپ کو بھی حوصلہ قائم رکھنا چاہیے، دشمن لاکھ قوی ہو مگر وہ آپ کے روایات خاندانی سے ٹکر نہیں لے سکتا۔ اور اگر ایسی جرأت کرے تو ٹک نہیں سکتا!"

بابر کا وہ جوش، جو خشونت کی صورت اختیار کر چکا تھا، دفعتاً ٹھنڈا پڑ گیا، اس نے کہا،

"عائشہ تمہارے ان الفاظ نے میرے زخم دل پر مرہم کا کام کیا ہے، میں تم سے اسی جواب کا متوقع تھا، میں تم سے اسی رفاقت کا طلبگار تھا، مجھے تم سے یہی امید تھی!"

وہ وقار اور سنجیدگی کے ساتھ گویا ہوئی:

"میں آپ کے ساتھ ہوں، خوشی میں بھی آپ کا ساتھ دوں گی اور غم میں بھی، فرغانہ کے ایوان خسروی میں بھی، اور اگر خدانخواستہ کوئی برا وقت آیا تو جنگلوں، بیابانوں، صحراؤں

اور —— اور جنگ کے میدان میں بھی، —— کیا میرے الفاظ پر آپ کو اعتماد ہے؟ بھروسہ ہے؟"

بابر اٹھ کھڑا ہوا، اس نے عائشہ کی پیشانی پر بوسہ دیا، اور جذبات انگیز لہجہ میں کہا:

"بہت زیادہ!"

شاید وہ ابھی کچھ اور کہتا کہ اطلاع ملی سید قاسم دربار خاص میں امرائے دولت، وزرائے حکومت، اور افسران فوج کے ساتھ بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ یہ پیغام سنتے ہی وہ عائشہ سے رخصت ہوا۔ اور بعض اہم امور پر صلاح و مشورہ کرنے کے لیے دربار خاص میں پہنچ گیا!

(۷)

جہانگیر مرزا کی بغاوت

اور وہ کون سے معاملات تھے جن پر غور و خوض کے لیے یہ دربار خاص منعقد ہوا؟ جہانگیر مرزا نے بغاوت کردی تھی[1] اور یہ بغاوت خطرناک صورت اختیار کرتی جارہی تھی، بہت سے لوگ اس کے ساتھ مل گئے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جلد ہی وہ وقت آنے والا ہے کہ وہ تاج و تخت سے محروم ہو جائے گا۔

جہانگیر مرزا، بابر کا بھائی تھا، عمر شیخ مرزا کا فرزند اس بھائی کے ساتھ بابر نے کبھی سختی اور تشدد کا برتاؤ نہیں کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہمیشہ محبت، اخلاص اور پیار کا سلوک مرعی رکھا تھا۔ اس نے جہانگیر کو اپنا شریک حکومت بنا لیا تھا، اس نے جہانگیر مرزا سے کہا:

"میں اور تم عمر شیخ کے وارث ہیں، فرغانہ کی یہ حکومت ہم دونوں کو ترکہ میں ملی ہے فرغانہ پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا میرا، ہم تم دونوں مل کر، اس ملک پر حکومت کریں گے ہم دونوں اتحاد، اتفاق اور محبت سے رہیں گے تاکہ ہماری ہوا خیزی نہ ہو۔ ہم میں افتراق پیدا ہو، اور ہمارے دشمن جو تاک میں لگے بیٹھے ہیں ہمارے افتراق سے فائدہ نہ اٹھائیں۔"

جہانگیر مرزا نے ایک سعادت مند بھائی کی طرح، بابر کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع

[1] ۱۵۰۰ء

کردیا تھا، اور اس نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ بابر نے جو کچھ کہا تھا وہ صرف دکھاوے کے لیے نہیں تھا، سچی اور کھری بات کہی تھی، اور لفظ بہ لفظ اور حرف بہ حرف اس پر عمل کیا تھا۔

لیکن جہانگیر خود بیں تھا، خود پسند تھا، اس کے اردگرد خوشامدی اور موقع پرست لوگ جمع رہتے تھے، وہ اس کو بھڑکایا کرتے تھے، اسے یقین دلایا کرتے تھے کہ بابر ایک دن اسے قتل کردے گا، ایک دن اسے قوت و اقتدار سے محروم کردے گا، ایک دن کوس لمن الملکی بجانے لگے گا، اور وہ بڑا منحوس دن ہوگا اسی دن جہانگیر مرزا کی حکومت بھی دم توڑ دے گی۔ اور وہ خود بھی، موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

ان لوگوں نے جہانگیر مرزا کو یہ یقین بھی دلایا کہ وہ اگر کمر ہمت کس کر میدان میں اتر سے تو فرغانہ کا بچہ بچہ اس کا ساتھ دے گا۔ بابر بے یار و مددگار رہ جائے گا۔

اور یہ بات جہانگیر مرزا کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے اطاعت سے منہ موڑا، بغاوت پر آمادہ ہوا، اور — بغاوت کردی۔

آج اسی مسئلہ پر اور اسی کے متوقع نتائج پر غور و فکر کے لیے یہ مجلس منعقد کی ہوئی تھی۔

سید قاسم نے تمام حالات بابر کے سامنے پیش کیے اور اس سے کہا،

"اگر جلد تدارک نہ کیا گیا تو حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔" —

علامرشد، بابر کا ایک معتمد شخص تھا اس نے کہا،

"یہ وقت غور و فکر کا نہیں اقدام و عمل کا ہے!" — جہانگیر کی یلغار اگر روکی نہ گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں جان کے لالے پڑ جائیں گے!"

بابر نے ان سب کی باتیں غور اور توجہ سے سنیں، پھر گویا ہوا،

"لیکن آپ لوگ کیا چاہتے ہیں، یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے؟"

سب نے بالاتفاق رائے دی، "جہانگیر پر حملہ کردینا چاہیے!"

لیکن بابر نے یہ تجویز مسترد کردی، اس نے کہا:

"یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے بھائی سے جنگ کروں، میں دنیا کو اپنے خاندان پر ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتا، اگر جہانگیر بٹوارہ چاہتا ہے تو میں اس کے لیے تیار ہوں، اگر وہ سارا فرغانہ لینا چاہتا ہے، تو مجھے اس میں بھی عذر نہیں، ـــ"

یہ باتیں سن کر سید قاسم سے نہ رہا گیا، اس نے ذرا تلخ لہجہ میں سوال کیا۔

"سارا فرغانہ جہانگیر مرزا کو دے کر آپ خود کیا کریں گے؟ کہاں جائیں گے؟"

بابر نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ جواب دیا "ملکِ خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست"

---

(۸)

تاشقند

بابر نے فرغانہ کا بٹوارہ منظور کر لیا۔ اب اس کے ایک حصّہ کا فرماں روا وہ خود تھا اور دوسرے کا جہانگیر مرزا۔

فرغانہ ویسے بھی ایک چھوٹی سی مملکت تھی، اب تقسیم کے بعد اور زیادہ کمتر اور بے حیثیت ہوگئی۔ فرغانہ کے مشرق میں کاشغر، مغرب میں سمرقند، جنوب میں بدخشاں اور شمال میں ایران تھا، مغربی حصہ کے سوا ہر طرف پہاڑ تھے، یہاں غلّہ اور پھل کثرت سے پیدا ہوتے تھے۔ نہ آبادی زیادہ تھی نہ رقبہ وسیع، پھر بھی دشمن تھے کہ ہر چہار طرف سے نرغہ کیے ہوئے تھے اور یہ دشمن بھی غیر نہ تھے، اپنے تھے، بھائی اور چچا!"

جہانگیر مرزا سے صلح کے بعد نسبتہً سکون حاصل ہوا اور کوئی خاص خطرہ باقی نہیں رہ گیا۔ لیکن بابر خطرہ پسند طبیعت کا مالک تھا، وہ خطروں اور مصیبتوں کا تعاقب کیا کرتا تھا۔

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

اب ذرا سکون و آرام جو میسر آیا، تو اسے پھر سمرقند کی یاد ستانے لگی۔ بابر کو سمرقند سے عشق تھا!

یہ اس کی آبائی سرزمین تھی۔ یہ تیمور کا پایہ تخت تھا، اس شہر سے اسے قلبی اور جذباتی لگاؤ تھا۔ وہ ہر حالت میں اور ہر قیمت پر اسے اپنے قبضہ اور تصرف میں لانے کے لیے بیتاب تھا۔

ترکستان کے شہروں میں سمرقند قدیم اور مشہور ترین تاریخی شہر تھا۔

عہد وسطیٰ میں بھی سمرقند اور بخارا، تجارت، کاروبار اور دولت کی ریل پیل کے لحاظ سے غیر معمولی شہرت رکھتے تھے۔ علمی اور ادبی اعتبار سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ انھیں اگر مرکز علوم و فنون کہا جائے تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا، تیمور نے اپنے عہد اقتدار و فرماں روائی میں ان شہروں کی، اور خاص طور پر سمرقند کی رونق اور رعنائی میں چار چاند لگا دیئے۔ وہ ایشیا کے مفتوحہ اور مغلوبہ ممالک سے، اچھے اچھے ہنرور، کاریگر، صناع، ہنرمند اور انجینئر پکڑ پکڑ کر لایا، کسی کو بہ جبر و جور، کسی کو انعام کا لالچ دے کر، اور ان سب کو اس کام پر لگا دیا کہ سمرقند کو دنیا کا سب سے زیادہ بارونق، خوبصورت، اور شاندار شہر بنا دیں۔

تیمور نے یہاں نہایت اعلیٰ درجہ کی فلک سا اور نظر فریب عمارتیں تعمیر کرائیں۔ نہایت شاندار مقبرے بنوائے، حد درجہ سبک، بحر طراز، اور آنکھوں میں کھب جانے والی مسجدیں جو رونق و صفا میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں، تعمیر کرائیں۔

تیمور کے بعد بھی اس شہر کی رونق اور ترقی کا سلسلہ قائم رہا۔ اس کے پوتے الغ بیگ کی رصدگاہ کا ذکر تاریخوں میں موجود ہے۔ جہاں دوربینوں کے ذریعہ گردش کواکب کا حال معلوم کیا جاتا تھا۔ یہاں ایسے جلیل القدر عالم، فلسفی، محدث، مفسر اور فقیہہ پیدا ہوئے جن کے ذکر سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ شہر علوم کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ دور دور سے بڑے بڑے قافلے مسافروں، سیاحوں، زائروں اور تاجروں کے یہاں آیا کرتے تھے، یہ قافلے مال تجارت سے لدے پھندے آتے تھے اور سیم و زر سے ہمیانیاں بھر کر واپس جاتے تھے۔ یہ شہر زر تھا، تماشا گاہ عالم بن گیا تھا، چار دانگ عالم میں جس کا شہرہ تھا۔ شہر کی فصیل

بہت مضبوط تھی جس میں ایک ہزار سے زائد برج بنے ہوئے تھے۔ باغات کی کثرت سے شہر نمونۂ جنت بن گیا تھا، شہر کو ایک دریا سے سیراب ہوتا تھا، جسے آج کل دریائے زرافشاں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جنوب میں دریائے درعام تھا، ان ہر دو دریاؤں کے کنارے خوبصورت عمارتیں تھیں سمرقند کے بادشاہوں نے ان کناروں پر عالیشان محل بنوائے تھے۔ یہاں کے سرسبز و شاداب باغات ان بادشاہوں کی تفریح گاہیں تھیں، جن میں عام لوگوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ سمرقند کے جنوب اور مشرق میں کئی تفریح گاہیں تھیں۔

قلعہ میں ایک عظیم الشان محل تھا، جو نیلا محل کے نام سے مشہور تھا۔ اسی محل میں سمرقند کے بادشاہوں کی رسم تاجپوشی ادا ہوا کرتی تھی۔ اسی محل میں معزول بادشاہوں کو زندگی کے دن بسر کرنے کے لیے نظر بند کیا جاتا تھا۔ یہاں تیمور کے زمانے کی ایک نہایت خوبصورت اور عظیم الشان مسجد تھی، تیمور نے ہندوستان اور ایشیا میں جن جن علاقوں کو فتح کیا وہاں سے اعلیٰ کاریگروں کو ساتھ لے آیا تھا، اور ان سے سمرقند میں عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔ یہ مسجد بھی انھیں کاریگروں کے فن تعمیر کا نمونہ تھی۔ مسجد کے دروازہ پر نہایت خوبصورت حروف میں قرآنی آیات کندہ تھیں، قریب ہی ایک خوشگوار قطعہ زمین پر سمرقند کے بادشاہوں کے مقبرے تھے، انہی میں تیمور کا خوبصورت مقبرہ بھی آج تک موجود ہے۔

قلعہ کے قریب ہی ایک درس گاہ تھی، الغ بیگ کی بنائی ہوئی رصدگاہ بھی اسی جگہ واقع تھی جس میں علم ہیئت سے متعلق ساز و سامان موجود تھا۔ نزدیک کوہک نام ایک پہاڑی تھی، یہاں کھڑے ہو کر سارا شہر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس پہاڑی کے قریب ایک خوبصورت باغ تھا جس میں چالیس ستونوں کا ایک برج تھا جو چہل ستون کے نام سے مشہور تھا، اس برج میں گھومنے والے تہ خانے اور درجے بنے ہوئے ہیں۔

سمرقند کے باغات کی شہرت دور دور پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں کے سرخے، سیب، انار وغیرہ بعید ترین مقامات پر بھیجے جاتے تھے۔ یہاں ایک خاص قسم کا انگور پیدا ہوتا تھا جو

اپنی شیرینی کے اعتبار سے یکتا تھا۔

بابر نے پھر ایک لشکر فراہم کیا اور سمرقند پر فوج کشی کے ارادے سے روانہ ہوا۔ بعض ہواخواہوں نے رائے دی کہ یہ وقت اپنے ملک سے باہر نکلنے اور ایک دوسرے ملک پر حملہ کرنے کے لیے سازگار نہیں ہے، لیکن بابر نے پائے حقارت سے یہ مشورہ ٹھکرا دیا۔ سید قاسم نے البتہ مخالفت نہیں کی، اس کا شعار یہ تھا کہ آقا کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا تھا۔

بابر نے سمرقند کا محاصرہ کر لیا۔

اور یہ محاصرہ پورے سات ماہ تک جاری رہا۔

لیکن بابر کے عزم اور ارادے میں فرق نہیں آیا، آخر کار اسے فتح ہوئی۔ سمرقند اس کی آبائی وطن پھر اس کے دست تصرف میں آگیا۔

ایسے مواقع پر جب ایک فاتح فوج کسی مفتوح شہر میں داخل ہوتی ہے تو نہ ہمایاں شہر کی جان سلامت رہتی ہے، نہ آبرو، نہ مال، نہ دولت۔ لیکن بابر نے سختی کے ساتھ فوج کو ہدایت کر دی تھی کہ لوگوں کے جان و مال اور عزت و آبرو پر ہرگز حملہ نہ کیا جائے۔ اگر کوئی معمولی سی شکایت بھی پہنچی تو انتہائی سخت سزا دی جائے گی۔

اس فرمان کا اثر یہ ہوا کہ شہر میں فوج کے داخلہ کے وقت اور داخلہ کے بعد کسی کی نکسیر تک نہیں پھوٹی۔ اس طویل محاصرے نے شہر کی حالت ابتر کر دی تھی۔ بابر کو فصل اگانے کے لیے کاشتکاروں کو بیج دینا پڑا۔ پھر یہ کہ فصل پکنے تک جملہ ضروریات کا بھی بندوبست کرنا پڑا۔

جب فوج نے یہ حالت دیکھی تو رفتہ رفتہ بابر کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا۔ تمام مغول سردار اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے لگے، صرف ایک ہزار آدمی باقی رہ گئے یہ وہ لوگ تھے جو مصیبت کے اس زمانہ میں حق وفا ادا کرنے کا عزم بالجزم کیے ہوئے

اسی دوران میں بابر بیمار ہو گیا۔ نہ بولا جاتا تھا اور نہ کچھ کھا پی سکتا تھا۔ ملازم منہ میں روٹی بھگو کر رکھتے، اسی طرح پانی پیتا تھا۔"

غرض بابر کو پھر مشکلات نے گھیر لیا۔ بعض سربرآوردہ سردار ان فوج اور دوسرے فوجی بابر کو چھوڑ کر فرغانہ واپس چلے گئے۔ انھوں نے بابر کے خلاف بغاوت کر دی، اور اس کی غیر حاضری میں شہزادہ جہانگیر کو فرغانہ کے تخت پر بٹھا دیا تھا۔ فرغانہ سے بابر کے خیر خواہوں نے خطوط پر خطوط بھیجے کہ جلد آکر ملک کو سنبھالو۔

اندیجان[1] میں بغاوت نے زیادہ زور پکڑ لیا تھا۔ بابر کو یہ بغاوت فرو کرنے کے لیے پہنچنا چاہیے تھا مگر وہ بیمار تھا اس لیے اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ اندیجان کے گورنر کو کسی نے اطلاع دی کہ بابر بیماری سے وفات پا گیا ہے، چنانچہ وہ یہ خبر سن کر بے ہمت ہو گیا اور شہر کو باغیوں کے سپرد کر دیا۔ دشمن اس فتح مندی پر بہت خوش تھے، انھوں نے بابر کے سفیر خواجہ قاضی کو قتل کر کے قلعہ کے دروازے پر لٹکا دیا۔

ان وحشت ناک خبروں کو سن کر بابر نے بیماری کی حالت میں سمرقند سے کوچ کر دیا اور اندیجان پہنچا۔ جونہی اس نے سمرقند سے قدم نکالا، سلطان علی نے سمرقند پر چڑھائی کر کے اسے فتح کر لیا۔ گویا اندیجان تو ہاتھ نہ آیا، سمرقند بھی جاتا رہا۔ بابر خود لکھتا ہے کہ "اندیجان کی وجہ سے سمرقند کا ہاتھ سے نکل جانا بالکل یہی معنی رکھتا ہے کہ ایک جگہ کے پانے کی کوشش میں میں نے دوسرے مقام کو بھی اپنے ہاتھ سے ضائع کر دیا" یعنی دونوں علاقوں کی حکومت ہاتھ سے چلی گئی۔

بابر نے ان دونوں علاقوں کو دوبارہ دشمن سے لینے کی کئی کوششیں کیں مگر سب رائگاں گئیں۔ اس نے اپنے چچا کو جو بہت مدت سے فرغانہ کو حریصانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا، مدد کے لیے لکھا، مگر اس نے بھی باغیوں سے ساز باز کر لی تھی اس لیے بابر کی مدد

---

[1] فرغانہ کی راجدھانی

سے انکار کر دیا۔

اب بابر کی یہ حالت تھی کہ بالکل تنہا رہ گیا تھا یعنی چند سپاہی اس کے ساتھ رہ گئے تھے مگر وہ کچھ وقعت نہ رکھتے تھے۔ یہ سپاہی بھی بے سروسامان تھے۔ بابر کے مونس و غمخوار تھے۔ اس کے ساتھ ہر قسم کی مشقت اٹھانے کے لیے تیار رہتے باقی سپاہی اور افسر بھی عافیت کی خاطر باغیوں سے مل گئے تھے۔ بابر کے بعض افسروں کے بال بچے اندریجان میں تھے، جو باغیوں کے قبضہ میں تھا اس لیے انھیں بال بچوں کی فکر تھی، جس کی وجہ سے وہ اندریجان چلے گئے اور باغیوں کی دوستی کا دم بھرنے لگے۔

اس واقعہ کے بارے میں بابر لکھتا ہے کہ "میرے ساتھ صرف دو سو آدمی رہ گئے جن میں ہر درجہ کے اچھے اور بُرے آدمی شامل تھے، یہی میرے ساتھ رہ گئے۔ ان کے ہمراہ سمرقند کی ایک لڑائی مجھے لڑنا پڑی۔ اس لڑائی کے بعد میری حالت اور خراب ہو گئی، جس پر اشک حسرت بہانے کے سوا میرے لیے اور کوئی چارۂ کار نہ رہا۔"

بابر کے قبضہ میں اس وقت ایک چھوٹا سا علاقہ خجند رہ گیا تھا، باقی تمام پر باغیوں نے قبضہ کر لیا تھا، اگرچہ حالات بہت مخدوش تھے مگر بابر کی ہمت میں کوئی فرق نہ آیا۔

اس موقع پر بابر نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جو مدد کرے، آخر اسے حاکم تاشقند کا خیال آیا جس سے اسے مدد کی توقع ہو سکتی تھی، چنانچہ وہاں گیا اور اس سے مدد مانگی۔ حاکم تاشقند نے اسے منگولوں کی ایک جمعیت دی، بابر اسے ساتھ لے کر ناسخ نام ایک مقام کی طرف گیا۔ اور فتح کر لیا۔ یہ مقام دارالسلطنت سے چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ لکھتا ہے "میں نے ناسخ فتح کر لیا، مگر اس چھوٹے سے شہر میں میری فوج کے لیے خورد و نوش کا سامان مہیا نہ ہو سکا اس لیے مجبور ہو کر اسے چھوڑنا پڑا، بہرحال مجھے اس شہر کے فتح کرنے سے تھوڑی سی خوشی ہوئی اور میں خوشی خوشی خجند واپس آگیا۔"

بابر خجند واپس آگیا مگر اب اس کے ساتھ اپنے اور ہمراہیوں کے علاوہ تاشقند کا لشکر بھی تھا اس لیے خوراک کی مشکل یہاں بھی پیش آئی۔ خجند بھی چھوٹا سا مقام تھا، جہاں اتنے آدمیوں کے لیے خوراک مہیا نہ ہو سکتی تھی پھر اس علاقے کی آب و ہوا ایسی تھی کہ تاشقند کا لشکر یہاں نہ رہنا چاہتا تھا۔

بابر کے متعلق یہ بات نہایت تعجب خیز ہے کہ اس کے بے شمار رشتہ دار تھے، مگر کسی نے بھی اُسے پناہ نہ دی، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے چچا اس کے خلاف تھے اور چچاؤں کا اتنا اثر تھا کہ بابر کا کوئی رشتہ دار اس کے چچاؤں کی مرضی کے خلاف اس کی مدد نہ کر سکتا تھا۔

عجیب صورت احوال سے بابر کو سابقہ پڑا تھا۔

سمرقند ہاتھ سے نکل گیا۔

فرغانہ کی حکومت بھی چھن گئی۔

کل تک جو صاحب تخت و تاج تھا، اب وہ ایک گدائے راہ تھا، جس کی جیب خالی تھی، لباس تار تار تھا، دوست کوئی نہ تھا، دشمن بہت تھے، پناہ کی کوئی جگہ نہ تھی دشمن ہر طرف سے گھات میں لگے ہوئے تھے آخر وہ ترمذ میں پہنچا، وہاں کا حاکم تواضع پیش آیا، اس کے سامنے بابر نے یہ دکھڑا رویا کہ آج کل میرا حال گیند کا سا ہے، کہ مصیبت کا چوگان کبھی ادھر پھینکتا ہے کبھی ادھر اور زمانے کے ہاتھ سے شطرنج کا بادشاہ بن رہا ہوں، کبھی اس خانے میں کبھی اس خانے میں، ہوا کی طرح سو سو تکاپو کرتا پھرتا ہوں، سرگردانی اور حیرانی کے سوا کچھ حاصل نہیں اب جو دوستانہ صلاح مجھ بتایئے وہی کروں گا، اس امیر صاحب تدبیر نے کہا کہ شیبانی خاں ماوراء النہر پر قابض ہے اور بلخ کا مالک ہے، اور آپ کی سپاہ سب پریشان ہے۔ بہتر یہ ہے کہ

کابل کی طرف جاکر ازبکوں کی حکومت سے دور ہوجائے۔

ندارى اگر با عدو زور جنگ ‌‌ ‌ طریق مدارا گزیں بے درنگ،
زملکش بجائے غا انتقال ‌ ‌ کہ یک چند فارغ شوی از قتال

اب بابر کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی کہ وطن میں رہنا عزت اور غیرت کا مقتضا نہیں ہے اس لیے باپ دادا کے ملک کو سلام کیا اور خدا حافظ کہہ کر چند رفیقوں کی معیت میں بلخ اور کابل کے ارادہ سے روانہ ہوا۔

---

(۹)

بلخ پر قبضہ

مایوسی اور خود فراموشی کے عالم میں بابر نے فیصلہ کرلیا کہ اب اسے بلخ، اور کابل کو فتح کرکے نئی مملکت قائم کرنی چاہیے، سمرقند اور فرغانہ کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔

بلخ کی یہ کیفیت تھی کہ وہاں کا بادشاہ خسرو شاہ بن گیا تھا، وہ بھی بابر کے چچا کا بڑا رفیق تھا اور اس کے چچیرے بھائی بایسنغر مرزا کا وزیر تھا۔ اس نمک حرام وزیر نے اپنے آقا کو مار ڈالا تھا اور اس کے بھائی مسعود مرزا کو اندھا کرکے خود بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ ان بداعمالیوں کے سبب وہ اپنے تئیں محفوظ نہ سمجھتا تھا۔ اس نے چاہا کہ بابر اس کا رفیق بن جائے، جب بابر بلخ میں پہنچا تو اس کے آنے کی ایک دھوم مچی اور مغل سپاہیوں نے خود بخود خسرو شاہ کی نوکری ترک کی، اور خسرو خاں کے سگے بھائی باقی خاں کے ساتھ اس کے پاس آگئے۔ ان کی تعداد آٹھ ہزار سے زیادہ تھی۔ کل تک جس کے پاس صرف دو ڈھائی سو سپاہی تھے، اور وہ بھی ایسے مفلوک کہ کسی کے پاس تلوار کی جگہ لاٹھی اور کسی کے پاس نیزے کی جگہ پونگا، کل دو خیمے جن میں سے ایک بڑے

خیمے میں بابر کی والدہ اتری تھی، اور دوسرے میں خود اترا تھا، یااب یہ نوبت تھی کہ آٹھ ہزار مغلوں کا قواعدداں اور مرتب لشکر جرار موجود ہوگیا۔ آناً فاناً میں خسروشاہ کا دربار ٹوٹ گیا، اب اُس کو جان کے لالے پڑے، بابر کی خدمت میں پیش کش لے کر حاضر ہوا۔ بابر اپنی مروت اور جوانمردی کے سبب سے انتقام کے درپے نہ ہوا اور اسے حکم دیا کہ جتنا مال و اسباب چاہو، ساتھ لے کر خراساں چلے جاؤ، اس نے سونے چاندی کا اسباب اپنے کئی اونٹوں اور گھوڑوں پر لادا اور خراساں کا رستہ لیا۔ خسروشاہ اپنی جان کو سب سے زیادہ عزیز جان کر اور مال و اسباب کو کسی جگہ رکھ کر دو تین آدمیوں کے ساتھ بدیع الزماں مرزا کے پاس چلا گیا[1]۔

خسرو خاں کے فرار نے بابر کو بالکل مطمئن کر دیا۔ اس نے بلخ پر اپنے اقتدار کو اور زیادہ مستحکم کیا اور اب کابل پر چڑھائی کا منصوبہ بنانے لگا۔

---

[1] تاریخ فرشتہ

(۱۰)

فتح کابل

یہ زمانہ مصیبتوں، پریشانیوں اور نامرادیوں کا تھا!

وہ جہاں جاتا تھا مایوسی استقبال کو موجود ملتی تھی جس طرف کا رخ کرتا تھا ناکامی ساتھ ساتھ چلتی تھی جس منزل کی طرف قدم بڑھاتا تھا وہ رُخ پھیر لیتی تھی جس کی طرف دوستی، خلوص اور اتحاد کا ہاتھ بڑھاتا تھا وہ جھٹک دیا جاتا تھا۔ فرغانہ اس کا ملک تھا، مگر اس پر دوسروں کا قبضہ تھا۔

فرغانہ کے ساتھ کیسی کیسی نہ بھولنے والی یادیں وابستہ تھیں۔

شفیق اور محبت کرنے والا باپ عمر شیخ مرزا[1]

ہزار جان سے صدقے اور قربان ہونے والی ماں قتلغ نگار خانم!

عائشہ جس سے پہلی مرتبہ مل کر جسے پہلی مرتبہ دیکھ کر، پہلے پہل جس کی سحر طراز باتیں سن کر اس کا دل مرغ نیم بسمل بن گیا تھا کچھ عجیب سی کیفیت، ایک انجانی سی مبہم سی کیفیت

---

[1] تزک بابری میں بابر نے عمر شیخ مرزا کا جو سراپا کھینچا ہے وہ قابل دید ہے۔ بابر نے ذکر یوں کیا ہے: قد ٹھگنا، چہرے کا رنگ سرخ، چھوٹی گھنی ڈاڑھی، بدن بھاری، مزاج ذرا چالاک، کپڑے بہت چست پہنا کرتے تھے۔ چنانچہ بند باندھتے تھے تو پیٹ سکیڑ لیتے تھے، اکثر ایسا ہوتا کہ باندھنے کے بعد بدن

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جو الفاظ کا جامہ نہ پہن سکی، لیکن خیال کی دنیا پر مسلط ہوگئی، ایک ایسی تصویر جسے مانی و بہزاد بھی نہیں بنا سکتے تھے، جو صفحۂ دل پر نقش ہوئی، اور اس طرح نقش ہوئی کہ پھر مرور ایام، اور حوادث روزگار بھی اسے نہ مٹا سکے۔ یہ تصویر، اس کے دل و دماغ پر طاری ہوگئی۔ یہ تصویر اس کے دل اور دماغ کی مالک بن گئی، اسے اس نے اپنا سب کچھ سونپ دیا، اور سب کچھ سونپنے کے بعد محسوس کیا، جیسے اس نے دنیا کی بہت بڑی قیمت پالی۔

فرغانہ ہاتھ سے نکل گیا، لیکن یہ یادیں، یہ نہ بھولنے والی یادیں کوئی اس سے نہ چھین سکا۔ عمر شیخ مرزا کا انتقال ہوچکا تھا۔ اس سال[1] قتلغ نگار خانم نے بھی داغ جدائی دیا، اور سفر آخرت اختیار کیا۔ عائشہ، غم اور خوشی، دکھ اور سکھ

(گذشتہ صفحے کا حاشیہ)

چھوڑ دیتے یا سانس لیتے تو بند ٹوٹ جاتے تھے ... وہ خاصے پڑھے لکھے تھے، خمسین، مثنوی اور تاریخ کی کتابیں ان کی نظر سے نکلی ہوئی تھیں۔ شاہ نامہ کو بہت دیکھا کرتے تھے، اگرچہ موزوں طبیعت تھی، مگر شعر گوئی پر توجہ نہ کرتے تھے ... وہ سخی بھی بہت تھے اور سخاوت ہی جیسی ان کی اور خصلتیں بھی تھیں، خوش مزاج، فصیح، شیریں کلام اور بہادر آدمی تھے ... تیر انداز اوسط درجے کے تھے، گھونسہ زبردست مارتے تھے، یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کسی کو گھونسا ماریں اور گھونسا کھانے والا گر نہ پڑے، ملک گیری کے خیال میں بہت دوستوں سے بگڑ گئی تھی اور بہت سے قلعے ان سے نکل گئے تھے۔ شروع میں بہت شراب پیتے تھے، پھر ہفتے میں دو ایک مرتبہ مے نوشی کا جلسہ ہونے لگا، خوش صحبت آدمی تھے۔ ایسے موقعوں پر مناسب اشعار پڑھا کرتے تھے۔ آخر آخر معجون بہت کھانے لگے تھے۔ معجون کھانے کے بعد مزاج چڑچڑا ہوجاتا تھا۔ رحم دل بہت تھے۔ ہمیشہ چوسر کھیلتے رہتے، کبھی جوا بھی کھیل لیتے تھے۔"

---

[1] ۱۵۰۴ء

تاریکی اور روشنی، مایوسی اور امید، ہر حالت میں اس کے ساتھ تھی، حق رفاقت، حق وفا ادا کر رہی تھی، لیکن مصیبتوں کے تواتر اور تسلسل نے اس کا حال کیا بنا دیا تھا؟

وہ پھول سا چہرہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا

جس کے ہونٹوں پر ہر وقت تبسم رقص کیا کرتا تھا، وہ ہونٹ اب تبسم سے ناآشنا تھے، جس کے چہرے کی شادابی اور شگفتگی اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ اب وہی چہرہ، یاس والم کا نمونہ بنا ہوا تھا، جیسے اس نے خوشی کبھی دیکھی ہی نہیں۔

سمرقند! — اپنے آبائی وطن کو لینے کے لیے اس نے کیا کیا جتن نہ کیے۔ اس نے بار بار فوج مرتب کی، بار بار سمرقند پر چڑھائی کی، بار بار اسے فتح کیا، لیکن ہر مرتبہ وہاں سے جان بچا کر اسے بھاگنا پڑا۔

اب وہ فرغانہ سے بھی مایوس ہوچکا تھا، اور سمرقند سے بھی — مایوس ہی نہیں بددل بھی، اب اس کے دل میں یہ تمنا نہیں مچلتی تھی کہ فرغانہ چھین لے، اور سمرقند پر قبضہ کرلے۔ اب اسے ایک نئی دنیا کی تلاش تھی۔ اب وہ کسی نئی سرزمین پر قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔

اور آخر بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد، بہت سے مصائب جھیلنے کے بعد اس نے بلخ پر قبضہ کرلیا تھا۔

لیکن کیا بابر جیسا شخص بلخ پر قناعت کرسکتا تھا؟ کیا اس کی حوصلہ مندیاں، اور اولوالعزمیاں اس منزل پر پہنچ کر ختم ہوگئی تھیں؟ — واقعات کا جواب نفی میں ہے، بلخ منزل نہیں تھی؛ منزل کی طرف پہلا قدم تھا!

اب کابل سامنے تھا — اسے کابل کی طرف پیش قدمی کرنی تھی۔ منزل مقصود کی طرف دوسرا قدم، کیونکہ کابل ہی اصل منزل تو نہیں تھی!

بابر نے بلخ پر اپنا قبضہ مستحکم کیا، امن و امان قائم کیا، نظم و انصرام کی طرف توجہ کی

اور ان امور سے فارغ ہونے کے بعد اس کا کاروان شوق کابل کی طرف روانہ ہوا۔

کابل ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ مشرق سے مغرب کی طرف لمبا ہے اور گرد پہاڑ ہیں۔ قلعہ پہاڑ سے ملا ہوا ہے۔ قلعہ کے مغرب اور جنوب کے درمیان ایک چھوٹی سی پہاڑی واقع ہے۔ چونکہ اس کی چوٹی پر کابل کے بادشاہ نے محل بنوایا تھا اسی لیے یہ پہاڑی "شاہ کابل" کے نام سے مشہور ہوگئی۔

جس طرح اہل عرب اپنے ملک کے سوا دوسرے تمام ملکوں کو عجم کہتے ہیں، اسی طرح ہندوستانی، ہندوستان کے سوا دوسرے ملکوں کو خراساں کہتے ہیں۔ ہندوستان اور خراساں کے درمیان خشکی کے بڑے بڑے تجارتی مراکز ہیں۔ ایک کابل دوسرا قندھار۔ کابل میں ترکستان، فرغانہ، بخارا، سمرقند، بلخ، حصار اور بدخشاں کے علاقوں سے قافلے آتے ہیں۔ یعنی کابل کا ملک خراساں اور ہندوستان کے درمیان ایک واسطہ ہے۔ کابل ایک بڑی تجارتی منڈی ہے۔ ہندوستان سے ہر سال کئی ہزار آدمیوں کے قافلے اس ملک میں آتے ہیں یہ قافلے اپنے ہمراہ کپڑا، شکر، مصری وغیرہ لاتے ہیں۔ کابل میں خراساں، روم، عراق اور چین کی بنی ہوئی چیزیں مل سکتی ہیں۔

کابل کی آب و ہوا بہت لطیف ہے، کسی اور جگہ کی ہوا ایسی نہیں۔ گرمی کی راتوں میں بھی پوستین پہنے بغیر نیند نہیں آتی۔ سردیوں میں شدت سے برف پڑتی ہے لیکن سردی زیادہ نہیں ہوتی۔ سمرقند اور تبریز کے علاقے ہوا کی عمدگی کے سبب مشہور ہیں مگر ان شہروں میں سخت سردی پڑتی ہے۔

کابل اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں میں انار، سیب، انگور، امرود، شفتالو، نارنج، بادام، اخروٹ وغیرہ کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ گنا بھی یہاں ہوتا ہے۔ شہد تو بکثرت ہوتا ہے، مگر غزنی کے پہاڑوں کے سوا اور کہیں سے نہیں آتا۔ یہاں ایک قسم کا انگور ہوتا ہے، جسے آب انگور کہتے ہیں۔ یہ بہت لذیذ ہوتا ہے۔

کابل میں کھیتی باڑی اچھی نہیں ہوتی۔ شہر کے چاروں طرف مرغزار ہیں۔ کابل ایک مضبوط مقام ہے۔ دشمن اس علاقے میں آسانی سے نہیں آسکتا۔ کابل کے علاقے میں مختلف قومیں آباد ہیں۔ میدانوں اور گھاٹیوں میں عرب اور ترک رہتے ہیں۔ بعض دیہات شہروں میں تاجیک قوم کے لوگ آباد ہیں۔ بعض مقامات پر پشتون پراچہ، تاجیک ترک اور افغان سکونت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ غزنی کے پہاڑوں میں ہزارہ قوم رہتی ہے۔ ہزارہ کے علاوہ بعض قومیں مغلی زبان بولتی ہیں۔ مشرق اور شمال میں جو کوہستان واقع ہے اسے کافرستان کہتے ہیں۔ اس ملک میں عربی، فارسی، مغلی، ترکی، ہندی، افغانی، پشتو، پراچی، کیبری وغیرہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ شاید ہی کسی ملک میں اس قدر زبانیں بولی جاتی ہوں جتنی اس ملک میں۔ یہ ملک چودہ ضلعوں میں تقسیم ہے۔

کابل کے مشرقی اور مغربی پہاڑ یکساں ہیں۔ اندراب، خوست اور بدخشاں کے پہاڑ سرسبز ہیں اور ان میں کثرت سے چشمے پائے جاتے ہیں۔ کابل کا شہر جن پہاڑوں کے درمیان واقع ہے اُن میں زیادہ تر صاف اور چٹیل میدان ہیں۔ یہاں ہرن کا شکار کم ہے[1]۔

آخر بلخ کے انتظامات سے فارغ ہوکر، اور وہاں پورے طور پر امن و امان قائم کرکے اپنی تھوڑی سی جمعیت لے کر بیخانہ بدوش، لیکن من چلا نوجوان باہر نکلا، اور وہاں سے منزل بہ منزل کوچ کرتا کابل روانہ ہوا۔ کابل کا حال یہ تھا کہ ابوسعید مرزا نے کابل کی حکومت اپنے بیٹے الغ مرزا کو سپرد کی تھی، جب ٩٠٧ھ (۱۵۰۱ء) میں اس کا انتقال ہوگیا تو اس کا بیٹا عبدالرزاق مرزا باپ کا جانشین ہوا، اس کی تخت نشینی کابل میں بدنظمی اور افراتفری کا پیام ثابت ہوئی۔ محمد مقیم چھوٹا بیٹا امیر ذوالنون حاکم کابل پر حملہ آور ہوا۔ عبدالرزاق مرزا اس سے نہ لڑ سکا، اور بھاگ گیا، محمد مقیم کابل کا بادشاہ ہوگیا اور مرزا الغ بیگ

---

[1] تزک بابری

کی بیٹی سے شادی کرلی، جب بابر کابل پر قبضہ کے ارادے سے نمودار ہوا تو عظیم کو
مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اس نے عافیت اسی میں دیکھی کہ سرِ تسلیم خم کرے چنانچہ وہ
بابر کی خدمت میں حاضر ہوا اور قلعہ حوالہ کردیا۔ بابر نے یہ سلوک کیا کہ اسے اجازت
دے دی کہ مال اسباب سمیت اپنے بھائی شاہ بیگ کے پاس چلا جائے۔ غرض کابل پر
بابر کا قبضہ ہوگیا۔ اسی سال قتلغ نگار خانم والدہ بابر نے انتقال کیا، ایک مہینہ اس کا
گزرا تھا کہ ایک بڑا زلزلہ کابل میں آیا۔ قلعہ کی فصیل اور بالائے کوہ شہر اور مواضع پر
اکثر مکان ہموار ہوگئے اور تہہ خانوں اور کوٹھوں پر آدمی دبے کے دبے رہ گئے۔ زمین
ٹکڑے ہوکر کہیں سے کہیں جا پڑی، اور چشمے جاری ہوگئے۔ کہیں ہاتھی کے برابر زمین
پست ہوگئی، کہیں اتنی ہی اونچی ہوگئی۔ زلزلہ کے وقت پہاڑوں پر خاک اڑتی تھی۔ ایک
ہفتے میں پینتیس دفعہ زمین ہلی، اور ایک مہینہ تک ہر شب ایک دو مرتبہ زلزلہ آتا رہا۔
بابر نے برج بارہ قلعہ کی شکست و ریخت کی مرمت کرنے کا سپاہیوں کو حکم دیا جو ایک
مہینہ دس روز میں از سرِ نو تیار ہوگیا، بابر نے پھر لشکر لے جاکر قلعہ قلات کو کہ قندھار
کے توابع میں تھا، بڑے قہر اور جبر سے فتح کیا۔ گو اس تاتاری خانہ بدوش کو افغانستان
میں گھر مل گیا، مگر چین یہاں بھی نصیب نہ ہوا۔ گھر میں بھائی اور چچا دشمن تھے، باہر
دوسرے جہاں ستاں اعدا موجود تھے وہاں ترک اور مغل دشمن تھے یہاں افغان دشمن
تھے۔ وہ ان دشمنوں کے ساتھ مقابلہ کرنے میں اب تک کامیاب نہ ہوا تھا۔

اگر وہ داد و دہش سے کام لیتا تھا تو اسے اس کی کمزوری پر محمول کیا جاتا تھا۔ اگر
سختی اور تشدد کا ارتکاب کرتا تو اسے اس کے "غیر ملکی" ہونے کا نتیجہ قرار دیا جاتا تھا، غرض کسی
پہلو قرار نہ تھا۔ عزیز بھی دشمن تھے، اور جو دشمن تھے، وہ صحیح معنوں میں دشمن جان تھے۔

لیکن ان نامساعد، حوصلہ فرسا، اور حد درجہ مایوس کن حالات میں بھی نہ اس کا
حوصلہ ہارا، نہ عزم کا دامن چھوڑا، وہ دشمنوں سے لڑتا تھا، کبھی ہارتا تھا کبھی فتح

ہوتا تھا، کبھی راہ فرار اختیار کرتا تھا کبھی کسی سرزمین پر مسند شہریاری بچھا کر داد
فرماں روائی دینے لگتا تھا۔ لیکن اس کی کسی حالت اور کیفیت کو بھی نہ ثبات حاصل تھا
نہ استقلال، ایک گزراں کیفیت تھی۔ آج کچھ ہے، کل کچھ ــــ اور پرسوں کچھ۔

بہرحال اب وہ کابل پر قابض اور متصرف تھا، ایک مرتبہ پھر تاج شاہی اس کے
سر پر تھا۔

لیکن یہ کابل کا تخت اس کے حوصلوں کی تسکین نہ کرسکا۔

زمانہ نے اب تک اسے ٹھکرایا تھا لیکن وہ زمانے کو ٹھکراتا رہا۔

قسمت کی طرف سے اب تک اسے کیا ملا تھا؟

ناکامیاں، خود میاں، مایوسیاں ــــ اور تلخیاں!

لیکن اس کا عزم محکم قسمت سے بھی برابر کی چوٹ لڑ رہا تھا،

ہر ناکامی اس کے عزمِ عزم پر تازیانہ ثابت ہوئی،

ہر محرومی اس کے حوصلے اور ولولے میں ایک نیا رنگ بھرتی رہی۔

ہر مایوسی کو اس نے نئی امیدوں اور آرزوؤں کا لباس پہنا دیا۔

ہر تلخی کو اس نے جامِ شراب سمجھا اور نوش کرگیا،

اور جس طرح وہ ناکامیوں سے بددل نہیں ہوتا تھا اسی طرح معمولی کامیابیاں
اسے کچھ زیادہ مسرور بھی نہیں کرتی تھیں،

کابل کا تخت اس کے قافلۂ حیات کے لیے صرف ایک منزل تھا،

یعنی آگے چلیں گے دم لے کر!

وہ کابل میں دم لے رہا تھا، اور آگے بڑھنے کا دل ہی دل میں منصوبہ
تیار کر رہا تھا۔

یہ منصوبہ ابھی صرف اس کے ذہن و دماغ میں تھا لیکن وہ وقت ــــ

—— کم از کم اس کی نظروں کے سامنے —— بہت قریب تھا، جب ایک مرتبہ پھر
اس کا عزم جواں، اس کرۂ ارض پر ایک عظیم انقلاب کا موجد بنے گا۔
جب ایک مرتبہ پھر وہ طوفان کی طرح اٹھے گا، اور آندھی کی طرح
چھا جائے گا، اس کی حسرتیں اور آرزوئیں، عملی صورت اختیار کریں گی اور وہ فتح
اسے حاصل ہو جائے گی جس کا وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہے۔

.... جس دیس میں
گنگا بہتی ہے ....

(۱)

ایلچی

ہندوستان جنت نشان!

ہندوستان پر پٹھانوں کا ایک خاندان ـــــ لودھی ـــــ حکمران ہے!

اس خاندان کا آغاز جتنا شاندار تھا، انجام اتنا ہی تاریک ہے!

تختِ حکومت پر ابراہیم لودھی متمکن ہے ـــــ ایک بے مغز نوجوان!

ابراہیم لودھی کو ایک مضبوط اور شاندار حکومت ورثہ میں ملی تھی! لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا اس حکومت کو یہ سنبھال نہیں سکتا۔ یہ خود سر تھا، خود رائے تھا، ضدی تھا، بے تدبیر تھا، بے مغز تھا، مغرور اور متکبر تھا، جن لوگوں نے اس خاندان کو وارثِ تاج و تخت بنانے میں حصہ لیا تھا۔ جنھوں نے اس برخود غلط نوجوان کے باپ دادا کے گراں بہا خدمات انجام دیئے تھے، جنھوں نے اس حکومت اور سلطنت کے استحکام میں اپنا خون صرف کیا تھا جنھوں نے بڑی بے لوثی، وفاداری اور سچائی کے ساتھ اپنے آقایانِ ولی نعمت کا ہر حالت میں ساتھ دیا تھا جن کے تدبر، جن کی تدبیر اور جن کی فراست نے ہر کٹھن، نازک، اور خطرناک مرحلہ پر سد سکندری بن کر آفتوں، بلاؤں اور مصیبتوں کا مقابلہ کیا تھا، آج وہ حقیر و ذلیل تھے، ان کی بات بھی نہیں پوچھی جا رہی تھی۔ ان کی جاگیریں

ضبط کی جا رہی تھیں، ان کے عہدے چھینے جا رہے تھے، انھیں قتل کیا جا رہا تھا۔ انھیں
پابجولاں کر کے اسیرِ زنداں کیا جا رہا تھا، اور ان لوگوں کو آگے بڑھایا جا رہا تھا،
سرفراز کیا جا رہا تھا جن کے پاس نہ علم کی پونجی تھی، نہ فراست کی، نہ وفاداری کی،
نہ خلوص اور سچائی کی۔

بے شک یہ نوجوان فرماں روا تلوار کا دھنی تھا، ارادے کا پکا تھا، بہادری میں
یکتا تھا، لیکن صرف بہادری سے کام نہیں چلتا۔ ایک حکومت کو کامیابی کے ساتھ چلانے
کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے ان سے یکسر محروم تھا۔ نہ مردم شناس تھا
نہ فرض شناس، رعایا کسی حال میں ہو: سے اپنی رنگ رلیوں سے کام۔ ناؤ و نوش
چنگ و رباب، رقص و نغمہ یہی اس کے مشاغل تھے، انہی چیزوں سے اس کی دنیا عبارت تھی

ان حالات نے عوام میں بددلی اور مایوسی پیدا کر دی تھی اور اس نظامِ حکومت سے
اس فرماں روا سے، اس خاندان کے تسلط سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے — لیکن
کیونکر؟ کس طرح؟ یہ سوال تھا جس نے لوگوں کو الجھن میں ڈال رکھا تھا اور کسی کو
کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا!

دولت خاں اس خاندان کا دیرینہ خدمت گزار تھا۔ بہت سے نازک اور کٹھن
مرحلوں پر اس نے اپنی شجاعت اور وفاداری کی دھاک بٹھا دی تھی، یہ خاندان اس کا
ممنون تھا، اس کی سربلندی اور سرافرازی میں دولت خاں کا بھی حصہ تھا — معمولی نہیں

اور یہ دولت خاں متعدد مواقع پر ثابت قدم رہا تھا، جسے دشمنوں کی بڑی سے
بڑی تحریص اور ترغیب نہیں خرید سکی تھی۔ آج شاہ والا جاہ کا معتوب تھا، اپنی
زندگی، جان، مال، آبرو ہر چیز خطرے میں محسوس کر رہا تھا، اور اتنا بددل ہو چکا تھا
کہ سوچ رہا تھا، کیا کرے؟ کہاں جائے؟

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ دولت خاں اپنی حویلی میں چند مخصوص ندیموں اور

مصاحبوں کے جلو میں بیٹھا ہوا تھا، لیکن آج یہ مجلسِ نشاط بزمِ ماتم نظر آ رہی تھی۔ سب کے
چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی بہت بڑا مرحلہ ہے جسے طے
کرنے کے لیے یہ لوگ بیٹھے ہیں، لیکن راہِ عمل مسدود نظر آ رہی ہے۔ کوئی بہت بڑی الجھن ہے
جسے حل کرنا چاہتے ہیں لیکن حل نہیں کر پاتے کسی طرح۔

یکایک دولت خاں نے بے کلی اور اضطراب کے عالم میں کہا:

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس ملک کو چھوڑ دوں!"

ایک مصاحب نے جس کا نام احمد خاں تھا، کہا،

"جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جائیں کہاں؟ کون ہمیں پناہ
دے گا؟ کون ہمیں عزت اور سربلندی عطا کرے گا؟"

دولت خاں نے ابھی جواب میں کچھ نہیں کہا تھا کہ ایک اور مصاحب ولی خاں باہر
سے آ کر شریکِ محفل ہو گیا۔ اس نے کہا:

"آپ کے پاس ایک پیغامبر آیا ہے"!

دولت خاں نے چونک کر پوچھا "پیغامبر؟ اس وقت؟ — کون ہے وہ؟"

ولی خاں نے جواب دیا،

"اس وقت کہ دوست ہمارا ساتھ چھوڑ رہے ہیں، دشمنوں کی طرف سے دوستی کا
پیمان باندھا جا رہا ہے؟"

احمد خاں، ولی خاں سے الجھ پڑا اس نے کہا،

"تم تو پہیلیاں بجھاتے ہو صاحب، کیوں نہیں کہتے؟ کون ہے؟ کس کی طرف
آیا ہے؟ اور کیا پیغام لایا ہے؟"

ولی خاں نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ جواب دیا۔

"آنے والے کا نام ہے تمہت رائے!"

دولت خاں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"ہمت رائے! — کس کا ایلچی بن کر آیا ہے؟"

ولی خاں نے فاتحانہ لہجہ میں کہا "راناسانگا کا!"

راناسانگا کا نام سن کر سب مہر بہ لب ہوگئے!

برمیواڑ کا سب سے زیادہ جیالا، بہادر اور طاقتور فرماں روا تھا، لودھی خاندان کوشش بسیار کے باوجود اسے زیر نہیں کر سکا تھا۔ راناسانگا کا خیال تھا کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کا صرف ہمی کو حق ہے، وہ اپنے اس حق میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتا تھا، اس نے کئی مرتبہ لودھی خاندان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا، لیکن کسی ناکامی نے بھی اسے مایوس اور دل برداشتہ نہیں کیا، ہر مرتبہ نئے عزم اور جوش کے ساتھ، وہ اپنی تیاریوں میں منہمک ہو جاتا تھا — کبھی جنگ کے میدان میں، کبھی سازش کی بساط پر،

دولت خاں نے ولی خاں سے کہا

"اسے حاضر کرو، ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں!"

تھوڑی دیر کے بعد، ولی خاں ایک راجپوت سپاہی کو لے کر حاضر ہوا، یہ میدو کاٹھی کا ایک خوبصورت، اور طرح دار نوجوان تھا، دولت خاں نے تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور چند رسمی باتوں کے بعد گویا ہوا،

"ہمارے دوست راناسانگا نے بھیجا ہے تمہیں؟"

ہمت رائے نے ادب کے ساتھ جواب دیا۔

"جی ہاں، غلام اپنے آقا کا پیغامبر بن کر حاضر ہوا ہے!"

"لیکن پیغام؟"

"میرے آقا نے کوئی تحریری پیام نہیں بھیجا ہے، اس لیے کہ راستہ پرخطرے، اور

خطرناک ہیں۔ بات ایسی ہے جو صرف آپ ہی سے کی جا سکتی ہے، میرے آقا نہیں چاہتے کہ کسی کو ان باتوں کا علم ہو، لہٰذا میں جو کچھ عرض کروں گا تخلیہ میں عرض کروں گا!"

دولت خاں کا اشارہ پاتے ہی تمام احباب اور ندیم خاموشی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ اب وہ ہمت رائے سے مخاطب ہوا، اس نے کہا،

"اب یہاں کوئی نہیں ہے تم آزادی سے جو چاہو کہہ سکتے ہو!"

ہمت رائے: میرے آقا نے آپ کو اشتراک عمل اور تعاون کی دعوت دی ہے۔

دولت خاں: اشتراک عمل دولت خاں سے؟ یہ میں کیا سن رہا ہوں؟

ہمت رائے: ہندوستان کے حالات بہت ابتر ہو چکے ہیں کیا آپ مانتے نہیں؟

دولت خاں: حقیقت کا انکار کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ واقعی حالات بہت ابتر ہو چکے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔

ہمت رائے: لودھی خاندان اب مائل بہ زوال ہے، جو جاہ و جلال اس خاندان نے حاصل کیا تھا، وہ ابراہیم لودھی کے ہاتھوں ختم ہوتا جا رہا ہے، بلکہ بڑی حد تک ختم ہو چکا ہے — کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟

دولت خاں: اس کا احساس تم سے اور تمہارے آقا سے زیادہ مجھے ہے — لیکن تمہیں یا تمہارے آقا کو اس خاندان کے عروج و زوال سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ ہندوستان کے حالات اگر ابتر ہیں تو تمہارے آقا کو خوش ہونا چاہیے۔

ہمت رائے: نہیں وہ خوش نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ — محب وطن ہیں۔ اس ملک کی تباہی، بربادی، اور زوال سے انہیں رنج ہو سکتا ہے، خوشی نہیں ہو سکتی۔

دولت خاں: پھر تمہارے آقا کیا چاہتے ہیں؟ کیا مرضی ہے ان کی؟

ہمت رائے: میرے آقا کی خواہش یہ ہے کہ یہ ملک ایک مرتبہ پھر سرسبز و شاداب ہو جائے، آباد اور مرفہ الحال ہو جائے۔ پھر یہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں۔

پھر یہاں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پئیں۔ پھر یہاں ہر شخص سکھ، چین اور عافیت کی زندگی بسر کرے۔

دولت خاں : تمہارے آقا کی اس آرزو، اور تمنا میں دولت خاں برابر کا شریک ہے۔ اس لیے کہ وہ بھی محب وطن ہے اور اس کا وطن بھی یہی سرزمین ہے۔ وہ یہیں پیدا ہوا ہے اور اسی زمین میں دفن ہوگا۔

ہمت رائے : بے شک، بے شک آپ کے اس ارشاد میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

دولت خاں : (مسکراتے ہوئے) تو تمہارے آقا نے ہندوستان کو ایک مرتبہ پھر جنت نشان بنانے کی کیا تدبیر سوچی ہے؟

ہمت رائے : پہلے میرے ایک سوال کا جواب اور دے لیں۔

دولت خاں : شوق سے سوال کرو ہم جواب دیں گے۔

ہمت رائے : آج رعایا کا کیا عالم ہے؟ ― کیا وہ بھوکوں نہیں مر رہی ہے؟ کیا راستے محفوظ ہیں؟ کیا حق دار کو اس کا حق ملتا ہے؟ کیا ظالم سزا پاتا ہے؟ کیا مظلوم کی دادرسی ہوتی ہے؟

دولت خاں : تمہارے اس سوال کا جواب وہی ہے، جو تمہارے ذہن میں ہے۔ یعنی نہیں مگر اس سوال کا مقصد؟

ہمت رائے : مقصد یہ ہے کہ آئیے ہم اور آپ مل کر حالات کو سدھاریں۔

دولت خاں : کس طرح؟ کیونکر؟

ہمت رائے : ان حالات کا علاج صرف ایک مضبوط حکومت میں مضمر ہے جب تک ایک قوی، مستحکم، اور مضبوط حکومت نہیں قائم ہوتی۔ حالات اور زیادہ ابتر ہوتے چلے جائیں گے۔

دولت خاں : ٹھیک کہتے ہو لیکن قوی اور مستحکم اور مضبوط حکومت قائم ہونے کی کوئی صورت تمہارے ذہن میں ہے؟ یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے۔

ہمت رائے : وہ صورت یہ ہے کہ لودھی خاندان ختم کر دیا جائے۔ اس خاندان کی حکومت ختم کر دی جائے، ملک پر رانا سانگا، اور دولت خاں کی حکومت ہو۔ یہ حکومت مشترک بھی ہو سکتی ہے اور انفرادی طور پر بھی۔ میرا مقصد یہ ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ رانا سانگا، اور دولت خاں مل کر کاروبار مملکت چلائیں۔ ایک فرمانروا بن جائے۔ دوسرا اس کا وزیر با تدبیر۔ اور ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں الگ الگ علاقے اپنے لیے تجویز کر لیں، اور آزادی و خود مختاری کے ساتھ ان علاقوں پر بلا شرکت غیرے حکومت کریں۔

دولت خاں : لیکن سوال یہ ہے کہ ―

ہمت رائے : آپ کے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ آپ جو ضمانت چاہیں وہ دی جا سکتی ہے، جیسا تیقن چاہیں وہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ دیکھیے، یہ تلوار جو میری کمر سے بندھی ہے میری نہیں رانا سانگا کی ہے اور یہ رانا سانگا کی قائم مقام بن کر آئی ہے اس کے سامنے جو عہد بھی میں آپ سے کروں گا، وہ ہمت رائے کا عہد نہیں ہوگا رانا سانگا کا ہوگا! ― کیا آپ رانا سانگا کو بہادر، جیالا اور بات کا دھنی نہیں مانتے؟

دولت خاں : مانتا ہوں، میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں کئی معرکوں میں ہمارا آمنا سامنا ہو چکا ہے۔ چوٹیں بھی چل چکی ہیں۔

ہمت رائے : جی ہاں چوٹیں چل چکی ہیں، اور ایک مرتبہ میرا آقا چوٹ کھا بھی چکا ہے۔

دولت خاں : (ہنستے ہوئے) ہاں ― پرانی بات ہے لیکن کیا رانا سانگا کو یاد ہے؟

ہمت رائے : جی ہاں، اسی طرح، جیسے یہ کوئی پرانی بات نہ ہو، آج ہی کا واقعہ ہے، وہ ارشاد فرمایا کرتے ہیں، یہ زخم کا نشان نہیں، ایک بہادر اور دلیر دشمن

کی شجاعت کا غیر فانی نقش ہے۔ یہ اس وقت تک میرا رفیق رہے گا، جب تک میں زندہ ہوں!

دولت خاں: اچھا یہ بات ہے؟

ہمت رائے: وہ فرمایا کرتے ہیں دولت خاں کی بہادری اور شجاعت نے دشمن ہونے کے باوجود مجھے ان کا دوست بنا دیا ہے۔

دولت خاں: بہادر مجبور ہے کہ بہادر کی عزت کرے، قدر کرے۔

ہمت رائے: یہی وجہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ یہ دو بہادر مل کر اس ملک کو تباہ ہونے سے بچا لیں، اور ایک ایسی مضبوط حکومت قائم کر لیں جو ہر طرح مضبوط اور مستحکم ہو، داخلی طور پر بھی اور خارجی طور پر بھی، ملک میں کوئی فتنہ سر نہ اٹھا سکے، اور کوئی دشمن ادھر کا رخ نہ کر سکے۔

دولت خاں: کیا کسی دشمن کا خطرہ بھی ہے؟

ہمت رائے: کیوں نہیں ہے۔

دولت خاں: مثلاً؟ —— کون ہو سکتا ہے وہ دشمن؟

ہمت رائے: کیا میں بابر کا نام نہیں لے سکتا؟

دولت خاں: (کچھ سنبھلتے ہوئے) ہاں بابر —— بے شک اس کے دل میں ہندوستان فتح کرنے کی آرزو ہے، وہ ادھر کا رخ کر سکتا ہے، ایک مرتبہ اس نے بھی مجھے ہمراہ کرنے، اور اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی، لیکن ——

ہمت رائے: پھر آپ کے قابو میں نہ رہا تھا؟

دولت خاں: میں آقاؤں کی تبدیلی پر راضی نہیں ہو سکتا۔

ہمت رائے: (خوش ہو کر) بہت خوب —— اور آپ کو اس کی ضرورت کیا ہے قدرت نے آپ میں وہ ساری صلاحیتیں ودیعت کر دی ہیں جو ایک اولوالعزم بادشاہ

میں ہونی چاہئیں۔

دولت خاں: اس سفر نے تمہیں بہت خستہ اور نڈھال کر دیا ہے، اب آرام کرو، صبح پھر ہماری گفتگو ہوگی۔

---

(۲)

دولت خاں اور احمد خاں

دولت خاں نے اپنے ندیموں اور مشیروں سے صلاح کی، ابراہیم لودھی کے خلاف سب ہی بھرے بیٹھے تھے سب نے اس خیال کی تائید کی، لیکن احمد خاں نے اختلاف کا اظہار کیا، اس نے کہا:

"اگر آپ نے رانا سانگا کا ساتھ دیا تو نہ ابراہیم لودھی سلامت رہے گا، نہ مسلمانوں کی یہ حکومت جو بڑی مشکل سے، اور بڑی جانکاہی سے قائم ہوئی ہے ختم ہوجائے گی، اور پھر مسلمانوں کا نام بھی اس دیس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔"

ولی خاں نے مشتعل ہوکر احمد خاں سے دریافت کیا:

"یہ کیوں؟ ـــــ کیا رانا سانگا ملک الموت ہے کہ جسے چاہے مار ڈالے؟"

ایک اور ندیم حمید مرزا نے کہا:

"جہاں تک ابراہیم کا تعلق ہے اسے مرنا ہی چاہیے، جہاں تک لودھی خاندان کا تعلق ہے اسے فنا کے گھاٹ اترنا ہی چاہیے، یہ خاندان اپنی عمر پوری کرچکا ہے، شخص ہرگز زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتا، لیکن دولت خاں کو، اور مسلمانوں کو بھلا کون فنا کے گھاٹ اتار سکتا ہے؟"

احمد خاں: ہماری نا اتفاقی

ولی خاں: اتفاق کا پھل دیکھ لیا، نتیجہ جو کچھ ہے سامنے ہے۔

حمید مرزا: کیا رانا سانگا دولت خاں کی شمشیر جوہر دار کے وار جھیل سکتا ہے زندگی بھر؟

ولی خاں: کبھی نہیں، ہرگز نہیں ـــــ اگر وہ دولت خاں کی دلیری، شجاعت، اور تہور کا قائل نہ ہوتا تو ہرگز رائے کر ہرگز یہاں نہ بھیجتا اور شریک حکومت بنانے پر تیار نہ ہوتا۔

حمید مرزا: صرف شریک حکومت ہی نہیں، وہ تو اس پر بھی تیار ہے کہ دولت خاں اپنی آزاد اور خود مختار حکومت جداگانہ طور پر قائم کرلیں۔

احمد خاں: بہرحال میری رائے یہ نہیں ہے۔

دولت خاں: کیا تم ہمارا ساتھ نہیں دوگے احمد خاں؟

احمد خاں: نہایت ادب کے ساتھ میرا جواب انکار میں ہے۔

دولت خاں: لیکن تم نے تو ہر مرحلہ پر، ہر موقع پر، پوری وفاداری، اور جاں نثاری سے ہمارا ساتھ دیا ہے اب پیچھے کیوں دکھا رہے ہو؟

احمد خاں: میں نے آپ کا ساتھ اس لیے دیا تھا کہ آپ مسلمانوں کے لیے لڑتے تھے۔

ولی خاں: اور اب؟

احمد خاں: اب یہ ذاتی جنگ ہے، یہ جنگ مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے، میں کسی ایسے شخص کا ساتھ نہیں دے سکتا، جو اپنی قوم کے خلاف جنگ آزما ہو۔

دولت خاں: کیا تم ابراہیم لودھی کی خود غرضیوں، سفاکیوں اور نخوتوں کو بھول چکے ہو؟

احمد خاں: ہرگز نہیں، مجھے سب کچھ یاد ہے۔

دولت خاں: پھر تم اس کی حمایت کیوں کر رہے ہو؟

احمد خاں: میں آپ کے مقابلہ میں اس کی حمایت کر رہا ہوں اس لیے کہ اس سے جنگ کرکے آپ اسے تو ختم کردیں گے لیکن خود بھی ختم ہوجائیں گے، اور پھر مسلمان بھی اس دیس میں پنپ

نہیں سکیں گے۔

ولی خاں : یہ بزدلی کی باتیں ہیں صاف کہہ دو تم یہاں ہو۔ لیکن تمہارا دل ابراہیم کے ساتھ ہے۔

احمد خاں : میں دروغ گو اور منافق نہیں ہوں، جانتا ہوں۔ ابراہیم تاج و تخت کا اہل نہیں ہے۔ جانتا ہوں اس خاندان کی عمر ختم ہو چکی ہے ——

ولی خاں : اور یہ سب کچھ جانتے ہو پھر بھی ——

احمد خاں : ہاں، —— اور یہ بھی جانتا ہوں کہ رانا سانگا لودھی خاندان کو ختم کر کے دولت خاں کو بھی ختم کر دے گا، جو شخص لودھی خاندان کو فنا کر سکتا ہے وہ دولت خاں کو بھی فنا کر سکتا ہے، ابراہیم کے پاس فوج ہے، دولت ہے، وسائل و ذرائع ہیں، دولت خاں کے پاس یہ کچھ نہیں ہے۔

دولت خاں : آخر تم چاہتے کیا ہو احمد خاں؟

احمد خاں : میں چاہتا ہوں کہ رانا سانگا کا ساتھ دے کر اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ نہ لگائیے، اپنا نام ملت کے غداروں کی فہرست میں نہ لکھائیے، ایسا کام نہ کیجئے کہ آنے والی نسلیں آپ پر لعنت بھیجیں۔

دولت خاں : (برہمی کے عالم میں) احمد خاں! تم حد سے تجاوز کر رہے ہو؟

احمد خاں : میں معافی چاہتا ہوں، لیکن میری رائے پہاڑ کی طرح اٹل ہے۔

دولت خاں : کیا تمہارا مشورہ یہ ہے کہ اس کمزور حکومت کا ساتھ دے کر ہم مزید ذلت اور رسوائیاں مول لیں۔

احمد خاں : ہرگز نہیں —— میں نے کب کہا کہ اس نامعقول، ناہنجار، اور ناقابل اعتماد حکومت کا ساتھ دیں۔

دولت خاں : کتنی عجیب بات ہے، نہ تم یہ کہتے ہو، نہ وہ، نہ یہ چاہتے ہو، نہ وہ

یہ تمہارا مقصد ہے نہ وہ —— آخر اپنا مدعا صاف صاف کیوں نہیں بیان کرتے؟

احمد خاں : میرا مدعا یہ ہے کہ رانا سانگا کے ایلچی کو واپس کر دیں، اس سے کہہ دیں ہم اپنی قوم سے بے وفائی نہیں کر سکتے۔

دولت خاں : فرض کرو، یہ کہہ دیں، اس کے بعد؟

ولی خاں : اصل سوال تو یہی ہے اس کا جواب دو؟

حمید مرزا : جب تک اس مسئلہ کا حل نہ ہو یہ فصیح و بلیغ تقریر جو جناب نے ارشاد فرمائی ہے لغو اور بے معنی ہے۔

احمد خاں : اور اس کے بعد اپنا ایک ایلچی بابر کے پاس بھیجئے ——

دولت خاں : کیا کہا؟ —— بابر کے پاس؟

احمد خاں : جی ہاں، ظہیر الدین بابر کے پاس، آپ اسے جانتے ہیں، وہ من چلا ہے شہزادہ ہے، اس کے پاس فوج بھی ہے، اسے بڑی بڑی جنگوں کا تجربہ بھی ہے۔ وہ شاہی خاندان کا ایک سربرآوردہ فرد بھی ہے، اس کا باپ بھی بادشاہ تھا، وہ خود بھی بادشاہ رہ چکا ہے، وہ رانا سانگا کو شکست دے سکتا ہے، وہ ابراہیم کا نعم البدل بن سکتا ہے۔ اس کی حکومت قائم رہ سکتی ہے، میں، آپ، دولت خاں، سب سپاہی ہیں بادشاہ نہیں بن سکتے۔

ولی خاں : کیوں نہیں بن سکتے؟

احمد خاں : بن جائیے، میں نے آپ کو منع تو نہیں کیا ہے؟ لیکن میں اپنا خون آپ کے ساتھ مل کر نہیں بہا سکتا۔

دولت خاں : کیا بابر یہاں چلا آئے گا؟

احمد خاں : اگر اسے بلایا جائے تو ضرور چلا آئے گا۔

دولت خاں : (فیصلہ کن انداز میں) احمد خاں تمہاری رائے سے ہمیں اتفاق ہے۔

— لیکن بابر کے پاس جائے گا کون ؟

احمد خاں : جسے چاہیے بھیج دیں ، بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ خود چلے جائیے۔

دولت خاں : یہ ہو سکتا ہے ، اور میں یہی کروں گا ، لیکن ایک کام تمہیں بھی کرنا پڑے گا

احمد خاں : ارشاد ، بسر و چشم تعمیل ارشاد کروں گا۔

دولت خاں : ہم صاف اور دو ٹوک الفاظ میں رانا سانگا کو جواب دینا نہیں چاہتے۔ یہ مصلحت کے خلاف ہے۔

احمد خاں : پھر آپ کیا چاہتے ہیں ؟

دولت خاں : ہم ایک ذو معنی خط لکھیں گے ، وہ لے کر تم ہمت رائے کے ساتھ رانا کے پاس جاؤ ۔ اس عرصہ میں ہم بابر کا عندیہ معلوم کیے لیتے ہیں ، اگر اس نے ہماری تجویز مان لی ، اور فتح ہندوستان کا ارادہ کر لیا تو فبہا ، اور اگر کسی وجہ سے اس مقصد میں کامیابی نہ ہوئی ، تو پھر رانا سانگا سے صلح قائم رکھ کر ہمیں اپنے آئندہ ، اقدام و عمل کے بارے میں کوئی فیصلہ باہم صلاح و مشورہ کے بعد کرنا پڑے گا۔

احمد خاں : بہت خوب ، میں ہمت رائے کے ساتھ رانا سانگا کے پاس آپ کا ایلچی بن کر جانے کو تیار ہوں !

---

(۳)

ارے ......!

احمد خاں ، ہمت رائے کے ساتھ رانا سانگا کی راجدھانی کی طرف روانہ ہو گیا۔ کئی دن تک شبانہ روز مسافت طے کرنے کے بعد ، یہ لوگ منزل کے قریب پہنچے۔ گو رات ہو چکی تھی ، لیکن مندروں کے کلس دور سے نظر آ رہے تھے ، شہر کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی بھی دور سے اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔

ہمت رائے نے خوش ہو کر احمد خاں سے کہا :

"بھگوان کی کرپا سے آخر ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ، اور کسی طرح کا کوئی حادثہ نہیں پیش آیا !"

احمد خاں نے جو بہت تھک چکا تھا جواب دیا۔

"ہاں بھئی خدا کا شکر ہے —— کیا رانا سے ہم اسی وقت مل سکیں گے ؟"

ہمت رائے نے ایک قہقہہ لگایا اور پیار سے اپنے گھوڑے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا ،

"ابھی تو تم نے سفر ہی نہیں کھولی ہے ، دو چار دن تمہیں میرا مہمان رہنا پڑے گا ، پھر رانا کے مہمان خانے میں پہنچا دیئے جاؤ گے ، اور پھر ، کچھ دن انتظار کے بعد شرف باریابی عطا کیا جائے گا ، ہمارے رانا صاحب ، دولت خاں کی طرح ایک سپاہی یا سردار نہیں ہیں

وہ ایک بڑے علاقہ کے بادشاہ ہیں اور بہت جلد اس پورے ملک کے فرماں روا بن جائیں گے۔ ان کی آن اور شان ایسی ہی ہے جیسی بادشاہوں کی ہوا کرتی ہے!"

ان باتوں سے احمد خاں کا خون کھول گیا، لیکن اس نے ضبط سے کام لیا، یہ وقت تلخ کلامی اور کشمکش کا نہیں تھا، اس نے کہا:

"ہاں بھئی بادشاہوں کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے!"

ہمت رائے نے زہر خند کرتے ہوئے کہا:

"لیکن تم نے بادشاہوں کا دربار دیکھا بھی ہے کبھی؟ بادشاہوں کے سامنے پیش ہوئے ہو کبھی؟ بادشاہوں کے رنگ ڈھنگ سے واقف بھی ہو؟ ——"

احمد خاں نے پھر ضبط سے کام لیا، اور جواب میں کہا:

"نہیں —— ہم ٹھہرے سپاہی آدمی، بھلا بادشاہوں کے دربار سے ہمیں کیا واسطہ؟"

ہمت رائے کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ دفعتہً اس نے زور سے گھوڑے کی لگام کھینچی اور سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ کیا ہے؟ —— یہ کون ہے؟"

احمد خاں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کوئی سوار عام راستے سے ہٹ کر پگڈنڈی پگڈنڈی، سامنے کے جنگل کی طرف چلا جا رہا ہے، اس نے کہا:

"کوئی سوار معلوم ہوتا ہے!"

ہمت رائے نے کہا:

"لیکن اس وقت؟ اب تو شہر پناہ کے دروازے بند ہو چکے ہوں گے، اب شہر کے اندر آنا جانا، صرف خاص اجازت ہی سے ہو سکتا ہے! اور پھر یہ جنگل کی طرف کیوں جا رہا ہے؟ —— مجھے تو کچھ دال میں کالا معلوم ہوتا ہے!"

احمد خاں نے کہا، تو پھر ایڑ لگاؤ گھوڑے کو، ابھی پہنچے جاتے ہیں اس سوار کے پاس

خود ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

ہمت رائے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور اس سوار کی طرف گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا بڑھا۔ احمد خاں نے بھی اس کی تقلید کی۔

سوار نے اب تک ان دونوں کو نہیں دیکھا تھا، نہ جانے کس دھن میں مست، ہر خطرے سے بے پروا، وہ رواں دواں چلا جا رہا تھا، لیکن جب اس نے ٹاپوں کی آواز سنی، اور اپنے پیچھے دو سواروں کو آتا دیکھا تو اس نے بھی ایڑ لگائی اور ہوا ہو گیا۔ اس کا گھوڑا تازہ دم تھا، ان دونوں کے گھوڑے منزل مارتے ہوئے آ رہے تھے، کافی تھک چکے تھے۔ ہمت رائے کا گھوڑا تو تھوڑی دیر کے بعد رک گیا، لیکن احمد خاں کے سمندباد پا نے ذرا دیر میں سوار کو جا لیا۔

احمد خاں نے آواز دی:

"جو کوئی ہے ٹھہر جائے، ورنہ میرا تیر پیٹھ پر لگے گا اور سینہ توڑ کر نکل جائے گا"

یہ آواز بڑی بارعب اور با اثر تھی لیکن سوار نہ مرعوب ہوا نہ متاثر، اس نے کوئی جواب نہیں دیا، اور بدستور بھاگتا رہا۔ احمد خاں نے پہلے تو ارادہ کیا کہ تیر چلا دے پھر سوچا نہ جانے یہ کون ہے، اسے گرفتار کر لینا بہتر ہے اور پھر اب فاصلہ بھی زیادہ نہیں رہ گیا تھا، ذرا دیر میں وہ بالکل اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے گھوڑے کی لگام اس نے مضبوطی سے پکڑی۔ گھوڑا رک گیا، احمد خاں نے سوار سے سوال کیا۔

"تم کون ہو؟ اور کہاں جا رہے ہو؟"

سوار نے جو ایک لبادے میں لپٹا ہوا تھا، اور جس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں جواب دیا۔

"تمہیں کسی کی منزل کھوٹی کرنے کا کیا حق ہے؟"

احمد خاں نے کہا "یہ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے!"

یہ کہہ کر اس نے ایک جھٹکے میں سوار کو گھوڑے سے اتار لیا اور ڈپٹ کر کہا:

"بتاؤ تم کون ہو؟"

سوار جو بالکل اس کے سامنے کھڑا تھا، ایک کمزور، اور نحیف، بلکہ کسی حد تک بیمار نظر آ رہا تھا، اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے التجا کے لہجہ میں کہا:

"مجھے جانے دیجئے، میرے اوپر رحم کیجئے!"

ان الفاظ میں کچھ ایسا اثر تھا کہ احمد خاں نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور کہنے لگا۔

"تم جہاں جانا چاہو جا سکتے ہو — لیکن ذرا دیر کے بعد!"

پہلے جملہ پر سوار خوش ہو گیا تھا، دوسرے جملے نے اسے مایوس کر دیا، اس نے خوف اور بے کلی کے ساتھ کہا:

"کیوں؟ ذرا دیر کے بعد کیوں؟"

احمد خاں نے اس طرف تکتے ہوئے ایک سائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"میرا ساتھی آ رہا ہے، اس کے ایما پر میں نے تمہیں روکا ہے، اس سے اجازت لے لو اور چلے جاؤ!"

سوار نے اس سائے کی طرف ایک نظر ڈالی، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ حد درجہ خوف زدہ ہے، اس نے سہمگیں لہجہ میں کہا:

"لیکن آپ تو اجنبی — شاید مسلمان نظر آتے ہیں۔

"ہاں، — میں مسلمان ہوں، اور ایک مسلمان سے کسی بے گناہ شخص کو خائف ہونے کی ضرورت نہیں!"

"اور وہ جو آپ کا ساتھی آ رہا ہے، کیا وہ بھی مسلمان ہے؟"

"نہیں وہ مسلمان نہیں، تمہارا ہم قوم ہے، اور اس سے تو تمہیں ذرا بھی خائف نہ ہونا چاہیے!"

"لیکن کون ہے وہ؟"

"اس کا نام ہے ہمت رائے؟"

ہمت رائے کا نام سنتے ہی سوار بید لرزاں کی طرح کانپنے لگا۔ احمد خاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"واقعی کچھ دال میں کالا معلوم ہوتا ہے!"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہمت رائے بھی آ گیا۔ اس نے آتے ہی ڈپٹ کر سوال کیا:

"کون ہو تم؟"

لیکن سوار نے کوئی جواب نہیں دیا،

ہمت رائے گھوڑے سے اتر پڑا اور گویا ہوا:

"بولتے کیوں نہیں کیا گونگے ہو تم؟"

احمد خاں نے مسکراتے ہوئے کہا:

"ابھی تو یہ خوب باتیں کر رہے تھے — شاید آپ کی بارعب شخصیت کا اثر ہے کہ ان کی گھگھی بندھ گئی ہے!"

اب ہمت رائے بالکل سوار کے سامنے کھڑا تھا، اس نے ایک نظر سوار پر ڈالی اور بلند آواز میں دریافت کیا:

"کون — ؟

اور پھر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا،

"تم —

لیکن سوار کے لب اب بھی خاموش تھے، جیسے اس نے نہ بولنے کی قسم کھائی ہے یا جیسے اس نے نہ جواب دینے کا عہد کر لیا ہے۔ ہمت رائے نے زور سے اس کا بازو پکڑا اور کہا:

"چلو — تمہیں اس جرم کی سزا ملے گی!"

سوار کی کیفیت یہ تھی کہ وہ سارے بدن سے کانپ رہا تھا، احمد خاں اس کی یہ کیفیت دیکھ کر ہنس پڑا، اس نے کہا:

"یوں تو اسلحہ بھی زیب تن ہیں، سوار بھی اچھے معلوم ہوتے ہو لیکن بزدل کا یہ عالم ہے"

پھر اس نے ہمت رائے سے سوال کیا

"کون ہے یہ شخص ؟"

ہمت رائے نے اسی طرح اس کا شانہ پکڑے پکڑے جواب دیا۔

"بہت بڑا مجرم ہے یہ شخص !"

سوار نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا :

"نہیں میں مجرم نہیں ہوں، میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے، میں بے گناہ ہوں، مجھ پر رحم کرو، مجھے نہ ستاؤ، خدا سے ڈرو، مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش نہ کرو، ورنہ ــ

اور یہ کہہ کر سوار نے ایک زوردار جھٹکا دے کر اپنا بازو ہمت رائے کے پنجہ سے چھڑا لیا۔ اور پا پیادہ جنگل کی طرف بھاگا۔

ہمت رائے کو یہ خیال نہیں تھا کہ وہ سوار ایسا کر سکتا ہے، ورنہ اس کی گرفت ڈھیلی نہ ہوتی، سوار بھاگا اور اس کے تعاقب میں ہمت رائے اور اس کے ساتھ احمد خاں نے بھی اپنا دوڑ لگانا شروع کر دی، سوار بہت تیز بھاگ رہا تھا، تھوڑی دور بھاگنے کے بعد ہمت رائے کا دم پھول گیا لیکن احمد خاں پوری تیز رفتاری کے ساتھ تعاقب جاری رکھے ہوئے تھا، اب ہمت رائے احمد خاں سے کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ اس نے آواز لگائی :

"دوست، یہ بھاگنے نہ پائے، اگر تم نے اسے پکڑ لیا تو بڑا کام کیا !"

احمد خاں نے جواب دیا "اطمینان رکھو، یہ میرے پنجہ سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ تم تھک گئے ہو، بیٹھو، یہیں انتظار کرو، میں ابھی پکڑ کر لایا۔"

ہمت رائے میں اب دو قدم بھاگنے کا یارا بھی نہیں رہ گیا تھا، وہ سامنے کی ایک چٹان پر بیٹھ گیا، اور احمد خاں نے بدستور تعاقب جاری رکھا۔

کوئی ڈیڑھ فرلانگ تک دوڑنے کے بعد، احمد خاں بالکل اس کے قریب پہنچ گیا، اس نے کہا

"مت بھاگو، اب تم میری گرفت میں ہو"

سوار نے کوئی جواب نہیں دیا، سامنے ایک طویل و عریض تالاب تھا اس میں چھلانگ لگا دی، اور غوطے کھانے لگا۔

احمد خاں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، ہمت رائے کو آواز دے کر بتایا :

"یہ تو تالاب میں کود گیا ؟"

اور پھر خود بھی تالاب میں چھلانگ لگا دی۔

ہمت رائے نے یہ جو سنا کہ سوار نے تالاب میں چھلانگ لگا دی ہے، اپنی کھوئی ہوئی ہمت کو پھر مجتمع کیا اور دوڑتا ہوا ادھر بڑھا۔

احمد خاں تیرتا ہوا سوار کے پاس پہنچ گیا، لیکن وہ مسلسل غوطے کھا رہا تھا جس سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ یہ تیرنا نہیں جانتا اور ڈوب رہا ہے، بہرحال اس نے پورا زور لگایا، اور بالکل اس کے پاس پہنچ گیا۔ اتنے میں ہمت رائے بھی پہنچ گیا تھا اور تالاب کے کنارے کھڑا نعرے لگا رہا تھا۔

"میرے دوست جس طرح بھی ہو سکے اسے ڈوبنے نہ دو، بچا لو، میں زندگی بھر تمہارا ممنون رہوں گا ؛ ــ"

احمد خاں نے ڈوبتے ہوئے سوار کو بچا لیا، اور گھسیٹتا ہوا کنارہ تک لے آیا۔

سوار بے ہوش ہو چکا تھا، احمد خاں نے جلدی جلدی اس کا وہ لبادہ الگ کیا جس میں وہ لپٹا ہوا تھا، اور پھر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا :

"ارے یہ تو عورت ہے ــ"

---

(۴)

یہ ایک عجیب سانحہ تھا!

احمد خاں نالاب سے جس عورت کو نکال کر لایا تھا، وہ انتہائی خوبصورت تھی۔ ایسا حسن اس کی نظر سے کبھی نہیں گزرا تھا، یہ ایک عورت نہ تھی دست قدرت کی بنائی ہوئی تصویر تھی۔

ہمت رائے اس بیہوش عورت کے سامنے کھڑا خوفناک آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا بس چلے تو کچا چبا جائے۔

احمد خاں کے دل میں اس عورت کے لیے رحم، ترس، اور شفقت کے جذبات تھے۔ ہمت رائے اس کے خون کا پیاسا نظر آرہا تھا، احمد خاں نے ہمت رائے سے پوچھا:

"یہ کون عورت ہے؟"

ہمت رائے نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا:

"ایک آوارہ، بدمعاش، اور فریب کار عورت!"

احمد خاں کچھ اور سوال کرنے والا تھا کہ اس عورت میں جنبش پیدا ہوئی، اور وہ اٹھ بیٹھ گئی اور پھر وہ تن کر کھڑی ہو گئی، اس نے نفرت اور حقارت سے بھری ہوئی ایک نگاہ

پر ڈالی اور کہا:

"تو میرا پیچھا کیوں کر رہا ہے؟"

ہمت رائے نے جواب دیا "اس لیے کہ تو بھاگی جا رہی تھی!"

وہ بولی "اگر آج بھی میں نہ بھاگ سکی، تو بھگوان پر سے میرا اعتقاد اٹھ جائے گا، میں ناستک (لامذہب) ہو جاؤں گی۔ میں سمجھ لوں گی، یہ سب ایک ڈھونگ ہے!"

احمد خاں کو ان باتوں میں لطف آیا۔ اس نے کہا:

"آپ تو بھگوان سے بہت خفا معلوم ہوتی ہیں — کیا بگاڑا ہے آپ کا بھگوان نے؟"

وہ برہمی کے عالم میں — اور اس برہمی نے اس کے حسن کو اور زیادہ دوبالا کر دیا تھا، گویا ہوئی:

"اگر بھگوان اپنے بندوں کے کام نہیں آسکتا۔ اگر ظالموں کا ہاتھ نہیں مروڑ سکتا، اگر مظلوموں کی دستگیری نہیں کر سکتا، اگر عصمت مآب عورتوں کی لاج نہیں بچا سکتا، اگر بے گناہوں کو ظالموں کے پنجہ سے نہیں چھڑا سکتا، اگر دولت مندوں، امیروں، اور طاقت والوں کا ظلم سفاکی، شقاوت، اور ہوس پرستی برداشت کرتا ہے تو میں اسے نہیں مانتی — کیوں مانوں؟"

بات کچھ کچھ احمد خاں کی سمجھ میں آچلی تھی، لیکن پورے طور پر نہیں، اس نے کہا:

"ہمارا مذہب تو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ "تم خدا کے بارے میں جیسا اعتقاد رکھو گے ویسا ہی پاؤ گے"[1] یعنی اگر کوئی بندہ خدا کو جبار اور قہار سمجھتا ہے تو ویسا ہی پائے گا اور اگر رحمن و رحیم خیال کرتا ہے، تو وہ ضرور اس سے رحم و کرم کا سلوک کرے گا! اب تک آپ خدا کے بارے میں غلط اعتقاد رکھتی تھیں۔ اسی لیے اس نے آپ کا ساتھ نہیں دیا، اعتقاد صحیح کر لیں تو ضرور آپ کی مدد کرے گا!"

---

[1] یہ ایک حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔

ہمت رائے نے مداخلت کرتے ہوئے احمد خاں سے کہا:

"بڑا اچھا موقع آپ نے تبلیغ اسلام کا نکالا ہے ——— میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

پھر وہ اس عورت سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا،

"بکواس مت کرو، چپ چاپ میرے ساتھ چلی چلو!"

وہ ایک عزم کے ساتھ گویا ہوئی:

"نہیں جاؤں گی"

"چلنا پڑے گا تمہیں میرے ساتھ، ابھی اور اسی وقت!"

"ہرگز نہیں ——— تم صرف میری لاش لے جا سکتے ہو!"

"میں اس کے لیے تیار ہوں، اگر تم نے شرافت کے ساتھ تعمیل حکم نہ کی تو میں، اور یہیں قتل کر دوں گا!"

"(طنز کے ساتھ) معلوم ہے تم کتنے بہادر ہو، بھلا اس شخص کی بہادری میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، جو شریف لوگوں کے گھروں پر ڈاکے ڈلوا کر لڑکیوں کا اغوا کرتا ہو، ان کی لاج لوٹتا ہو، انھیں اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہو، ان پر ننگ انسانیت مظالم توڑتا ہو، ان کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرتا ہو، اور اگر ———"

"(نہایت برہمی کے ساتھ) خاموش!"

"(سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے) اور اگر وہ اپنی جان بچا کر، مگر لاج گنوا کر بھاگ ہوں تو ان کا تعاقب کرتا ہو۔ اور انھیں مار ڈالنے کی دھمکیاں دیتا ہو۔ بے شک تم بہت بڑے بہادر ہو، بلکہ بہادری میں یکتا ہو، لیکن میں نے بھی سر نہ جھکانے کا فیصلہ کر لیا ہے، تلوار نکالو ———"

"چپ حرامزادی، واقعی تیری شامت آگئی ہے!"

"تلوار نکالو، اور میری زندگی ختم کر دو، لاج گنوا چکنے کے بعد، بے آبرو ہو چکنے کے بعد، اپنی سب سے قیمتی پونجی لٹا چکنے کے بعد، اب میں زندہ رہ کر بھی کیا کروں گی؟"

"تجھے میرے ساتھ چلنا پڑے گا"

"یہ نہیں ہو سکتا، میں وہ زندگی نہیں اختیار کر سکتی جس کا تم مجھے عادی بنانا چاہتے ہو ——— تمہارے دیئے ہوئے سارے زیور، ساری اشرفیاں، سارے قیمتی کپڑے سب میں چھوڑ آئی ہوں، دیکھو میرے تن پر، ان معمولی سوتی کپڑوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

"میں کہتا ہوں بک بک نہ کر، چپ چاپ میرے ساتھ چلی چل ——— وعدہ کرتا ہوں، تیری اس خطا سے درگزر کروں گا!"

"مجھے تمہاری معافی نہیں چاہیے ——— میں تم سے نفرت کرتی ہوں، اتنی ہی جتنی فرشتہ شیطان سے کر سکتا ہے۔ میں معصوم تھی، تم نے مجھے پاپ کا راستہ دکھایا، میں بے گناہ تھی تم نے مجھے گنہگار بنایا، میں اپنے ماں باپ سے محبت کرتی تھی، تم نے مجھے اس قابل نہ رکھا کہ اب ان کی صورت دیکھ سکوں، شنکر میرا دیوانہ تھا، ہزار جان سے مجھ پر فریفتہ تھا، میں بھی اسے چاہتی تھی، محبت کرتی تھی اس سے، ہم دونوں جب کبھی مل کر بیٹھتے تھے تو کیسے کیسے منصوبے اور نقشے بنایا کرتے تھے آئندہ زندگی کے، تم نے میرے گھر پر ڈاکہ ڈالا، مجھے میرے ماں باپ سے چھڑایا، اور شنکر سے چھین لائے ——— آہ، تم نے مجھے کہیں کا نہ رکھا، میں اب بھی اس سے محبت کرتی ہوں، جان دیتی ہوں اس کے نام پر، لیکن وہ اب نفرت کرتا ہوگا مجھ سے۔ وہ میری صورت دیکھنے کا بھی روادار نہ ہوگا۔ وہ ایک ایسی لڑکی سے کس طرح عہد وفا نباہ سکتا ہے جو بے آبرو ہو چکی ہو، جو اپنی لاج گنوا چکی ہو ———"

یہ کہہ کر وہ عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، مگر ہمت رائے کا غصہ اب تک تام تھا اس نے زور سے زمین پر پاؤں مارا اور کہا:

"شنکر، شنکر ——— تو اب تک اس سے محبت کرتی ہے؟"

وہ بولی "ہاں کرتی ہوں اور زندگی بھر کرتی رہوں گی!"

"لیکن اب شنکر تجھے نہیں مل سکتا!"

"میں اسے پالوں گی، میں اسے ڈھونڈ لوں گی، میں اس کی داسی بن کر، اس کے چرنوں میں ساری زندگی گزار دوں گی۔ بھلے سے وہ میری صورت نہ دیکھے، مجھ سے بات نہ کرے، مجھ سے شادی نہ کرے"

"تو احمق ہے!"

"احمق سہی، لیکن عقل مند بن کر تمہارے دام میں گرفتار نہیں ہو سکتی!"

"تو جا کہاں سکتی ہے؟"

"جہاں سینگ سمائیں گے چلی جاؤں گی، لیکن تمہارے پاس نہ رہوں گی!"

"اب دنیا میں تیرا ہے کون؟"

"پرماتما، بھگوان!"

"شنکر کا نام کیوں نہیں لیتی؟"

"ہاں شنکر بھی!"

"لیکن وہ تو اس دنیا سے رخصت ہو چکا!"

"تو جھوٹ بولتا ہے، وہ زندہ ہے، زندہ رہے گا۔ وہ کبھی نہیں مر سکتا۔ تیرے سر پر موت بے تنگ ناچ رہی ہے!"

"رانی، میں جھوٹ نہیں کہتا، شنکر واقعی اسی دن ہلاک ہو گیا جس دن ہم تجھے بیاہ لائے تھے۔ تیرے باپ اور بھائی بزدل تھے، وہ ہماری تلواروں کے سامنے دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ شنکر واقعی بہادر جوان تھا، وہ آخر وقت تک تن تنہا لڑتا رہا، اس نے بے تنگ پیٹھ نہیں دکھائی اور لڑتے لڑتے مارا گیا ـــــ ایسے بہادر کی جان لیتے ہوئے مجھے افسوس ہوا، لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا!"

یہ سن کر رانی پھر رونے لگی، اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا:

"پاپی، تجھے اس کی جان لیتے ہوئے شرم نہ آئی؟ ـــــ کیا بگاڑا تھا اس نے تیرا؟"

ہمت رائے نے زہر خند کرتے ہوئے جواب دیا:

"ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، شنکر بھی تیرا طلبگار تھا، میں بھی، یا وہ زندہ رہتا یا میں ـــــ"

"تو پھر تو کیوں نہیں مر گیا؟ تو کیوں زندہ ہے؟"

"ہمارے درمیان تلوار نے فیصلہ کر دیا!"

"تو پھر اس تلوار سے میرا خاتمہ بھی کیوں نہیں کر دیتا؟"

"وہ دل کہاں سے لاؤں؟ جو تیرا خاتمہ کر دے ـــــ رانی تو اب تک نہیں سمجھ سکی اب تک یقین نہیں کر سکی کہ میں بھی تجھ سے محبت کرتا ہوں!"

"ہاں تم سے بڑھ کر میرا چاہنے والا کون ہو گا؟ تم نے میرا گھر اجاڑ دیا، تم نے میری زندگی برباد کر دی، تم نے میرا جیون تباہ کر دیا ـــــ اور تم مجھ سے محبت کرتے ہو!"

"تو یہ نہیں سوچتی کہ شنکر تجھے کیا دے سکتا تھا؟ ـــــ وہ ایک غریب نوجوان تھا خود بھی فاقے کرتا تجھے بھی فاقے کراتا، اور میرے یہاں تو راج کرے گی!"

"مجھے یہ راج نہیں چاہیے!"

"لیکن جب شنکر مر چکا تو اب تو کس کے پاس جائے گی؟ اب تجھے کون پناہ دے گا؟ اب کیوں نہیں تو میری ہو جاتی؟"

"یہ اسی طرح ناممکن ہے جس طرح سفید کا سیاہ ہونا!"

ہمت رائے کو پھر غصہ آ گیا اس نے کہا:

"میں نے تیری غلطی معاف کر دی تھی، لیکن تو چاہتی ہے کہ تیرے ساتھ سخت برتاؤ کیا جائے!"

رانی نے روتے ہوئے کہا "جو کچھ تو کر چکا ہے اس کے بعد اب کوئی شخص ایسا نہیں

جس سے میں ڈر سکوں!"

ہمت رائے آگے بڑھا، اس نے رانی کی کلائی اپنی مٹھی کی گرفت میں لیتے ہوئے کہا:

"اب زیادہ باتیں سننے کی مجھ میں تاب نہیں ہے، مجھے میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

رانی نے اپنا دست نازک اس کے دست زبردست سے چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا:

"نہیں جاؤں گی، ہرگز نہیں جاؤں گی!"

ہمت رائے نے اسی طرح اس کی کلائی پکڑے پکڑے کہا:

"چلنا پڑے گا تجھے — تیری، یہ مجال کہ میرے حکم سے سرتابی کر سکے؟"

احمد خاں اب تک خاموش باتیں سن رہا تھا، اور یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اب وہ دو قدم بڑھ کر آگے آگیا۔ اور بالکل ان دونوں کے پاس کھڑا ہو گیا، اس نے ہمت رائے سے کہا:

"کیوں ایک کمزور عورت پر ظلم کرتے ہو؟"

ہمت رائے نے تیوری چڑھا کر احمد خاں کی طرف دیکھا، اور کہا:

"تم ہمارے معاملہ میں دخل دینے والے کون؟"

احمد خاں نے جواب دیا "میں یہ ظلم نہیں دیکھ سکتا!"

ہمت رائے نے پوچھا "پھر کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

احمد خاں نے کہا "میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اسے چھوڑ دو۔"

ہمت رائے: "یعنی اسے چلا جانے دوں؟"

احمد خاں: ہاں میری یہی خواہش ہے۔

ہمت رائے: لیکن تمہیں کیا حق ہے کہ اپنی خواہش مجھ پر مسلط کرنے کی کوشش کرو؟

احمد خاں: انسانیت کے حق سے میں یہ التجا کر رہا ہوں، اور تمہاری شرافت سے توقع رکھتا ہوں کہ اسے مان لوگے۔

ہمت رائے: یہ نہیں ہو سکتا، تمہیں اس طرح کی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، تم ایک اجنبی ہو، غیر ہو، ہمارا تمہارا مذہب جدا ہے، سماج جدا ہے، ریت اور رسم جدا ہے اپنے حدود سے باہر قدم نکالنے کی کوشش نہ کرو!"

احمد خاں: (نہایت نرم اور شائستہ لہجہ میں) میرے دوست تم نے سچ کہا، واقعی میں ایک اجنبی ہوں، غیر ہوں، میرا اور تمہارا مذہب جدا ہے، ہمارے سماج میں اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود پورے اصرار کے ساتھ میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ریت رسم، سماج، معاشرت، ہر چیز سے بالا، ایک اور چیز ہے، اور وہ ہے انسانیت، ایک انسان کا فرض ہے کہ وہ ظالم کا ساتھ نہ دے اور مظلوم کی مدد کرے۔ رانی کی باتیں سننے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تم ظالم ہو، اور یہ مظلوم ہے۔ لہٰذا میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا، اور اس کی مدد کرنے پر مجبور ہوں۔"

ہمت رائے: میں نہیں چاہتا کہ تم میرا ساتھ دو، اور تم اس عورت کی مدد کیا کر سکتے ہو؟

احمد خاں: جو کچھ بھی ہو سکے گا کروں گا — لیکن ایک مرتبہ پھر استدعا کرتا ہوں، کہ اسے چھوڑ دو، اسے جانے دو، یہ جہاں جانا چاہے اسے چلا جانے دو۔

ہمت رائے: شکریہ اس صائب مشورے کا، لیکن افسوس میں تعمیل ارشاد نہ کر سکوں گا!"

دفعتہً احمد خاں کا رنگ بدل گیا۔ اس نے بادل کی طرح گرج کر کہا۔

"چھوڑ دو اسے! — میں کہتا ہوں چھوڑ دو اسے!"

ان الفاظ میں کچھ ایسا جلال تھا کہ ہمت رائے کے ہاتھ سے رانی کی کلائی چھوٹ گئی اور وہ ہکا بکا ہو کر اسے دیکھنے لگا، احمد خاں نے رانی سے کہا:

"یہ آپ کا گھوڑا موجود ہے، آپ جہاں جانا چاہیں چلی جائیں!"

رانی نے ممنون نظروں سے احمد خاں کو دیکھا، اور پھر سہمگین لہجہ میں بولی:

"لیکن یہ پاپی، ابھی شہر سے سپاہیوں کی فوج لے کر دوڑ پڑے گا اور مجھے گرفتار کر لے گا!"

احمد خاں نے نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ کہا :

" ایسا نہیں ہوگا !"

ہمت رائے بول اٹھا " ضرور ہوگا !"

احمد خاں نے بڑے میٹھے اور نرم لہجہ میں کہا۔

" لیکن میرے دوست میں آپ کو کب اس کا موقع دوں گا کہ شہر میں جاکر سپاہیوں کو لائیں۔ اور اس مظلوم عورت کو گرفتار کرلیں ــــ

ہمت رائے نے زخمی سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے کہا

" تم مجھے کس طرح روک لوگے ؟"

احمد خاں نے جواب دیا۔

" ساری رات اس تالاب کے کنارے، میری نگرانی میں تمہیں بسر کرنا پڑے گی۔ اگر جنبش بھی کی تو میرا خنجر تمہارے سینہ کے پار ہوگا۔ تمہاری لاش کو اسی تالاب میں ڈال دوں گا اور صبح ہوتے ہی رانا سانگا کے پاس پہنچ کر اسے بتاؤں گا کہ میں نے کیا کیا ہے اور کیوں کیا ہے ؟ رانا سانگا بہادر آدمی ہے وہ یقیناً میرے اس کارنامہ کی داد دے گا لیکن اگر چپ چاپ یہ رات تم نے اس تالاب کے سامنے گزار دی تو وعدہ کرتا ہوں کہ رانا سے تمہاری شکایت نہیں کروں گا !"

پھر اس نے رانی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا :

" اب تو آپ مطمئن ہوگئیں ؟ آپ کو ساری رات ملتی ہے، اس عرصہ میں جہاں چاہے چلی جائیے، دن نکلنے کے بعد، یہ شخص آپ کی گرد بھی نہیں پاسکے گا !"

رانی نے ممنون نظروں سے احمد کو دیکھا اور زبان سے کچھ کہے بغیر اپنے بیڑے پر بیٹھی، ایڑ لگائی اور چند ہی لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہوگئی !

رانی کے جانے کے بعد، احمد خاں نے ہمت رائے کا ہاتھ پکڑا، اور تالاب کے

کنارے پر بٹھاتے ہوئے کہا :

" آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا !"

ہمت رائے جانتا تھا کہ وہ احمد خاں سے لڑکر فتحیاب نہیں ہوسکتا۔ اسے اپنی کمزوری اور بے بسی کا احساس تھا۔ اس نے بیٹھتے ہوئے کہا :

" خاں صاحب، یہ آپنے اچھا نہیں کیا !"

احمد خاں نے ایک قہقہہ لگایا اور گویا ہوا۔

" میرا خیال ہے اس مختصر سی زندگی میں اس سے اچھا کام میں نے کوئی نہیں کیا !"

---

(۵)

رانی کے تعاقب میں

ہمت رائے احمد خاں سے لڑ کر نہیں جیت سکتا تھا۔ اس نے ایک کھلاڑی کی طرح اپنی شکست تسلیم کر لی۔ رانی اس کے سامنے گھوڑے پر بیٹھ کر ایک نامعلوم منزل کی طرف چلی گئی، جب تک ٹاپوں کی آواز آتی رہی، جب تک اس کا سایہ نظر آتا رہا وہ خاموشی کے ساتھ اس کی طرف تکتا رہا۔ پھر وہ احمد خاں سے مخاطب ہوا ایسے اس طرح جیسے اس کے دل میں کوئی تلخی اور خفگی نہیں ہے۔ اس نے کہا:

"رانی چلی گئی" ——

احمد خاں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا

"ہاں وہ چلی گئی، اور یہی بہتر تھا، میرے دوست محبت زبردستی نہیں کی جاتی اگر وہ تم سے محبت نہیں کرتی تو تم کیوں اسے مجبور کر رہے ہو کہ تمہیں چاہے، تم خود ایک جوان رعنا ہو، حسن مردانہ کی مکمل تصویر، تم خود اس قابل ہو کر چاہے جاؤ، پریشان رانی گئی تو چلا جانے دو۔ ایسی ایسی نہ جانے کتنی رانیاں ہاتھ باندھ کر تمہارے سامنے کھڑی ہوں گی اور اپنا دل نذر کر کے تم سے محبت کی بھیک مانگیں گی!"

ہمت رائے نے گویا اسے اپنا رازدار بناتے ہوئے کہا:

"تم نہیں جانتے میرا اس کا کیا معاملہ تھا!"

احمد خاں نے بے پروائی کے ساتھ کہا۔

"ہاں نہیں جانتا، اور جاننے کی کچھ ایسی زیادہ خواہش بھی نہیں ہے، کیونکہ جو کچھ معلوم ہے وہ بھی ناکافی نہیں ہے"

"(چونک کر) کیا معلوم ہے؟"

صرف اتنا کہ تم نے اسے زبردستی حاصل کیا، اپنی قید میں رکھا، موقعہ پا کر وہ بھاگ نکلی، تم نے اسے پکڑ لیا مگر وہ پھر بھی ہاتھ نہ آئی!"

"صرف اتنا ہی نہیں —— رانی کے ساتھ۔ میرے معاملات کچھ ایسے ہیں کہ میں اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔ تم نے اس وقت اسے جانے دیا، میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی اس لیے کہ وہ کہیں بھی جائے، گرفتار ہو کر کل ہی آجائے گی میرے حضور میں!"

"ہو سکتا ہے —— لیکن اس سے فائدہ کیا ہوگا؟"

"رانی مجھے مل جائے گی!"

"لیکن وہ تم سے محبت نہیں کرتی!"

"مگر میں کرتا ہوں"

"کیا محبوب کو ستانا، اسے زبردستی گھر سے نکال لانا، اس کے منگیتر کو مار ڈالنا، اس کے خاندان کو رسوا کرنا، آئین محبت ہے؟"

"محبت کا کوئی آئین نہیں ہے، محبت خود اپنا آئین ہے۔ تمہیں معلوم نہیں عشق اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے!"

"ہوگا لیکن ہم نہیں جانتے، اس لیے کہ اب تک کسی کے دام محبت میں اسیر نہیں ہوئے، اور جنگ جب بھی کی، کسی کو دھوکا نہیں دیا!"

"کیا واقعی تم نے کسی سے محبت نہیں کی؟"

"اب تک نہیں"

"ارادہ بھی ہے یا نہیں؟"

"(ہنستے ہوئے) جی تو چاہتا ہے محبت کرنے کا لیکن اب تک کوئی ایسا ملا نہیں جس نے میرے ناقابلِ تسخیر دل کو فتح کر لیا ہو!"

"تو کیا ساری زندگی اسی طرح گزار دو گے؟"

"سچ پوچھو تو ایک سپاہی کی زندگی گزرنی بھی اسی طرح چاہیئے!"

"یعنی خشک؟ — جس میں کوئی رعنائی نہ ہو؟ کسی قسم کی دلکشی نہ ہو؟"

"ہاں اور کیا؟ — سپاہی کی زندگی میدانِ جنگ میں بسر ہوتی ہے، وہ گھوڑے کی پیٹھ پر مرتا ہے، اسے عشق کرنے، محبت کرنے، کسی کی محبت قبول کرنے کی فرصت کہاں؟ — میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟"

"(ہنستے ہوئے) کیا تم مجھے سپاہی نہیں سمجھتے؟ کیا سپاہی صرف تم ہی ہو؟ — سپاہی کی زندگی عام آدمیوں کے مقابلہ میں زیادہ عارضی، زیادہ غیر یقینی، زیادہ مختصر ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے حق ہے کہ اس عمرِ کوتاہ کو، راگ رنگ، عیش و نغمۂ بزمِ طرب اور عشرتِ امروز میں صرف کر دے، — عاقبت کی خبر خدا جانے!"

"ہاں ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے اور میں جانتا ہوں کہ بہت سے لوگ اسی مسلک پر عمل کرتے ہیں!"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ کبھی موقعہ ہی نہیں ملا حسن سے کھیلنے کا!"

"یہ بات بھی ہے"

"تمہارے اعزاز میں ہم ایک دعوت، شبینہ کا کل ہی انتظام کریں گے، اور بزمِ طرب میں تمہیں ایسی ایسی صورتیں نظر آئیں گی کہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے، رادھا کو دیکھ کر اگر غش نہ کر جاؤ تو ہمارا ذمہ، کامنی کا نغمہ سن کر وجد نہ کرنے لگو تو جو کہو

شوبھا کا روپ دیکھ کر اگر دنیا و مافیہا سے بے خبر نہ ہو جاؤ، جب کہنا!"

"لیکن ان سب کے ہوتے ہوئے بھی رانی کی ضرورت محسوس کرتے ہو؟"

"کیوں نہیں؟ — ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است! جو بات رادھا میں ہے وہ کامنی میں نہیں جو کامنی میں ہے، وہ شوبھا میں نہیں، جو رانی میں ہے، وہ نہ رادھا میں ہے، نہ کامنی میں نہ شوبھا میں!"

"اور کل اگر کوئی عورت رانی سے بھی زیادہ خوبصورت اور طرحدار نظر آجائے تو؟"

"تو وہ سب پر بازی لے جائے گی!"

"اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمہیں محبت کسی سے نہیں، رانی سے بھی نہیں۔ صرف ہوس ہے جو ان سب کے دامن سے تمہیں وابستہ کیے ہوئے ہے؟"

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے یہ کوئی بہت بڑا الزام ہے، اور میں گھبرا کر انکار کر دوں گا"

"تمہاری اس صاف گوئی کی میں داد دیتا ہوں!"

بخت رائے ہنسنے لگا!

اسی طرح باتیں کرتے کرتے رات کے ۲ بج گئے!

۲ بجے کے قریب، دفعتہً دس بارہ سواروں کا ایک دستہ سرپٹ گھوڑے دوڑاتا ہوا ادھر سے گزرا جہاں یہ دونوں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ "اتنی رات گئے" دو آدمیوں کو تالاب کی جگت پر بیٹھا دیکھ کر ان سواروں کو شک ہوا اور انھوں نے آکر ان دونوں کو گھیر لیا پھر ان میں سے ایک سوار قریب آیا، اور اس نے تلوار میان سے نکال کر ہوا میں لہراتے ہوئے سوال کیا۔

"تم لوگ کون ہو؟ اور اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ایک دوسرے سوار نے سوال کیا:

"کہاں سے آئے ہو؟ اور کہاں جانا چاہتے ہو؟"

احمد خاں نے ہمت رائے کا نام لے کر اسے مخاطب کیا اور کہا :

" آپ ہی جواب دیں، میں تو ایک ضمیمہ کی طرح آپ کے ساتھ ہوں، یا زیادہ سے زیادہ ناخواندہ مہمان کہہ لیجئے "

ہمت رائے کا نام سن کر وہ سوار چونک پڑے، اتنے میں ہمت رائے اندر کو ہو چکا تھا، اس نے وقار اور سنجیدگی کے ساتھ کہا :

" گنیش ــــ تم ؟ "

گنیش گھوڑے سے اتر پڑا۔ اس نے ادب سے اس کے پاؤں چومے، اسی طرح دوسرے سواروں نے بھی کیا۔ گنیش نے سوال کیا۔

" آپ کب آئے ؟ اور یہاں بیٹھے کیا کر رہے تھے ؟ مہاراجہ تو بڑی بے تابی سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں ! "

ہمت رائے نے احمد خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا :

" یہ دولت خاں کے ایلچی احمد خاں ہیں۔ ہم لوگ آگرہ سے آ رہے ہیں، چاندنی کا منظر بہت پسند آیا، تھک بھی گئے تھے، ذرا دیر کے لیے بیٹھ گئے، اب شہر میں داخل ہونے والے تھے، لیکن تم اس وقت کون سی مہم سر کرنے جا رہے ہو ؟ "

گنیش نے مسکراتے ہوئے کہا " آپ ہی کے کام سے "

دولت رائے نے حیرت اور استعجاب کے جذبات کے ساتھ سوال کیا :

" میرا کونسا کام ہو سکتا ہے ؟ "

گنیش نے جواب دیا " میں آپ کو ایک دلچسپ لیکن افسوسناک خبر سنانا چاہتا ہوں۔ "

ہمت رائے نے کچھ پوچھا نہیں، سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا، اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :

" رانی پھر بھاگ گئی، یہ دوسرا موقع ہے کہ اس نے راہ فرار اختیار کی ہے۔ جانے کیسے

کمبخت، اتنے سخت چوکی پہرے کے باوجود، نہ جانے کس طرح بھاگنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ آپ کے منتظم امور مراری لال نے کوتوالی میں آکر مجھے سوتے سے جگایا، اور واقعہ کی اطلاع دی۔ ہم تو مہاراجہ کے بعد بس آپ ہی کو مانتے ہیں، ہم کیا سارا میواڑ مانتا ہے۔ مہاراجہ بے خبر و حشت، خبر سنتے ہی نکل کھڑے ہوئے اس کے تعاقب میں۔ اطمینان رکھیئے وہ کہیں بھی جائے مگر ہماری دسترس سے بچ کر کہاں جا سکتی ہے اور ابھی کچھ ایسی زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی ہے، صرف چند گھنٹے ہوئے ہیں اسے بھاگے ہوئے۔ آپ بے فکر ہو کر جائیے اور گھوڑے بیچ کر سو رہیے، صبح رانی آپکے قدموں میں ہوگی ! "

گنیش کے یہ الفاظ سن کر ہمت رائے کو ڈھارس بندھی اور اسے یقین ہو گیا کہ ضرور رانی واپس مل جائے گی۔ احمد خاں کی مداخلت بے جا سے اسے جو صدمہ پہنچا تھا وہ کلفت دور ہو گیا۔ اور احمد خاں کا حال یہ تھا کہ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کا اگر بس چلتا تو ان لوگوں کو رانی کے تعاقب میں نہ جانے دیتا، لیکن اب صورت حال برعکس ہو چکی تھی۔ پہلے ہمت رائے اس کے مقابلہ میں بے بس تھا اور اب وہ ہمت رائے کے مقابلہ میں بے بس تھا !

ہمت رائے نے گنیش سے مسرت بھرے لہجہ میں کہا :

" میں تمہاری اس مستعدی کا شکر گزار ہوں، جاؤ، اور وہ جہاں ملے، اسے لے کر آؤ اور یقین کرو، تمہاری یہ محنت رائگاں نہ جائے گی، اس کا حسب دل خواہ معاوضہ دیا جائے گا ! "

گنیش نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا اور اپنے ساتھیوں سمیت رانی کے تعاقب کو روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد زہر خند کرتے ہوئے ہمت رائے نے احمد خاں سے کہا :

" اگر تمہاری مرضی ہو تو اب بھی باقی رات یہاں گزارنے کو تیار ہوں، لیکن کیا فائدہ، گنیش اپنے کام پر گیا، اب ہمیں بھی چل کر آرام کرنا چاہیے "

احمد خاں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ہو گیا۔

(۶)

سازش

آگرہ سے میواڑ تک کی مسافت طے کرنے میں حالات بدل چکے تھے، اور ملکی سیاست نے ایک نیا پلٹا کھایا تھا،

رانا سانگا کو اب دولت خاں کے اشتراک و تعاون کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔

ابراہیم لودھی اور رانا سانگا کے تعلقات میں بظاہر اور زیادہ استواری پیدا ہو گئی تھی، جیسے ان دونوں میں کسی طرح کی تلخی اور بدمزگی تھی ہی نہیں، اور درحقیقت واقعہ یہ تھا کہ من چلے بابر کی داستان رانا سانگا تک بھی پہنچ چکی تھی، اور اب وہ دولت خاں کے بجائے اسے اپنا آلۂ کار بنانا چاہتا تھا، اس کے مشیروں نے اسے صلاح دی تھی، کہ ابراہیم لودھی ہو، یا دولت خاں، دونوں ہندوستان کو اپنا وطن بنا چکے ہیں۔ وہ نہ تو کسی کا بھی ساتھ دینے، یا ایک کے مقابلے میں دوسرے کو آگے بڑھانے کے معنی یہ ہیں کہ مسلم حکومت بہرحال ہندوستان میں موجود رہے گی، ابراہیم کی جگہ دولت خاں آجائے، یا دولت خاں کے بجائے ابراہیم ہی برسر اقتدار و حکومت رہے بات ایک ہی ہے کوئی خاص فرق صورت احوال میں نہیں پڑتا۔ مسلمانوں کا زور قائم رہے گا۔ ان کی حکومت قائم رہے گی، ان کے دبدبے اور شوکت و سطوت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اس کے برعکس بابر ایک بیرونی

آدمی ہے، وہ اگر آئے گا تو ابراہیم کا خاتمہ کر دے گا۔ مال غنیمت جتنا زیادہ بھی چاہے لے کر واپس چلا جائے گا، وہ ہندوستان کو اپنا وطن نہیں بنا سکتا۔ وہ اپنے آبائی وطن کی اقامت ترک کر کے یہاں کا باشندہ نہیں بن سکتا۔ وہ کابل کی حکومت سے دستبردار ہو کر ہندوستان کا حاکم بننا پسند نہیں کرے گا، لہٰذا اسے دعوت دینی چاہیے، اس کی تائید و اعانت کرنی چاہیے۔ اسے موقع دینا چاہیے کہ آئے، لوٹے اور سیم و زر اور جواہرات سے جیب و دامن بھر کر واپس چلا جائے۔

بات رانا سانگا کی سمجھ میں آگئی، اس نے ہمت رائے کی سفارت کا انتظار بھی نہیں کیا۔ اور بیش بہا تحائف کے ساتھ موتی چند کو اپنا سفیر بنا کر بابر کے پاس بھیج دیا۔[1] اسے یقین کامل تھا کہ بابر کے واپس جانے کے بعد مسلمان حکومت قائم نہیں رہ سکے گی اور وہ بلا شرکت غیرے ہندوستان کا فرماں روائے مطلق بن جائے گا۔

اپنے پہنچنے کے دوسرے دن ہمت رائے رانا سانگا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہمت رائے کا صرف میئر ہی نہیں تھا، بہت بڑا جاگیردار بھی تھا، اور اپنا ایک مخصوص حلقہ بھی رکھتا تھا اور یہ حلقہ خاصا طاقتور بھی تھا۔ رانا کسی مرحلہ پر بھی اس کی تائید اور اعانت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اسے دیکھ کر وہ خوش ہوا، اور تپاک و گرم جوشی کے ساتھ ملایا پھر سوال کیا:

"کہو کیا کر آئے؟ — کیا دولت خاں ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہے؟"

---

[1] انگریزی اور فارسی کے تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ رانا سانگا نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ لوٹ مار کر کے واپس چلا جائے گا۔ ہندوستان میں مستقل اقامت نہیں اختیار کرے گا، اور اس کے جانے کے بعد رانا سانگا سارے ہندوستان کا بڑی آسانی سے فرماں روا بن جائے گا۔

ہمت رائے نے ساری تفصیل سنائی اور کہا :

"دولت خاں نے اپنے ایک معتمد احمد خاں کو سفیر بناکر میرے ساتھ بھیجا ہے اور وہ شرف باریابی حاصل کرنے کے لیے باہر موجود ہے !"

راناسانگا نے اپنائیت کے انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے ، اسے اپنے ارادے سے باخبر کیا۔ پھر پوچھا :

"اب بتاؤ، تمہاری رائے کیا ہے ؟ جیسا کہو ویسا کیا جائے ، اس لیے کہ ہماری بارگاہ میں جو تقرب تمہیں حاصل ہے وہ کسی کو نہ حاصل ہے نہ ہو سکتا ہے !"

ہمت رائے میں یہ ہمت نہ تھی کہ راناکی کسی رائے سے اختلاف کرسکے ، اور اس وقت رانانے جو فیصلہ کیا تھا وہ تھا بھی بے حد معقول۔ اگر بابر ہاتھ آجائے اور وہ ہندوستان کی کمزور مسلمان حکومت کا خاتمہ کردے تو میدان بالکل صاف ہے۔

"راجاؤں کو بھگوان کی طرح جو مخلوق مانتی ہے وہ اسی لیے کہ ان کی مدد ... سے آتی ہے۔ آپ نے یہ ایسی بات سوچی ہے جو بیٹ پڑھی نہیں سکتی !"

رانا خوش ہوگیا۔ اس نے کہا "بابر اس دیس کے لیے اجنبی ہے ، اسے مال و زر سے غرض ہے ، وہ لوٹ میں بھی ملے گا اور ہم بھی دیں گے ، اور جی بھر کے دیں گے۔ تو بہت زیادہ دیں گے ، سونے چاندی سے لدا پھندا وہ واپس چلا جائے گا ، اور راج پاٹ ہمارے ہاتھ میں آجائے گا !"

ہمت رائے نے جواب دیا "بے شک ایسا ہی ہوگا — اور اگر بفرض محال وہ واپس نہ گیا تو بھی ہمارا وہ کیا بگاڑ لے گا ؟"

یہ سن کر رانا چونک پڑا۔ اس نے قدرے اضطراب کے ساتھ سوال کیا :

"بابر واپس نہ گیا ؟ یہ تم نے کیا کہا ؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یہیں رہ پڑے"

ہمت رائے نے بہت زیادہ مطمئن ہوکر جواب دیا۔

"وہ ضرور واپس جائے گا ، نہیں جانا چاہے گا ، تو ہم اسے دھکیل کر وہاں واپس کردیں گے جہاں سے وہ آیا ہے !"

"لیکن اسے دھکیلنے کی ضرورت پڑے گی ؟ — اب تو مجھے ایک نیا خطرہ منڈلاتا ہوا نظر آرہا ہے ، ایسا نہ ہو ایک بلا سے چھوٹ کر ہم دوسری مصیبت میں گرفتار ہو جائیں !"

"ہنستے ہوئے) نہیں مہاراج ایسا نہیں ہو سکتا۔ بابر کو واپس جانا ہی پڑے گا ، وہ اس نئے ملک میں رہ کر کیا کرے گا ؟ ابراہیم تو اس لیے نہیں جاتا کہ وہ کئی نسلوں سے یہاں رہ رہا ہے ، اور اب یہ دیس اس کا وطن ہو چکا ہے لیکن بابر کو اس نئی ، اور اجنبی سرزمین سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے ؟ — اطمینان رکھیے وہ کابل ضرور واپس جائے گا وہ یہاں صرف دولت لوٹنے آئے گا اور دولت لوٹ کر واپس چلا جائے گا !"

رانا ان باتوں سے بڑی حد تک مطمئن ہوگیا۔ پھر اس نے سوال کیا :

"اب احمد خاں کے بارے میں کیا کہتے ہو ؟ — ہم تو اس سے ملنے کی ، اور گفتگو کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں محسوس کرتے جب اس سے یا اس کے آقا سے تمہیں کوئی کام ہی نہیں لینا ہے تو خواہ مخواہ کی ملاقات اور گفتگو سے کیا حاصل ؟"

ہمت رائے نے جواب دیا "بجا ارشاد ہوا۔ احمد خاں سے ملنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے !"

رانا نے پوچھا "پھر کیا کیا جائے ؟ — بہتر ہوگا کہ اسے واپس کردو !"

ہمت رائے کی آنکھیں چمکنے لگیں !

احمد خاں نے جو گھاؤ اس کے دل پر لگایا تھا وہ تازہ ہوگیا۔ زور شور سے انتقام کی لہریں دل میں اٹھنے لگیں۔ اگر دولت خاں سے کام لینا ہوتا ، تو احمد خاں کی نازبرداری کی ضرورت تھی ، اس کا اعزاز و احترام اسی طرح واجب تھا جس طرح سفرا کا کیا جاتا ہے

لیکن اب دولت خاں سے کوئی کام نہیں لینا تھا۔ اب احمد خاں کی کوئی ضرورت نہیں
اب وہ کسی اعزاز و احترام کا سزاوار نہیں تھا، اب وہ ایک سفیر نہیں تھا، بلکہ
پردیسی تھا، پہلے دل میں کدورت رکھنے کے باوجود اس سے انتقام نہیں لیا جا سکتا
اسے ہدف ستم نہیں بنایا جا سکتا تھا لیکن اب جی بھر کے اس سے جلا لیا جا سکتا
تھا، اس نے کہا:

"مہاراج میری رائے تو یہ نہیں ہے کہ اسے واپس بھیجا جائے"

رانا نے سوال کیا "لیکن کیوں نہ واپس بھیجا جائے؟"

ہمت رائے نے بتایا "اس لیے کہ اگر یہ واپس گیا، تو ایک فتنہ بن کر واپس
جائے گا۔ گو ہم اسے اپنا کوئی راز نہ بتائیں، لیکن یہ ایک ہی کائیاں ہے سب کچھ
سمجھ جائے گا، ممکن ہے یہ واپس جا کر ابراہیم کو بھی ہم سے برگشتہ کر دے۔ اور جب
موتی چند بابر کے پاس سے واپس نہ آ جائے، اس وقت تک ہمیں ابراہیم کو ہرگز
سے نہیں جانے دینا چاہیے!"

رانا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "بڑی صائب رائے ہے — مگر پھر؟"

بے پروائی کے ساتھ ہمت رائے نے جواب دیا "پھر کیا؟ مناسب آپ
کہ اسے قتل کر دیجیے، لیکن فوراً قتل کرنا اگر مناسب نہ ہو تو موتی چند کے واپس آنے
نظر بند رکھیے۔ اس کے واپس آنے کے بعد اگر یہ معلوم ہو کہ کام بن گیا۔ اب بھی
دولت خاں کی ضرورت ہے، نہ ابراہیم کی، بابر آئے گا، اور ہماری مشکلیں حل کر
تو پھر بے تامل گردن اڑا دیں اس سفیر کبیر کی!"

سفیر کبیر کے لفظ پر وہ خود بھی مسکرانے لگا، اور رانا کو بھی ہنسی آ گئی۔

"ٹھیک کہتے ہو۔ جب تک بابر کا جواب نہیں مل جاتا اسے ایک معزز مہمان
طرح اپنے پاس قید رکھو، اگر جواب حسب توقع نہ آیا تو پھر اس سے ملاقات بھی

اور راہ راست پر بھی لے آئیں گے، اور اگر حسب توقع آیا تو پھر اس کی گردن اڑا دیجیے"

ہمت رائے یہ سن کر کہ یہ دشمن کسی اور شخص کے پاس نہیں خود اس کے پاس قید
رہے گا، بہت خوش ہوا، اس نے کہا:

"میں اس خدمت کو بہ سر و چشم بجا لاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ جواب حسب توقع
آئے گا، اور اپنے معزز مہمان کی گردن مجھے اپنے ہاتھ سے تراشنا پڑے گی!"

رانا سانگا نے ہنستے ہوئے کہا:

"تمہاری رائے سے ہمیں پورے طور پر اتفاق ہے، لیکن اتنی احتیاط رکھو کہ جب تک
وقت نہ آ جائے اس وقت تک ہمارے عزائم کا اسے پتہ نہ چلے!"

ہمت رائے نے دست بستہ عرض کیا "مطمئن رہیے ایسا ہی ہوگا۔ اور اگر پتہ چل بھی
گیا تو وہ ہمارا کیا کر سکتا ہے؟ — میں تو کہتا ہوں دولت خاں بھی کچھ نہیں کر سکتا، وہ
کس منہ سے اقرار کرے گا کہ اس نے احمد خاں کو ایلچی بنا کر ہمارے پاس بھیجا تھا؟"

دونوں ہنسنے لگے۔

---

(۷)

رُت بدل گئی

ہمّت رائے احمد خاں کو اپنے ساتھ لے کر رانا کے محل پہنچا تھا۔ اب تک اس
اس کے ساتھ بہت شریفانہ برتاؤ روا رکھا تھا، کیونکہ وہ رانا کا مہمان تھا، رانی کے
سلسلے میں اس نے جو مداخلت کی تھی اس سے وہ بے حد برہم تھا۔ جی چاہتا تھا قتل کر
اس لیے خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا کہ پھر رانا کی خفگی مول لینا پڑے گی اور اس کے لیے
نہیں تھا — کسی قیمت پر بھی نہیں۔

رانا کے محل کی طرف جاتے ہوئے اس نے بالکل دوستانہ انداز میں اسے
تھی۔ رانا کے حسن اخلاق۔ جرأت، دلیری۔ مردم شناسی اور بذل و عطا کی بہت
اور چھوٹی کہانیاں سنا ڈالی تھیں۔ احمد خاں نے اب تک رانا کو نہیں دیکھا تھا لیکن
ناواقف بھی نہ تھا۔ اس کے بہت سے واقعات اس کے کانوں میں پہنچ چکے تھے۔
اور تہور کا وہ قائل تھا۔ اب ہمت رائے کی باتیں سن کر ایک انسان کی حیثیت سے
احترام کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ بہادری، اور انسانیت لازم و ملزوم ہیں۔
شخص ہو سکتا ہے جو اچھا انسان ہو، جو اچھا انسان نہیں وہ بہادر بھی نہیں۔

ہمت رائے اسے دیوان خانے میں بٹھا کر، رانا کے ایوان خاص میں چلا گیا تھا

اسے اندازہ ہوا کہ اب احمد خاں کی نہ صرف کوئی اہمیت نہیں باقی رہ گئی ہے بلکہ اب وہ
اسے قیدی بنا کر رکھ سکتا ہے اور گنیش اگر کامیاب واپس آیا تو اسے قتل بھی کر سکتا ہے
نہ صرف وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا بلکہ اس کا رویہ بھی بدل گیا۔

ایوان خاص سے واپس آتے ہی احمد خاں سے جو کس کا منتظر اور رانا سے شرف
باریابی حاصل کرنے کا متوقع تھا، گویا ہوا۔

"چلو بھئی واپس چلیں"

احمد خاں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کہا:

"کیا رانا سے ملاقات نہیں ہو سکے گی اس وقت؟"

ہمت رائے نے باہر آ کے کہا

"کیا تم نے ہمارے رانا کو، دولت خاں سمجھ رکھا ہے کہ اس سے ہر کس و ناکس جب چاہے
مل لے، کچھ ہوش میں ہو؟"

یہ باتیں سن کر احمد خاں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا،

"ان باتوں کا مطلب؟"

ہمت رائے اب اپنے گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا، اور احمد خاں بھی کاٹھی پر بیٹھ
چکا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ ایڑ لگائی پھر ہمت رائے نے کہا۔

"یہ کوئی پہیلی تو نہیں بجھائی تھی کہ کچھ نہ سکو — سیدھی سی بات ہے دولت خاں
ایک معمولی آدمی ہے، رانا، ایک فرماں روا ہے، ان دونوں میں وہی فرق ہے جو غلام
اور آقا میں ہوتا ہے۔ دولت خاں کے پاس جو چاہے، جب چاہے جا سکتا ہے اور رانا
کی بارگاہ میں وہی حاضر ہو سکتا ہے، جو شرفِ باریابی حاصل کرنے کا استحقاق رکھتا ہو۔"
احمد خاں سمجھ گیا، کچھ دال میں کالا ہے۔ معاملات کا رُخ بدل چکا ہے۔ شاید رانا
نے ابراہیم سے رشتۂ دوستی استوار کر لیا ہے، یا شاید اس کی جنگی تیاریاں نقطۂ عروج پر

پہنچ چکی ہیں اور وہ تن تنہا بغیر کسی کی امداد اور اشتراک و تعاون کے لودھی خاندان کا تختہ الٹ سکتا اور سلطان حکومت کا وجود مٹا سکتا ہے، ورنہ اس کا ملاقات نہ کرنا اور ہمت رائے کے رویہ میں دفعتہً اتنا بڑا انقلاب پیدا ہو جانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

ساتھ ہی ساتھ احمد خاں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اب اس کی شامت آگئی ہے۔ اگر رانا کو دولت خاں کی احتیاج نہیں رہی تو پھر اب وہ صحیح سلامت یہاں سے واپس نہیں جا سکتا۔

اس کا جی چاہا کہ گھوڑے کو ایڑ لگائے اور نکل بھاگے، لیکن بہت جلد اس نے محسوس کر لیا، یہ ناممکن ہے، نہ صرف یہ کہ ابھی اور اسی وقت رانا کی فوج اس کے خلاف حرکت میں آجائے گی اور وہ گرفتار کر لیا جائے گا، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے فوراً ہی قتل بھی کر دیا جائے لہٰذا مناسب اور مستحسن صورت یہی ہے کہ جلد بازی سے کام نہ لیا جائے اور یہ ارادہ کسی دوسرے مناسب وقت کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔

یہ سوچ کر وہ خاموش ہو گیا، لیکن ہمت رائے تو پہلے اسے مشتعل کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا، اس نے کہا۔

"چپ کیوں ہو گئے؟"

احمد خاں نے متانت کے ساتھ جواب دیا:

"آپ کی ان باتوں کا میرے پاس جواب بھی کیا ہے؟"

ہمت رائے نے بہت زیادہ برہم ہو کر کہا،

"نہیں اگر تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہو، اگر دولت خاں کی بہادری اور شجاعت اور میرا ڈنکا بجانا چاہتے ہو تو بجاؤ!"

احمد خاں نے بات ختم کرنے کے لیے کہا۔

"میرے دوست میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ رہا دولت خاں تو اگر اس کی تلوار میں دم

تو وہ خود ہی اس کا ڈنکا بجائے گی!"

ہمت رائے نے چمک کر سوال کیا۔

"کیا سمجھتے ہو تم دولت خاں کو؟"

"میں بھی ایک سپاہی ہوں اور وہ بھی ایک سپاہی ہے، اس سے زیادہ نہ وہ مجھے سمجھتا ہے نہ میں اسے!"

"تم جھوٹے ہو — وہ سپاہی نہیں اپنے آقا کا غدار ہے!"

"لیکن ہے، ایسا ہی ہو!"

"تم بھی اپنے آقا کے غدار ہو — دولت خاں ابراہیم کا اور تم دولت خاں کے غدار ہو، اور تم دونوں اس کے سزاوار ہو کہ تمہارے ناپاک وجود سے دنیا پاک کر دی جائے!"

احمد خاں کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ میان کی طرف گیا لیکن کچھ سوچ کر وہ خاموش ہو رہا۔

اب یہ دونوں، ہمت رائے کی حویلی تک پہنچ چکے تھے۔ دونوں ایک ساتھ گھوڑے سے اتر پڑے۔ احمد خاں نے حویلی کے اس حصہ کا رخ کیا جہاں ایک معزز مہمان کی حیثیت سے وہ مقیم تھا، لیکن ہمت رائے نے ٹوکا۔

"کہاں چلے؟"

احمد خاں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمت رائے نے تالی بجائی، فوراً کئی مسلح سپاہی نمودار ہوئے، اور ادب سے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے، اس نے ان سے مخاطب ہو کر، اور احمد خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"گرفتار کر لو اس شخص کو!"

احمد خاں گرفتار ہو گیا، ہمت رائے نے ان سپاہیوں میں سے ایک آدمی سے کہا:

"اسے لے جا کر پرانے راج بھون میں قید کر دو!" — اور دیکھو خبردار، اس کی

.... نگرانی بڑی چوکسی سے کرنا۔ ایسا نہ ہو یہ فرار ہو جائے۔ اگر یہ فرار ہو گیا تو یاد رکھو مہاراما تم سب کی گردن اڑا دیں گے۔ یہ ان کا مجرم ہے۔ یہ ان کا قیدی ہے۔"

ان سپاہیوں کی حراست میں احمد خاں کو پرانے راج بھون میں پہنچا دیا گیا۔

---

(۸)

ویرانہ

یہ پرانا راج بھون شہر سے دور، ایک ویرانہ میں واقع تھا!

کبھی یہاں دل کشا عمارتیں ہوں گی، نظر افروز باغات ہوں گے، نزہت افزا چمن ہوں گے، کبھی اس محل میں نغمے برستے ہوں گے، حسن انگڑائیاں لیتا ہوگا، جام و ساغر کی مشق ہوتا ہوگا، رقاصائیں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرتی ہوں گی، راجکماریاں اور رانیاں اور مہارانیاں اپنے جلوۂ بے محابا سے یہاں کے بام و در کو جگمگا دیتی ہوں گی۔ لیکن اب؟

اب یہ ایک ویرانہ تھا!

یہ بڑی سی عمارت جس میں کئی سو آدمی نہایت آرام اور اطمینان سے رہ سکتے تھے۔ اب چوہوں، چمگادڑوں اور حشرات الارض کا مسکن تھی!

اس محل کا ایک وسیع کمرہ احمد خاں کو رہائش کے لیے دے دیا گیا۔

وہ قیدی تھا، لیکن اس محل کے اندر آزاد تھا۔ ٹہل سکتا تھا، گھوم پھر سکتا تھا، سپاہیوں سے بات چیت کر سکتا تھا، لکھ پڑھ سکتا تھا۔ بس یہاں سے باہر نہیں جا سکتا تھا، اور وہ بھی اپنی اس حالت پر قانع تھا۔

لیکن چند ہی روز میں یہ دشمن سپاہی جو اسے گرفتار کر کے لائے تھے، جو ہر گز اس کے

خیر خواہ نہیں تھے، جو اس کی جان کے گاہک تھے اور اس دن کے منتظر تھے جب اسے قتل کر کے وہ اپنا کلیجہ ٹھنڈا کریں گے، اس کا احترام کرنے پر مجبور ہو گئے اور اس کی عزت کرنے لگے۔

اور یہ قیدی تھا بھی تو نہایت ہی عجیب و غریب شخص!

اس پرانے راج بھون میں آج سے پہلے، بہت سے لوگ قید ہو کر آئے تھے جو رانا کے دشمن تھے۔ یہ قید ہو کر آتے تھے، رہتے تھے۔ اور قتل کر دیے گئے تھے۔ ان کے رہن سہن میں، وضع قطع میں، انداز و اطوار میں کوئی بات ایسی نہیں تھی جو ان نگہبانوں کو سر جھکا دینے پر مجبور کر دیتی۔ ان نگہبانوں نے نہایت بے پروائی کے ساتھ ان لوگوں کو گرفتار کیا تھا، نہایت سختی کے ساتھ ان کی نگرانی کی تھی، اور نہایت بے رحمی کے ساتھ ایک دن مہارانا کا حکم پا کر قتل کر دیا تھا، اور پھر ان تمام باتوں کو اس طرح بھول گئے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا!

لیکن یہ نرالا اور انوکھا قیدی — کیا اسے بھی وہ بھول سکیں گے؟ کیا کبھی وہ سختی کر سکتے ہیں؟ کیا اسے بھی پوری سفاکی اور درندگی کے ساتھ وہ قتل کر... یہ سوچ کر وہ خود بخود لرزنے لگتے تھے!

یہ قیدی، جو مہارانا کا دشمن تھا، جسے ہمت رائے نے ایک خطرناک مجرم کی حیثیت سے یہاں قید کیا تھا، کیسا انوکھا اور نرالا انسان تھا!

جب یہ نگہبان سو رہے ہوتے تو یہ قیدی اٹھتا اور وضو کر کے نماز کے لیے کھڑا ہو جاتا، پھر قرآن شریف کی تلاوت کرتا، اور اس کے بعد ان نگہبانوں سے اس طرح باتیں کرنے لگتا، جیسے نہ اسے اپنی زندگی کی پروا ہے، نہ موت کا اندیشہ... باتیں کرتا، ان کی باتیں سنتا، ان کے حالات دریافت کرتا، انھیں نیک باتیں... انھیں ایک اچھا انسان بننے کی تلقین کرتا۔ ان میں اچھی عادتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ ان کے دکھ درد پر کڑھتا، ان کی بیماری، آزادی کے موقعہ پر خدمت کے لیے تیار ہو جاتا، ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی غیر نہیں اپنا ہے۔ اس سے کوئی ایسا رشتہ قائم ہو گیا ہے جو اٹوٹ ہے۔

ان نگہبانوں میں ایک شخص کا نام رگھونندن تھا، ایک روز احمد خاں نے اسے ڈیوٹی پر موجود نہیں دیکھا خاموش ہو رہا، دوسرے دن بھی جب اسے نہ دیکھا تو اس کے ایک ساتھی آنند سے پوچھا۔

"کیا بات ہے، رگھونندن نظر نہیں آتا؟"

آنند نے جواب دیا:

"وہ تو کل سے بہت سخت بیمار ہے!"

احمد خاں نے پریشان ہو کر بڑی اپنائیت اور ہمدردی کے ساتھ سوال کیا۔

"تم نے ابھی تو خبر ہی نہیں دی — کیا بیمار ہے وہ؟"

آنند نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں بتایا۔

"اسے تو گلٹی نکل آئی ہے — مانو طاعون ہو گیا ہے، اب کیا بچے گا بے چارا!"

"علاج تو ہو رہا ہوگا؟"

"بھلا طاعون کا بھی کوئی علاج ہے؟ — ہے بڑا سخت جان، مر جائے تو پاپ کٹے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" . . . .

"کیا تم چاہتے ہو کہ وہ مر جائے؟"

"سب ہی یہ چاہتے ہیں، اس کے بھائی، اس کی بیوی، اس کے لڑکے، اس کے باپ تک کی دعا یہی ہے —"

(حیرت زدہ ہو کر) "یہ سب دعا کر رہے ہیں کہ وہ مر جائے؟ یہ کیا سن رہا ہوں میں؟"

"دیکھئے صاحب طاعون کا مریض اچھا نہیں ہوتا، اور یہ بیماری چھوت پھیلاتی ہے

گھر والوں نے اسے گھر کے باہر ایک سائبان تلے ڈال رکھا ہے، کوئی اس کے پاس تک نہیں پھٹکتا۔"

"ڈرتے ہوں گے کہیں یہ مرض انھیں بھی نہ ہو جائے!"

"جی اور کیا ——"

"لیکن اس طرح تو وہ بے موت مر جائے گا! —— یہ تو بہت بڑا ظلم ہے۔ کیا انسان اتنا ظالم بھی ہو سکتا ہے؟ —— یہ تو بتاؤ وہ رہتا کہاں ہے؟"

"پرانے راج بھون میں سپاہیوں کا ایک دستہ مستقل طور پر رہتا ہے، یہ سپاہی بال بچوں سمیت محل کے آخری حصہ میں رہتے ہیں، وہیں وہ بھی ہے!"

"اب کیا حال ہے اس کا؟"

"ویسا ہی ہو گا۔ میں بھی قریب ہی رہتا ہوں، لیکن کل سے گھر بھی نہیں گیا، ادھر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا؟"

"اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی اور پھر میں نوجوان ہوں، صرف سال بھر ہوئے شادی کی۔"

"لیکن رگھونندن بھی تو جوان ہے!"

"ہاں، ہے تو!"

"اسے بھی زندہ رہنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا تمہیں، جتنا مجھے، یا کسی اور کو ہے!"

"لیکن آئی ہوئی ٹل نہیں سکتی: اب اس کا وقت آ گیا ہے!"

"ممکن ہے بچ جائے۔ ایک مرتبہ میرے والد بھی اس مرض میں مبتلا ہوئے تھے، حکیم صاحب کے علاج سے اچھے ہو گئے تھے، وہ نسخہ مجھے یاد ہے۔ میں لکھے دیتا ہوں استعمال کراؤ۔ خدا نے چاہا تو اچھا ہو جائے گا!"

"(کانوں پر ہاتھ رکھ کر) نا بابا! اسے پانی پلانے کا تو کوئی روادار نہیں، دوا کون پلائے گا؟ —— یہ بیماری تو اڑ کر لگتی ہے!"

(ہنستے ہوئے) چہرے سے تو بڑے بہادر سپاہی معلوم ہوتے ہو لیکن اتنے بزدل؟

"بہادر تو آپ بھی ہوں گے، آپ ہی چلے جائیے، سیوا کیجئے اس کی، دوا میں لا دوں گا۔ بتائیے آپ، جائیے آپ۔ (مسکراتے ہوئے) کہیے کیا تیار ہیں آپ —— ؟ جواب دیجئے!

"ہاں میں تیار ہوں! —— تم دوا لاؤ، میں اس کا علاج اور تیمارداری کروں گا!"

---

(۹)

انسان

احمد خاں خود رگھو نندن کے گھر تک گیا۔ واقعی وہ گھر سے باہر ایک سائبان کے نیچے کس مپرسی کی حالت میں پڑا تھا۔ واقعی کوئی اسے پانی پلانے کا روادار بھی نہیں تھا اور اس کے متعلقین اس کے سایہ تک سے گریزاں تھے۔ احمد خاں نے اسے اپنی جیپ میں لادا اور اپنے کمرے میں لے آیا۔ اس کے متعلقین میں سے کسی نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کا ہاتھ نہیں بٹایا لیکن اسے اس کام سے منع بھی نہیں کیا، وہ اصولاً اسے منع بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ایک مسلمان کے کمرے میں رہے۔ اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی دوائیں استعمال کرے لیکن انھیں یقین تھا کہ یہ بچ نہیں سکتا۔ انھوں نے سوچا اس کوشش کا انجام اگر دیکھ لیا جائے تو کیا حرج ہے؟

احمد خاں نے جو دوائیں لکھی تھیں آنند نے وہ لادیں اور احمد خاں نے ان کا استعمال شروع کرا دیا۔

رگھو نندن کی حالت واقعی بہت ابتر تھی، بظاہر زندگی کی کوئی امید نہیں تھی۔ بہت سخت بخار چڑھا ہوا تھا۔ زیادہ تر اس پر بے ہوشی کی کیفیت طاری رہتی، کبھی آنکھ کھولتا تو وحشت کے عالم میں خون کبوتر کی سی سرخ آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتا، اور پھر بند کر لیتا۔ اس کے سارے گھر والے، عزیز، متعلقین، دوست، ساتھی سب اس کی زندگی سے مایوس تھے، لیکن احمد خاں ان سب سے بے نیاز اس کی تیمارداری میں علاج معالجہ میں لگا ہوا تھا۔

کئی دن گزر گئے!

اس عرصہ میں احمد خاں تن من دھن سے اپنے کام میں لگا رہا۔ مگر رگھو نندن کے متعلقین میں سے کسی نے جھانکا تک نہیں۔ سب آنند سے "خیریت" دریافت کر لیا کرتے تھے اور خود آنند کا بھی حال یہ تھا کہ وہ کمرہ کے قریب نہیں پھٹکتا تھا۔ رگھو نندن تو رگھو نندن، احمد خاں کے سایہ سے دور بھاگتا تھا۔ کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو کر دور سے حال دریافت کر لیتا اور چلا جاتا۔

ایک ہفتہ کے بعد رگھو نندن کی حالت ذرا سنبھلی، اگلی ڈب گئی۔

احمد خاں کے کمرے میں اپنے آپ کو دیکھ کر اسے حیرت تو ہوئی۔ لیکن بے بتائے ہوئے بھی ساری صورت احوال اس کی سمجھ میں آگئی۔

ان چند دنوں میں وہ احمد خاں کے خصائل سے، اس کی سیرت اور کردار سے۔ اس کی شخصیت سے ایک حد تک واقف ہو چکا تھا۔ علالت کے دوران میں جب بھی اس کی آنکھ کھلی، جب بھی اسے ہوش آیا، اسے صرف ایک ہی صورت نظر آئی اور وہ صورت تھی احمد خاں کی۔

اس کرب و اذیت کے عالم میں بارہا اسے اپنی بیوی یاد آئی۔ بھائی یاد آیا، بہن یاد آئی، لیکن ان میں سے کسی کو اس نے بستر علالت کے قریب نہیں دیکھا، کسی کو بھی تیمارداری کرتے نہیں پایا۔

وہ جانتا تھا، اسے طاعون نے دبوچ لیا تھا، وہ جانتا تھا اس مرض کی چھوت سے لوگ کس طرح خائف رہتے ہیں، اپنی تندرستی کے زمانے میں بارہا اس نے اپنے کئی عزیزوں

اور دوستوں کو اس بیماری میں مبتلا ہوتے دیکھا تھا، یہ بھی دیکھا تھا کہ اس مرض کے مریض کے پاس کوئی نہیں پھٹکتا، سب اس طرح اس سے ڈرتے ہیں جیسے کوئی شیر سے ڈرتا ہے۔ خود وہ بھی ڈرتا تھا اور کبھی ایسے موقعوں پر اس نے نہ کسی کی تیمارداری کی تھی، نہ علاج معالجہ میں حصہ لیا تھا۔ اور نہ کسی اور کو ایسا کرتے دیکھا تھا، اور بات اتنی عام تھی کہ کبھی اپنے یا دوسروں کے اس طرزِ عمل پر نہ اسے حیرت ہوئی تھی۔ نہ افسوس ہوا تھا نہ اس میں خلش محسوس ہوتی تھی۔

لیکن اب جب وہ خود بیمار پڑا!

اس چھوت والی بیماری نے جب خود اسے دبوچ لیا؟ جب زندگی سے مایوسی ہونے لگی اور موت سامنے نظر آنے لگی، تو رہ رہ کر، اپنے بیوی بچے، بھائی اور بہن، دوست اور عزیز یاد آتے تھے، وہ ان کی ہمدردی اور محبت کا جویا تھا، یہ سب اس سے لگاؤ بھی رکھتے تھے اور محبت بھی کرتے تھے، لیکن اس سے دور بھاگتے تھے۔ اس کے قریب آتے ہوئے ڈرتے تھے اور ان کی اس کمزوری، بے تعلقی اور بے پروائی پر اس کا دل کڑھتا تھا، اسے رنج ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو اس کی آنکھیں آب گوں بھی ہو جاتی تھیں لیکن اس نے یہ آنسو آنکھ سے ٹپکنے نہیں دیے۔ اپنی اس کیفیت کا اظہار نہیں ہونے دیا، جذبات کو سینہ کے اندر بند رکھا، کسی کو ان سے آشنا نہیں ہونے دیا۔

دس پندرہ روز کے علاج معالجہ اور دوا دوش کے بعد وہ بالکل اچھا ہو گیا، کمزوری ابھی باقی تھی۔ لیکن مرض دور ہو چکا تھا۔

آنند اب دو تین دن سے کمرے میں آنے لگا تھا اور کھڑے کھڑے، ذرا فاصلہ سے دو چار باتیں بھی کر لیتا تھا۔ آج اس کی بیوی راجو بھی آئی تھی، اور اپنے ساتھ توشہ لائی تھی۔ رگھونندن نے اسے دیکھ کر شکایت بھرے لہجہ میں کہا:

"میری محبت بھی تجھے کھینچ کر یہاں تک نہ لا سکی۔"

وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی "میں نے تو کئی دفعہ آنے کی کوشش کی، لیکن کسی نے مجھے آنے ہی نہیں دیا!"

بے اعتباری کے لہجہ میں رگھونندن نے کہا،

"تو اگر بیمار پڑتی تو مجھے بھی لوگ تیرے پاس آنے سے روکتے، مگر میں کسی کی نہ سنتا تیری پٹی سے لگا بیٹھا رہتا، چاہے مر ہی کیوں نہ جاتا۔"

راجو لاجواب ہو گئی، کچھ ندامت، کچھ بے بسی کی کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ رگھونندن نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

"اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی، لیکن کبھی کبھی ایسا موقعہ بھی آتا ہے کہ جان سے اتنا پیار نہیں رہتا، جتنا جان دے دینے سے پیار ہوتا ہے۔ زندہ رہنا ہی سب کچھ نہیں ہے زندگی قربان کر دینے کے لیے تیار ہو جانا ہی بہت کچھ ہے، اپنے لیے زندہ رہنا کچھ اور معنی رکھتا ہے، اور دوسروں کو بچانے کے لیے، اپنے جیون کی بازی لگا دینا کوئی اور چیز ہے۔ یہ باتیں میں نے کبھی سوچی بھی نہیں تھیں؟ ان باتوں پر میں نے کبھی دھیان نہیں دیا تھا، کوئی میرے سامنے اس طرح کی باتیں کرتا، تو میں اس پر ہنستا، اس کا مذاق اڑاتا، ٹھٹھے میں اڑا دیتا ان باتوں کو، لیکن (احمد خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس دھرماتما نے یہ بات مجھے سمجھا دی ہے، باتوں سے نہیں اپنے عمل سے، اپنے سیوا سے! — کیوں کوئی ایسا دھرماتما کبھی تیری نظر سے گزرا ہے؟"

راجو نے ممنون نظروں سے احمد خاں کی طرف دیکھا جو ایک الگ گوشہ میں بیٹھا بڑی مصروفیت اور انہماک کے ساتھ گھونٹ رہا تھا، اور ان دونوں کی باہمی گفتگو سے بے تعلق تھا، راجو نے کہا:

"یہ تمہیں اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لائے تھے! — لیکن یہ تو مسلمان ہیں!"

رگھونندن کی تیوریاں چڑھ گئیں اس نے کہا "ہاں یہ مسلمان ہیں، اور اگر مسلمان ایسے ہی

ہوتے ہیں تو دنیا میں، اس ساری دنیا میں ان سے اچھا کوئی نہیں — پچ تا رہو گیا، آدمی، تجھ سے، میرے بھائی سے، تیرے بھائی سے اچھا نہیں ہے؛ جب تم سب نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا تب اس نے میرا ساتھ دیا اور موت سے پنجہ لڑا کر مجھے چھین لیا۔

---

(۱۰)

آدمی یا اوتار؟

دگھو نندن بالکل اچھا ہو گیا، پہلے بھی اس کا طرزِ عمل احمد خاں کے ساتھ برا نہ تھا، اب تو وہ بندۂ بے دام بن گیا۔ آنندو نے اس مسلمان قیدی کا جو روپ دیکھا تھا وہ اس کے بالکل نیا تھا، اور حد درجہ عجیب تھا۔ اگر احمد خاں کو خود انسان ہونے پر اصرار نہ ہوتا تو وہ بے تامل اسے اوتار تسلیم کر لیتی گو یہ بات باور کرنے پر وہ اب تک اپنے آپ کو تیار نہیں کر سکا تھا کہ یہ روپ کسی اوتار کا نہیں انسان کا ہو سکتا ہے۔ راجو، شوہر کا کھانا لے کر اکثر آیا کرتی۔ وہ بھی شوق اور عقیدت کی نظر سے اس شخص کو دیکھتی جو ایک مجرم کی طرح یہاں قید تھا لیکن جس کے چہرے پر ایسا نورِ انسانیت کا چمک رہا تھا جس کی جھلک اب تک اس نے کہیں نہیں دیکھی تھی۔ وہ بھی آنند کی ہم خیال تھی اور اس سے زیادہ ثابت قدم تھی۔ زبان سے کم کہتی، لیکن دل میں اسے یقین کامل تھا کہ انسان کے بھیس میں یہ اوتار آسمان سے اترا ہے چنانچہ اسے یہ بھی یقین تھا کہ اسے نہ کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے نہ سزا دے سکتا ہے۔ یہ سب بھٹ رائے، رانا سانگا اور دوسرے ارکانِ دولت منہ دیکھتے رہ جائیں گے اور یہ آسمانی مخلوق ان کی آنکھوں میں دھول ڈال کر اڑ جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ اس قیدی کی زندگی اور مستقبل کے بارے میں سب سے زیادہ پُر امید اور مطمئن وہی تھی، ورنہ

رگھونندن اور آنند تو اکثر غم و حسرت کے ساتھ یہ سوچا کرتے تھے کہ اگر اس شخص کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کا وقت آیا، یا اسے تلوار کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کیا گیا تو کیا ہوگا؟ یہ منظر کس طرح دیکھا جائے گا؟ یہ کام کیونکر انجام دیا جا سکے گا؟

اور خود جہاں تک احمد خاں کا تعلق تھا، وہ ان باتوں سے بالکل بے فکر تھا۔ کم از کم بظاہر اسے ذرا فکر نہ تھی کہ اس کا کیا حشر ہوگا؟

آخر ایک روز آنند اور رگھونندن نے یہ سوال چھیڑ ہی دیا، آنند نے کہا:

"آپ کو یہاں قید ہوئے ایک مہینہ سے زیادہ ہو چکا ہے!"

احمد خاں نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا "ہاں آنند مجھے یہاں آئے ایک مہینہ سے زیادہ مدت گزر چکی ہے — کیوں کیا تم گھبرا گئے، میرے قیام سے؟"

آنند نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "آپ کے ساتھ تو میں زندگی گزارنے کو تیار ہوں گھبرانے کا کیا سوال، لیکن — ایک بات تو بتائیے!"

احمد خاں نے سوالیہ نظروں سے آنند کی طرف دیکھا مگر رگھونندن نے آنند کی بات پوری کر دی اس نے کہا:

"ان لوگوں نے کس جرم میں آپ کو گرفتار کیا ہے؟"

احمد خاں نے جواب میں کہا "میرا جرم صرف یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں پر اعتماد کیا۔ یہ ہمت رائے رانا سانگا کا ایلچی بن کر ہمارے پاس پہنچا تھا کہ اس کی مدد کریں، اس کا ساتھ دیں اس کے دشمنوں سے لڑیں۔"

"تو آپ اس لیے آئے تھے" آنند نے سوال کیا:

"ہاں" احمد خاں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بتایا "میں اسی لیے آیا تھا کہ حالات معلوم کر کے فیصلہ کروں لیکن ہمت رائے مجھ سے ویسے ہی خار کھائے ہوئے تھا جیسا ہوتا ہے مہاراج کو بھی میری مدد کی ضرورت نہیں رہی —"

"تو پھر آپ کو واپس کر دیتے، گرفتار کیوں کر لیا؟"

"ہمت رائے نے یہی رائے دی ہوگی!"

"مگر ہمت رائے آپ کا دشمن کیوں بن گیا؟"

"اس لیے کہ وہ ظالم تھا اور میں ظالم کا ساتھ نہیں دے سکا!"

رگھونندن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ ہے تو ایسا ہی لیکن اتنی جلدی آپ نے کیسے جان لیا کہ وہ ظالم ہے؟"

احمد خاں نے رانی کا سارا واقعہ سنا دیا اور کہا:

"بس یہ ہے میرا جرم، اور میں جانتا ہوں اس جرم کی سزا مجھے کیا ملے گی!"

آنند نے رگھونندن کی طرف ایک خاص نظر سے دیکھا اور پوچھا۔

"کیا سزا ملے گی یہ آپ کو کیسے معلوم؟"

احمد خاں نے پہلے سے زیادہ بے پروائی کے ساتھ جواب دیا۔

"وہ سزا جو زیادہ سے زیادہ ہو سکتی ہے قتل ہے! اور مجھے اس سے کم کی سزا نہیں مل سکتی۔ البتہ اس بات پر مجھے حیرت ضرور ہے کہ دیر کیوں ہو رہی ہے، یہ لوگ اپنے فیصلہ کو عملی جامہ کیوں نہیں پہناتے؟"

"تو کیا آپ موت سے نہیں ڈرتے؟" آنند نے سوال کیا "آپ مرنے کے لیے تیار ہیں؟"

"موت سے وہی ڈرتے ہیں جو بزدل ہوں؟" احمد خاں نے جواب دیتے ہوئے کہا "دنیا میں جو آیا ہے اسے مرنا ہے۔ کوئی بچپن میں مر جاتا ہے کوئی جوان ہو کر، کوئی بڑھاپے میں اڑیاں رگڑنے کے بعد، لیکن مرتے سب ہیں!"

"مگر قتل تو نہیں ہوتے!" رگھونندن نے کہا "مرنا دوسری چیز ہے اور قتل ہونا الگ بات!"

احمد خاں ہنس پڑا اس نے کہا:

"نہیں رگھونندن تم غلط سمجھے۔ مرنا، قتل ہونا کسی حادثہ کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت

ہونا ، مثلاً ڈوب جانا ، یہ موت کی مختلف صورتیں ہیں ۔ لیکن آدمی مرتا اسی وقت ہے جب موت کی گھڑی آجاتی ہے اور یہ گھڑی اٹل ہوتی ہے اسے کوئی نہیں ٹال سکتا ، میں تب ہی قتل کیا جاؤں گا ، جب میری موت کا وقت آجائے گا ، اس سے پہلے نہیں ، تو جب موت کا وقت اٹل ٹھہرا تو پھر اس سے ڈرنا کیا ؟ اور ڈرنے سے حل کیا جائے گا ؟ کیا موت معاف کر دے گی ؟ کیا موت کی گھڑی ٹل جائے گی ۔ دیکھو رگھونندن ، طاعون کی بیماری میں کتنے لوگ مرگئے لیکن تم نہیں مرے ، کیوں نہیں مرے ؟ اس لیے کہ وقت نہیں آیا تھا اور جب آجائے گا تو بھلے چنگے باتیں کرتے ، ہنستے بولتے مرجاؤ گے ؟"

رگھونندن کے بدن میں کپکپی سی آگئی ، اس نے کہا :

" ہاں میرے ماموں اسی طرح مرے تھے ، کبھی بیمار نہیں پڑے ۔ بڑھاپے میں بھی جوانوں کو شرماتے تھے ، ایسی صحت تھی ، لیکن ایک دن رات کو سوئے صبح مرے ہوئے تھے ۔"

احمد خاں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا :

" پھر خود ہی سوچ لو ۔۔۔ بتاؤ کیا اب بھی ڈرنا چاہیے مجھے ؟"

رگھونندن سے کوئی جواب نہ بن پڑا ۔ احمد خاں نے کہا ۔

" اور بھئی ایک بات اور بھی ہے ۔ ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے ، میرے یہاں آنے میں بھی بہتری تھی اگر نہ آتا تو وہ مظلوم عورت دلاری کس طرح ہمت رائے کے چنگل سے بچتی ؟ اگر میں یہاں قید ہو کر نہ آتا تو تم جیسے اور آنند جیسے بھلے آدمیوں سے ملاقات کیسے ہوتی ؟"

رگھونندن نے معذرت آمیز انداز میں کہا :

" یہ کہہ کر ہمیں شرمندہ نہ کیجیے ۔ ہم بھلا کس شمار و قطار میں ہیں ؟ کاش ہم آپ کی کوئی مدد کر سکتے ، کام آسکتے !"

احمد خاں نے از خود رفتگی کے عالم میں کہا ۔

" نہ میں تمہارے کام آسکتا ہوں ، نہ تم میرے کام آسکتے ہو ، وہ خدا ہے واحد ہے جو اپنے بندوں کے کام آتا ، اور ان کی بگڑی بناتا ہے !" ۔۔۔ میں تمہاری کتنی ہی تیمارداری کرتا ، مگر تم نہیں بچ سکتے تھے ، البتہ خدا نے تمہیں بچا لیا ۔"

رگھونندن نے بے ساختہ سوال کیا :

" تو کیا وہ خدا آپ کو بھی بچا لے گا ؟"

احمد خاں نے ایک خاص تیور کے ساتھ جواب دیا ۔

" ہاں اگر دنیا کو میری ضرورت ہے تو ضرور بچا لے گا اور نہیں ہے تو نہیں بچائے گا ۔ بچائے گا ۔۔۔"

آنند اب تک خاموشی سے یہ باتیں سن رہا تھا ، اب خاموش نہ رہ سکا ، اس نے قفل سکوت توڑا ، اور جوش و خروش کے ساتھ گویا ہوا ،

" دنیا کو صرف آپ کی اور آپ جیسے لوگوں کی ضرورت ہے ۔۔۔ ہم لوگ تو نکمے ہیں ، بیکار ہیں ، بے فائدہ ہیں ، دھرتی (زمین) پر ایک بوجھ ہیں ۔ جب دیکھتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں اور آپ قید ہیں ، ہماری گردن سلامت ہے اور آپ کے سر پر تلوار لٹک رہی ہے حالانکہ ہم کسی کے کام نہیں آتے اور آپ دکھیاروں کا دکھ بٹاتے ہیں ۔ ہم دلاری کی کوئی مدد نہ کر سکے ، آپ نے اسے نجات دلا دی ، ہم رگھونندن کے کام نہ آسکے اور آپ نے اسے نئی زندگی بخش دی ، تو کلیجہ خون ہو جاتا ہے ، بھگوان کے نیائے (انصاف) پر سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے ۔۔۔"

شاید آنند جوش و خروش کے عالم میں ابھی کچھ اور بھی کہتا لیکن احمد خاں نے اسے زیادہ بولنے کا موقع نہیں دیا اس نے کہا :

" کیسی ناسمجھی کی باتیں کرتے ہو آنند ، اس دنیا میں کوئی چیز بھی نکمی ، بے کار ، اور بے فائدہ نہیں ، حتیٰ کہ سانپ اور بچھو تک نہیں ۔ روشنی جتنی ضروری ہے ، تاریکی بھی

اتنی ہی ضروری ہے۔ جس طرح زندگی اپنا ایک مقام رکھتی ہے اسی طرح موت کا بھی ایک مقام ہے، لیکن فنا اسے ہے جو اپنا کام کر لے اور زندگی اس کے لیے بے حس ہو اور باقی ہو۔ فنا ہونے کے بعد، مرنے کے بعد انسان کا صرف جسم مٹ جاتا ہے، روح نہیں مٹتی۔ وہ زندہ رہتی ہے، وہ کبھی نہیں مرتی، اسے فنا ہے ہی نہیں۔ وہ تو امر ہے ... ہے۔ دنیا میں اپنا کام ختم کرنے کے بعد، روح جسم کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے اور اپنے پروردگار کے حضور میں پہنچ جاتی ہے کہ اگر نیک کام کیے ہیں تو اجر لے، اور برے کیے ہیں تو سزا پائے۔ لہٰذا موت صرف ایک دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچ جانے کا نام ہے، یہ کوئی گھبرانے اور پریشان ہونے کی چیز نہیں اور ہم مسلمانوں کو تو موت کی آرزو رہتی ...

بے ساختہ آنند نے سوال کیا :

" آرزو رہتی ہے ؟ ـــــ موت کی ؟"

احمد خاں نے بڑے پرسکون لہجہ میں جواب دیا ،

" ہاں میرے بھائی، تم چونک کیوں پڑے ؟ حیرت کیوں ہوئی تمہیں ؟"

رگھو نندن نے آنند کی طرف سے جواب دیا " حیرت کی تو بات ہی ہے !"

" ہاں ان لوگوں کو حیرت کرنے کا حق ہے ، جو سب کچھ اس زندگی ہی کو سمجھتے ہیں ، اس زندگی کے بعد کیا ہے ؟ یہ نہیں جانتے ؟"

" یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا ؟"

" ہاں کوئی نہیں جانتا لیکن وہ لوگ جانتے ہیں ، جو خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں !"

" خدا پر تو ہم بھی اعتقاد رکھتے ہیں !"

" تم نے تو بہت سے خدا بنا لیے ہیں ، حالانکہ خدا ایک ہی ہے ! اور ایک ..."

رگھو نندن اور آنند ایک دوسرے کی طرف کچھ دیر تک استفہامی نظروں سے دیکھتے رہے پھر رگھو نندن گویا ہوا :

" لیکن ایک ہی خدا ظلم بھی کرے اور رحم بھی - مارے بھی اور جلائے بھی ، سکھ بھی دے اور دکھ بھی - عطا بھی کرے اور چھینے بھی - یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ یہ کام تو الگ الگ خداؤں ہی کے ہو سکتے ہیں !"

احمد خاں ہنسنے لگا ، اس نے کہا " یہ تمہاری نادانی ہے ، بہت سے خدا ہوں تو اس دنیا کا نظام نہیں قائم رہ سکتا - کوئی خدا طاعون لانے پر بضد ہو اور کوئی صحت عطا کرنے پر تو دونوں میں فساد ہو جائے ، لڑ جائیں دونوں - خدا تو ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے - باقی رہی یہ بات کہ ایک خدا جبار اور رحیم کیسے ہو سکتا ہے ، تو میرے دوست ، خدا نے چند قاعدے بنا دیئے ہیں اور ان پر عمل ہوتا رہتا ہے ، آگ میں ہاتھ ڈالو گے جل جاؤ گے ، زیادہ کھا جاؤ گے بدہضمی ہو جائے گی ، تلوار کی دھار پر انگلی رکھ دو گے زخمی ہو جاؤ گے ، ہمارا کام ہے کہ آگ میں ہاتھ نہ ڈالو ، زیادہ نہ کھاؤ ، تلوار کی دھار پر انگلی نہ رکھو ، اگر ایسا کرتے ہو تو خدا کو کیوں دوش دیتے ہو ؟"

رگھو نندن نے جواب میں کچھ کہنا چاہا تھا کہ راجو کھانا لے کر آ گئی - احمد خاں نے راجو سے پوچھا :

" کیا پکایا ہے تم نے آج ؟ کیا ہمیں بھی چکھاؤ گی ؟"

وہ خوش ہو گئی ، اس نے حیرت اور بے یقینی کے ساتھ پوچھا -

" کیا آپ کھائیں گے ؟"

احمد خاں نے کہا " کیوں نہیں کھائیں گے ؟ کیا تم انسان نہیں ہو ؟ کیا سب انسان برابر نہیں ہیں ؟"

راجو آنکھیں پھاڑ کر احمد خاں کو دیکھنے لگی اور بڑی دیر تک یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے رہے ـــــ اس کے کانوں میں بھی ، آنند اور رگھو نندن کے کانوں میں بھی !

---

(۱۱)

قیدخانے کا کمرہ

یہ باتیں کچھ عجیب سی تھیں!

ایسی باتیں ان لوگوں نے آج تک نہیں سنی تھیں!

انسانی مساوات، سب انسان برابر ہیں، کسی میں کوئی فرق نہیں، سب کو خدا نے پیدا کیا ہے، سب یکساں طور پر اللہ کے رحم وکرم کے مستحق ہیں، خدا کا انصاف سب کے ساتھ یکساں ہے —— یہ باتیں ان باتوں سے کتنی مختلف اور متضاد تھیں جنھیں بچپن سے اب تک وہ سنتے اور مانتے چلے آرہے تھے!—اور یہ باتیں دھرم کے بھی تو خلاف تھیں۔

آخر رگھونندن سے ضبط نہ ہوسکا اس نے کہا:

"اور تو سب ٹھیک ہے، لیکن آدمی آدمی برابر کیسے ہوتے ؟"

احمد خاں نے ایک استاد کی طرح جیسے وہ اپنے شاگردوں کو مخاطب کرتا ہو

"کیوں کیا برابر نہیں ہیں؟ کچھ فرق محسوس کرتے ہو تم؟"

راجو اب تک کھانے کا تھال سر پر لیے کھڑی یہ باتیں سن رہی تھی، اب گفتگو نے زیادہ دلچسپ رخ اختیار کرلیا، اس نے حسب معمول شوہر سے جلدی کرنے کا

تقاضہ نہیں کیا، بلکہ تھال ایک طرف رکھ کر بیٹھ گئی اور انہماک کے ساتھ ان کی باتیں سننے لگی، رگھونندن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

"ظاہر میں تو کوئی فرق نہیں لیکن ویسے ہے بھی!"

"بتاؤ تو سہی، کیا ہے وہ فرق؟"

"اونچ نیچ تو بھگوان کی پیدا کی ہوئی ہے، کوئی راجہ ہے کوئی پرجا، کوئی برہمن ہے کوئی شودر!"

"(ہنستے ہوئے) بھگوان نے صرف آدمی پیدا کیا ہے۔ اونچ نیچ تو خود انسان نے پیدا کی ہے اور جانتے ہو کیوں پیدا کی ہے؟"

"بتائیے، میں کیا جانوں؟"

"اس لیے پیدا کی ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو غلام رکھ سکے اور اس اونچ نیچ کے فلسفہ میں اس نے دھرم کا رنگ اس لیے رچایا ہے کہ لوگ بغاوت نہ کرسکیں، قانع ہوجائیں اپنی پستی پر، ایک شودر کو اگر مواقع اور وسائل میسر آئیں تو وہ بھی بادشاہ بن سکتا ہے، وہ بھی برہمن کی طرح عالی دماغ، اور عالم و فاضل بن سکتا ہے، کیا برہمنوں کے اخلاق گندے نہیں ہوتے؟ کیا شودروں میں اونچے اور اچھے کردار وسیرت کے لوگ نہیں ہوتے؟ پھر کیوں نہ سب کو یکساں ترقی کے مواقع ملیں؟ سب کو علم حاصل کرنے کی، ترقی کرنے کی، اپنے ذہن و دماغ اور اخلاق وصفات کو جلا دینے کی یکساں سہولتیں حاصل ہوں؟"

بات دل کو لگتی ہوئی تھی، راجو، رگھونندن، آنند سب کے دل میں بیٹھ گئی، لیکن جو بات ہزاروں سال سے نسلوں اور پشتوں سے دلوں میں اور خیالوں میں بسی ہوئی تھی وہ اتنی جلد، اور اس آسانی سے نکل ہی نہیں سکتی تھی، رگھونندن نے کہا:

"ایسا ہو تو پھر تو دنیا جس ڈگر پر چل رہی ہے وہ ٹوٹ پھوٹ جائے گی!"

"کیوں ٹوٹ پھوٹ جائے گی؟ ہمارے ہاں تو صحیح سالم ہے، کبھی نہیں ٹوٹی۔"

راجو بول پڑی: "کیا مسلمانوں میں اونچ نیچ نہیں ہے؟"

احمد خاں نے بڑے جوش کے ساتھ جواب دیا۔

"بالکل نہیں، ہم ایک خدا کو مانتے ہیں اور ہمارا خدا انسان انسان میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ ہمارے ہاں ایک معمولی آدمی خواہ وہ کسی خاندان میں پیدا ہوا ہو، اپنی [illegible] اور اہلیت کے بل پر بادشاہ بھی بن سکتا ہے۔ عالم دین بھی، اور سپہ سالار [illegible] ہمارے خدا کے نزدیک بزرگی اور بڑائی کا معیار صرف حسن عمل ہے اور یہی [illegible] وجہ ہے کہ ہمارے ہاں غلام تک بادشاہ بن جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں ذات پات [illegible] گورکھ دھندا نہیں ہے!"

تقریباً سب نے بیک آواز کہا "ایسا تو نہ کہیے، ذات پات تو بھگوان کی بنائی [illegible] چیز ہے! ذات پات نہ ہو تو دنیا قائم کیسے رہے؟ کون آدمی کس ذات میں پیدا ہو، بھگوان ہی فیصلہ کر سکتے ہیں؟"

"بھگوان یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کس روح کو انسان کا جنم دیں، اور پھر انسان [illegible] میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ جو گناہ کرے گا، اسے سزا ملے گی، خواہ وہ بادشاہ [illegible] برہمن، یا شودر، جو نیک کام کرے گا اسے بھگوان انعام دیں گے۔ خواہ وہ کسی [illegible] سے تعلق رکھتا ہو۔ ہمارے رسولؐ نے اپنی چہیتی بیٹی فاطمہؓ سے کہا تھا کہ خدا کے [illegible] اچھے عمل کی پوچھ ہو گی، نبیؐ کی بیٹی ہونا کام نہیں آئے گا، ایک مرتبہ جب ایک [illegible] کے لیے سزا کا حکم صادر فرمایا تو بعض لوگوں نے سفارش کی، آپؐ نے فرمایا "اگر میری بیٹی بھی چوری کرے تو اسے بھی سزا ملے گی!" اور پھر فرمایا "پچھلی قومیں اور امتیں اسی لیے برباد ہوئیں کہ وہ انسان میں بڑے اور چھوٹے کا فرق ملحوظ رکھتی تھیں!"

یہ عجیب تر باتیں سن کر ان لوگوں پر گومگو کی کیفیت طاری ہو گئی۔ احمد خاں نے

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"انسان کس خاندان میں پیدا ہو، یہ اس کے بس کی چیز نہیں، کس ملک میں پیدا ہو یہ بھی اس کے اختیار میں نہیں، لہٰذا اگر کسی انسان کو اس لیے برا سمجھا جائے کہ وہ فلاں خاندان میں اور فلاں ملک میں پیدا ہوا تو گویا خدا کے کام کو برا سمجھا جاتا ہے، خدا پر اعتراض کیا جاتا ہے ——"

"ہائے رام، یہ تو بہت بڑا پاپ ہے۔ بھلا بھگوان کے بھی کسی کام کو برا کہا جا سکتا ہے؟"

رگھو نندن نے کہا۔

"لیکن تم لوگ تو کہتے ہو؟" احمد خاں نے کہا "انسان جس خاندان، اور جس ملک میں بھی پیدا ہو، اس سے کوئی بحث نہیں، سوال صرف یہ ہے کہ وہ کیسا ہے؟ اس کے عمل کیسے ہیں اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے ساتھ اس کا طرز عمل کیا ہے؟ وہ ظلم کرتا ہے یا انصاف؟ وہ مظلوم کا ساتھ دیتا ہے یا ظالم کا؟ وہ غریبوں کے دکھ پر کڑھتا ہے یا ان کا اور ان کی بے کسی کا مذاق اڑاتا ہے، وہ اپنی کمائی، اپنی پونجی، اپنی دولت خدا کے راستے میں، نیکی اور بھلائی کی راہ میں خرچ کرتا ہے یا نہیں؟ —— یہ ہیں وہ چیزیں جن کو پیش نظر رکھ کر انسان کے بارے میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کیسا ہے؟ اچھا یا برا؟ اونچا یا نیچا؟ بڑا یا چھوٹا؟ اس سے کچھ نہیں ہوتا کہ اس کا خاندان اور ملک کیا ہے؟"

بات ان لوگوں کے دل میں بیٹھ گئی۔ ان کے چہروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ گو اقرار نہ کریں لیکن ان کے دل نے اس سچائی کو قبول کر لیا ہے، احمد خاں نے رگھو نندن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"میں تمہیں اپنا مدعا ایک مثال سے سمجھاتا ہوں!"

سب ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئے۔

احمد خاں نے سوال کیا "جانتے ہو انسان میں اور جانور میں کیا فرق ہے؟"

رگھونندن نے جواب دیا "انسان انسان ہے اور جانور جانور!"

احمد خاں ہنسنے لگا اس نے کہا

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن ان میں فرق کیا ہے یہ میں بتاتا ہوں؟"

سب متوجہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے، اس نے کہا،

"جانور اپنی فطرت اور عادت نہیں بدل سکتا، سانپ جب موقعہ پائے گا ڈسے گا، بچھو ڈنک مارے بغیر نہیں رہے گا، گھوڑے سے اور کتے سے وفاداری نہیں چھینی جا سکتی — لیکن انسان، اپنی فطرت اور عادت بدل سکتا ہے، تمہاری نظر سے ایسے کئی آدمی گزرے ہوں گے جو چور تھے، مگر شریف بن گئے، جو ظالم تھے مگر رحم دل بن گئے، جو خدا کے بندوں کو ستاتے تھے، مگر پھر ایسے بدلے کہ ساری زندگی ان کی خدمت کے لیے وقف کر دی، جو غدار تھے مگر وفادار بن گئے، بزدل تھے، بہادر بن گئے، اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ کیا یہ نہیں ثابت ہوتا کہ انسان اپنی فطرت اور عادت بدل سکتا ہے، اگر برا ہو تو کوشش کر کے اچھا بن سکتا ہے، اچھا ہو تو بری صحبت میں برا بن سکتا ہے، تو جب ہر انسان کا بننا اور بگڑنا اس کے ہاتھ میں ہے، اس کے اختیار میں ہے اور اس میں کسی ملک یا خاندان کی تخصیص نہیں، تو پھر ساری ذمہ داری خود اس پر ہے چاہے جیسا بن جائے!"

رگھونندن نے سوال کیا:

"تو پھر یہ ذات پات، اونچ نیچ، برہمن اور شودر سب بیکار؟"

آنند نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا "بے وقوف کہیں کا اب تک نہیں سمجھا"

راجو نے بھی آنند کی تائید کی اور احمد خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"اتنی دیر سے یہ بیچارے سر کھپا رہے ہیں مگر تمہاری بدھی (عقل) میں کچھ نہیں آیا، ہمیشہ کے گھامڑ (کودن) ہو، کیا مجال ہے جو ایک دفعہ میں بات سمجھ سکو! آنند کی سمجھ میں بات آگئی مگر یہ اب تک پوچھے جا رہے ہیں —

رگھونندن نے جل کر کہا "تو سب کچھ سمجھ گئی اچھی طرح؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی "اور نہیں کیا تمہاری طرح؟"

رگھونندن اور چڑ گیا،

"میری طرح؟ کیا میں بے وقوف ہوں؟" وہ اٹھلاتی ہوئی بولی،

"نہیں بڑے عقلمند؟"

"آخر تو سمجھتی کیا ہے مجھے؟"

"جانتے تو ہو، خود ہی ابھی کہہ رہے تھے،

"دیکھو پھر مجھے غصہ آجائے گا؟"

"اے ہے جیسے مجھے غصہ آتا ہی نہیں"

"کہے دیتا ہوں، میں بہت برا آدمی ہوں"

"پھر بھی نباہ کئے جا رہی ہوں —

"برے آدمی سے؟"

"ہاں — اور نہیں تو کیا!"

آنند بول پڑا،

"میرے بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ مسکراتی ہوئی کہنے لگی،

"پہلے ہی بتا چکی ہوں"

رگھو ہنس پڑا، اور کہنے لگا،

"ہاں کہہ تو رہی تھی "آنند کی سمجھ میں بات آگئی تم اب تک پوچھے جا رہے ہو — گویا آنند جیسے احمق نے تو سمجھ لیا، مگر مجھ جیسا عقلمند کٹ حجتی کرنے لگا؟"

آنند کو ہنسی آگئی،

"راجو سنا کچھ؟ — یہ حضرت بڑے افلاطون ہیں" وہ شوخ نظروں سے رگھو کو گھورتی ہوئی بولی،

"یہی نہیں — تم بھی!"

اور پھر سب ایک ساتھ ہنس پڑے — احمد خاں بھی۔

اس کے بعد بڑی دیر تک یہ لوگ ہنستے بولتے رہے، اور دلچسپ باتوں میں مشغول رہے، یکایک راجو اٹھ کھڑی ہوئی،

"اب تم لوگ کب تک ان (احمد خاں) کا دماغ چاٹو گے، آرام بھی تو کرنے دو!

وہ اٹھی اس کے پیچھے پیچھے رگھو اور آنند بھی چل دیئے۔

درِ زنداں

○

(۱)

نیا اوتار

یوں تو پرانے راج بھون میں جتنے لوگ بھی نگہبانی پر مامور تھے، سب کا برتاؤ احمد خاں سے اس کے سبھاؤ، شرافت اور جذبۂ خدمت کے باعث بہت عمدہ تھا لیکن رگھو نندن، آنند، اور راجو کے دل میں اس کی عقیدت پیدا ہو چکی تھی، یہ لوگ دلی اسے اوتار سمجھتے تھے، گھنٹوں اور پہروں اس کے پاس بیٹھے اس کی باتیں سنتے رہتے اور اس انہماک و استغراق سے سنتے جیسے ان باتوں میں کوئی ایسا پیام ہے جو براہ راست ان کی روح کو متاثر کر رہا ہے، وہ اوہام، اور وہ خیالات و عقائد جو صدیوں اور پشتوں سے دلوں میں رچے اور بسے ہوئے تھے احمد خاں کی چند باتوں میں نقش باطل ثابت ہوتے تھے، اور اس نئے عقیدے کو یہ بڑی خوشی اور اطمینان قلب کے ساتھ قبول کر لیتے تھے۔

ابھی تک احمد خاں کے بارے میں مہاراجہ یا حکومت راجہ کی طرف سے کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ اس کی حیثیت صرف ایک زیر نگرانی قیدی کی تھی، لیکن انجام کیا ہوگا، یہ معاملہ کیسے سب کو معلوم تھا، جہاں تک احمد خاں کا تعلق تھا، اسے تو انجام کی فکر نہیں تھی لیکن رگھو نندن، راجو اور آنند بہت فکر مند تھے، وہ آپس میں اکثر اس معاملہ پر تبادلۂ خیال کیا کرتے، وہ چاہتے تھے احمد خاں کو کسی طرح کا گزند نہ پہنچے لیکن یہ۔

" راجو سنا کچھ ؟ — یہ حضرت بڑے افلاطون ہیں " وہ شوخ نظروں سے رگھو کو گھورتی ہوئی بولی ،

" یہی نہیں — تم بھی ! "

اور پھر سب ایک ساتھ ہنس پڑے — احمد خاں بھی ۔

اس کے بعد بڑی دیر تک یہ لوگ ہنستے بولتے رہے ، اور دلچسپ باتوں میں مشغول رہے ، یکایک راجو اٹھ کھڑی ہوئی ،

" اب تم لوگ کب تک ان (احمد خاں) کا دماغ چاٹو گے ، آرام بھی تو کرنے دو !

وہ اٹھی اس کے پیچھے پیچھے رگھو اور آنند بھی چل دیئے ۔

درِ زنداں

○

(۱)

نیا اوتار

یوں تو پرانے راج بھون میں جتنے لوگ بھی نگہبانی پر مامور تھے، سب کا برتاؤ احمد خاں سے اس کے سجاؤ، شرافت اور جذبۂ خدمت کے باعث بہت عمدہ تھا لیکن رگھوندن، آنند، اور راجو کے دل میں اس کی عقیدت پیدا ہو چکی تھی، یہ لوگ واقعی اسے اوتار سمجھتے تھے۔ گھنٹوں اور پہروں اس کے پاس بیٹھے اس کی باتیں سنتے رہتے اور اس انہماک و استغراق سے سنتے جیسے ان باتوں میں کوئی ایسا پیام ہے جو راہ راست ان کی روح کو متاثر کر رہا ہے، وہ اوہام، اور وہ خیالات و عقائد جو صدیوں اور پشتوں سے دلوں میں رچے اور بسے ہوئے تھے احمد خاں کی چند باتوں میں نقش باطل ثابت ہوئے تھے، اور اس نئے عقیدے کو یہ بڑی خوشی اور اطمینان قلب کے ساتھ قبول کر لیتے تھے۔

ابھی تک احمد خاں کے بارے میں مہاراجا یا ہمت رائے کی طرف سے کوئی حکم نہیں آیا تھا۔ اس کی حیثیت صرف ایک زیر نگرانی قیدی کی تھی، لیکن انجام کیا ہوگا، یہ جوگن سمیت سب کو معلوم تھا، جہاں تک احمد خاں کا تعلق تھا، اسے تو انجام کی فکر نہیں تھی لیکن رگھوندن، راجو اور آنند بہت فکر مند تھے، وہ آپس میں اکثر اس مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا کرتے، وہ چاہتے تھے احمد خاں کو کسی طرح کا گزند نہ پہنچے لیکن یہ

خواہش کس طرح پوری ہو، کسی طرح اس کی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

ایک روز باتوں باتوں میں رگھو نندن نے آنند سے تشویش انگیز لہجہ میں کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی نئی بات ہونے والی ہے!"

آنند نے سراپا اشتیاق بن کر سوال کیا۔

"کیا خاں صاحب کے بارے میں؟"

رگھو نندن نے جواب دیا "ہاں کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے!"

راجو بول پڑی "شاید انھوں نے فیصلہ کر لیا ہے کچھ ان کے بارے میں، لیکن ایک بات سن لو کان کھول کر، فیصلہ اگر یہ ہے کہ خاں صاحب قتل کر دیئے جائیں تو اس پر عمل درآمد اس وقت ہونا چاہیے، جب تم مرجکو، خاں صاحب کا تم پر جو حق ہے اگر شریف ہو تو اسے نہ بھولنا۔

رگھو نندن نے راجو کو محبت بھری نظروں سے گھورا اور کہا:

"اری میں تجھ سے زیادہ جانتا ہوں کہ مجھے ایسے موقع پر کیا کرنا چاہیے!"

آنند نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا "لیکن بات کیا ہے یہ تو ابھی تک تم نے بتایا نہیں!"

رگھو نندن نے بتایا "آج ہمت رائے نے مجھے بلایا تھا، بہت بگڑا ہوا تھا، جو نام زبان پر جب آتا تھا تو نتھنے پھول جاتے تھے اور منہ سے جھاگ اڑنے لگتا، کہنے لگا:

"قیدی کا کیا حال ہے؟"

میں نے کہا "ٹھیک ہے، آرام سے ہے!"

بس یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا "آرام سے ہے؟ وہ آرام کرنے کے لیے ہے وہاں؟ وہ اب زندہ نہیں رہ سکتا، وہ قتل ہوگا۔ اس کی ہڈیاں پسلیاں ...

جائیں گی، اس کا نام ونشان تک کسی کو نہیں ملے گا۔ وہ انسان کے روپ میں شیطان ہے۔ بہت جلدی وقت آنے والا ہے جب اس کی گردن میں اپنے ہاتھ سے، اپنی تلوار سے کاٹوں گا!

راجو چمک کر بولی "اسے ہے بڑا آیا موا ہمارے خاں صاحب کی گردن کاٹنے والا میرا بس چلے تو اس کی گردن مروڑ دوں چڑیا کی طرح!"

آنند کو یہ مداخلت ناگوار گزری! اس نے راجو سے کہا "چپ رہو!" پھر رگھو نندن سے پوچھا:

"آگے؟ — پھر کیا کہا اس نے؟"

رگھو نندن نے بتایا "یہ باتیں کرتے کرتے دفعتہً وہ رک گیا۔ خاموش ہو گیا، جیسے کچھ سوچ رہا ہو، پھر ٹہلنے لگا، ٹہلتے ٹہلتے ایک مرتبہ بالکل میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا، اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا ہوا:

"رگھو نندن، مجھے تم پر بہت بھروسہ ہے، تم میرے خاص آدمی ہو، میں تم سے ایک بہت اہم کام لینا چاہتا ہوں، کیا کرو گے؟"

میں سوچنے لگا، کہیں یہ نہ کہہ دے کہ جاؤ خاں صاحب کی گردن اتار لاؤ جا کر، میں نے یہ فیصلہ کر لیا اگر یہ کہا، تو کیا کروں گا، لیکن دل کی بات دل ہی میں رکھی اور جواب دیا:

"آپ کے ہر حکم کو بجا لانا میرا فرض ہے، حکم دیجئے تو سہی، فرمائیے تو سہی!"

ایک مرتبہ پھر آزمائشی نظر سے اس نے مجھے گھورا، پھر کچھ جھجکتے ہوئے کہنے لگا:

"میرا ایک دشمن ہے، بڑا کٹر دشمن، وہ کمینہ ہے، احسان فراموش ہے۔ غدار ہے نمک حرام ہے، اس نے مجھے دھوکا دیا، اس نے میرے ساتھ فریب کیا، اس نے دغا کی مجھ سے، میں اس کے خون کا پیاسا ہوں، وہ میرے قبضہ میں ہے، چاہوں تو ابھی، اور ابھی اسے قتل کر دوں، لیکن میں اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ

وہ سسک سسک کر جان دے ، کچھ عرصہ تک ابھی اذیتیں دی جائیں کہ اس کی روح
لرز اٹھے ، پھر اسے ماروں ، اور یہ کام تمہاری مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا ۔"

بھیا آنند میں بڑا پریشان ہوا ، سوچنے لگا ، نہ جانے وہ کون بدقسمت ہے جس کی
جان لینے کی یہ تیاری کر رہا ہے ۔ بہرحال میں نے کہا :

" جو حکم ہو ، میرا کام تو تعمیل کرنا ہے ۔"

یہ سن کر خوش ہو گیا ، کہنے لگا :

" وہ میرا دشمن ، احمد خاں کا اور احمد خاں اس کا دوست ہے ، اسے بھی میں پرانے
راج بھون میں کچھ دنوں کے لیے قیدی بنا کر رکھنا چاہتا ہوں تاکہ وہ احمد خاں کو یہاں
دیکھ کر تڑپے ، اور احمد خاں صاحب اس کی درگت دیکھ کر کانپیں ، اور پھر ایک دن
وہ دن زیادہ دور نہیں ہے ، دونوں کا ایک ساتھ خاتمہ کر دیا جائے ۔"

میں نے کہا " جو کچھ آپ کی رضا ہے وہی ہوگا ، بتائیے کہاں ہے وہ آپ کا دشمن
میں ابھی زنجیروں میں جکڑ کر اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں ، اور اسے اس کمرے میں
جو احمد خاں سے بالکل ملا ہوا ہے ۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھیں گے لیکن مل نہ سکیں گے
دونوں ایک دوسرے کی فریاد سنیں گے لیکن مدد نہ کر سکیں گے ، دونوں ایک دوسرے کے
حال پر کڑھیں گے ، لیکن اشک حسرت بہانے کے سوا کچھ نہ کر سکیں گے ۔"

ہمت رائے سے تو میں نے یہ باتیں کہیں لیکن دل میں فیصلہ کر لیا کہ اسے ہرگز کسی
کی تکلیف نہ ہونے دوں گا ۔

آنند کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہنے لگا ۔

" ہاں بھئی ، ہم تو خاں صاحب کے پجاری ہیں ، جو ان کا دوست وہ ہمارا دوست
جو ان کا دشمن وہ ہمارا دشمن ۔"

راجو بول پڑی " جو خاں صاحب کا دوست ہوگا وہ برا آدمی ہو ہی نہیں سکتا ۔"

بھلا کسی برے آدمی سے دوستی کر سکتے ہیں ؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ۔" ــــ وہ ہمارا مہمان ہوگا ۔"
آنند نے تائید کی " ہاں وہ ہمارا مہمان ہوگا ، ہم اس کی سیوا کریں گے ، اسے ہر طرح کا
سکھ پہنچائیں گے ۔"

راجو بولی " اور نہیں تو کیا ــــ لیکن وہ ہے کون ؟ ہے کہاں ؟"

گھونڈن نے ہنستے ہوئے کہا " سنو تو ، تم لوگوں نے تو بیچ ہی میں بولنا شروع کر دیا
ــــ میری یہ باتیں سن کر ہمت رائے بہت خوش ہوا ، بہت شاباش دی اس نے مجھے
انعام و اکرام کا بھی وعدہ کیا پھر کہنے لگا :

" لیکن دیکھو ، اس بات کا خیال رکھنا کہ اس نئے قیدی کی خبر راج بھون کے قلعہ سے
باہر نہ جانے پائے ۔"

میں نے کہا " میرے حضور ایسا ہی ہوگا ، لیکن وہ نیا قیدی آپ کے کس الو پٹھے میں
چھپا رکھا ہے ، اس کی زیارت تو کرائیے میں تو اس کے درشن کے لیے بیتاب ہو رہا ہوں ۔"

ہمت رائے نے جواب دیا " ہاں تم اس کے درشن کرو گے لیکن ابھی نہیں ۔ میں تمہارا
انتظار کروں گا ۔ ٹھیک بارہ بجے رات کو یہاں آجاؤ ۔ قیدی تمہارے حوالہ کر دیا جائے گا ۔
کام ٹھیک وقت پر پہنچ جاؤ گے ؟"

میں نے اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا " ضرور پہنچ جاؤں گا ــــ تو بھائی آج
بارہ بجے رات کو جانا ہے ؟"

آنند نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا " لیکن وہ کون شخص ہے ؟"

گھونڈن نے مسکراتے ہوئے کہا

" یہ ایک بجے رات کو پوچھنا ۔"

---

(۲)

رانی کی گرفتاری

"اور واقعی ایک بجے رات کو رگھو نندن اس نئے قیدی کو لے کر راج بھون پہنچا۔
لیکن یہ قیدی کوئی مرد نہ تھا عورت تھی —— رانی!
جو سپاہی رانی کی تلاش میں گئے تھے، وہ ناکام لوٹ آئے۔ اسے گرفتار نہ کر سکے
لیکن تگ و دو اور تلاش و جستجو کا سلسلہ جاری رہا اور آخر ایک دن، ایک ویران سا
پر ایک مندر میں رانی پوجا کرتی ہوئی مل گئی!

اسے فوراً گرفتار کر لیا گیا اور ہمت رائے کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔
رانی کو دیکھ کر ہمت رائے کا خون کھولنے لگا۔ اس نے نفرت بھری نظروں سے
اس کی طرف دیکھا اور کہا:

"دیکھ لیا تو نے؟ —— تو بھاگ کر کہیں نہیں جا سکی۔ آخر گرفتار ہو کر پھر وہیں آ گئی
جہاں سے بھاگی تھی!"

رانی نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش کھڑی رہی لیکن ہمت رائے کا طوفان تھم نہ سکا
اس نے اپنی چھڑی سے اس کی کمر میں کچو کا لگاتے ہوئے کہا:
"تو چپ کیوں ہے؟ بولتی کیوں نہیں؟ کیا گونگی ہو گئی ہے؟ —— تو اگر پاتال

میں بھی جاتی تو میں گرفتار کرائے بغیر نہ رہتا۔"

رانی نے وقار، اور سنجیدگی کے ساتھ کہا:

"میں ایک مرتبہ پھر وہیں لے آئی گئی جہاں سے بھاگی تھی، لیکن میں پوچھتی ہوں تو کیوں میرے پیچھے پڑا ہے؟ کیوں نہیں مجھے چھوڑ دیتا؟ میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟ کیا جرم ہے میرا؟"

ہمت رائے نے کہا "تیرا جرم یہ تھا کہ تو حسین تھی، خوب رو تھی، تو نے میرے دل کو جیت لیا تھا۔ میں نے چاہا تھا کہ تجھے وہ مرتبہ دوں جس کا تو خواب و خیال میں بھی تصور نہیں کر سکی تھی۔ تجھے اپنے دل کی ملکہ بناؤں، اور ساری زندگی تیرا محکوم بن کر رہوں، لیکن —— لیکن تو نے میری محبت ٹھکرا دی میری محبت کی تو نے قدر نہ کی، تو احسان فراموش ہے غدار ہے، غدار ہے ——"

رانی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:

"تجھے کیا حق تھا کہ مجھ سے محبت کرتا؟ مجھے اغوا کرتا؟ میرے خاندان کو ذلیل و رسوا کرتا؟ میری خوشیوں کو چھینتا اور میری آرزوؤں کا گھروندا پاؤں تلے روند ڈالتا؟"

"گھروندا اسی لیے ہوتا ہے کہ پاؤں تلے روند دیا جائے!"

"ہاں ظالم لوگ اسی طرح سوچتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ جس گھروندے کو وہ پاؤں تلے روندتے ہیں وہ کسی کی دنیا ہے، کسی کی زندگی ہے، کسی کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز ہے!"

"اور اب تک تو اسی حسرت میں مر رہی ہے؟"

"ہاں —— یہ حسرت تو زندگی کے ساتھ ہے۔"

"لیکن جس سے تو محبت کرتی تھی اسے تو میں نے جہنم میں پہنچا دیا!"

"مگر تو میری محبت نہیں چھین سکا!"

(انتہائی برہمی کے عالم میں) "یہ تو میرے سامنے کہہ رہی ہے؟"

"جو بات میں پرماتما کے سامنے کہہ سکتی ہوں اور ہمیشہ کہتی رہی ہوں وہ تیرے سامنے کیوں نہیں کہہ سکتی !"

"میں تیری زبان کاٹ سکتا ہوں ، میں تیری گردن قطع کر سکتا ہوں ، میں تجھے اس طرح فنا کر سکتا ہوں جس طرح پانی کا بلبلہ ذرا سے اشارے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا کر دیا جاتا ہے۔"

"تو یہ سب کچھ کر سکتا ہے لیکن میری رُوح کو فنا نہیں کر سکتا !"

"تیرے فنا ہونے کے بعد روح بھی فنا ہو جائے گی ۔"

"نہیں ، وہ کبھی نہیں مرتی ، اس پر کسی کا حکم نہیں چلتا ۔"

"رانی میں تجھے ایک آخری موقعہ دیتا ہوں ، عقل سے کام لے ، اپنے ساتھ دشمنی نہ کر میں اب بھی تیری خطائیں ، تیری بے وفائیاں ، تیری نمک حرامیاں معاف کر دینے کو تیار ہوں ، بشرطیکہ تو وعدہ کرے کہ اب کبھی بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گی ۔ میری خواہش کا احترام کرے گی اور میری پابند بن کر زندگی گزارے گی ——— کیا تو وعدہ کرتی ہے ؟"

"نہیں ——— میں جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتی !"

"ایک مرتبہ پھر موقعہ دیتا ہوں خوب غور کر لے ۔"

"میں نے جو کچھ کہا ہے خوب سوچ سمجھ کر کہا ہے !"

"اس کے معنی یہ ہیں کہ تو کسی سے محبت کرتی ہے ۔"

"جس سے محبت کرتی تھی ، اسے تو نے مار ڈالا ، اب کون ہے جس سے محبت کروں گی اب تو صرف نفرت ہی کر سکتی ہوں اور بے شک مجھے تجھ سے انتہائی نفرت ہے ۔ جب تجھ پر نظر پڑتی ہے تو مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اندھی کیوں نہ ہوئی ؟ جب تیری باتیں سنتی ہوں تو حسرت ہوتی ہے کہ کاش بہری ہوتی ۔ جب تجھ سے چار و ناچار باتیں کرنی پڑتی ہیں تو بھگوان سے دعا کرتی ہوں کہ مجھے گونگا بنا دے ۔ میں تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتی ۔ تیری باتیں سننا نہیں چاہتی ۔ تجھ سے بات کرتے ہوئے غیرت آتی ہے مجھے ۔"

"تو وہ یہ دم خم !"

"دم خم تو تیرے پاس ہے ، ایک مجبور اور بے بس قیدی کی طرح تیرے سامنے کھڑی ہوں !"

"میں سمجھ گیا تو محبت کرتی ہے !"

"کس سے ؟ ——— کیا تجھ سے ؟"

"نہیں ——— تو اس مسلمان سے محبت کرتی ہے جس نے اس روز جب تو بھاگی تھی تجھے تالاب سے نکالا تھا ، اور جس نے تجھے بھاگ جانے کا موقع دیا تھا ، ——— یقیناً تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو ؟"

یہ الفاظ سن کر رانی کا رنگ سرخ ہو گیا ، اس کے چہرے پر جلال کی کیفیت طاری ہوئی ، وہ خاموشی کے ساتھ دو قدم آگے بڑھی اور دفعتہً اس نے سمپت رائے کے رخسار پر زور سے ایک طمانچہ لگایا ، جس سے وہ ہل گیا ، پھر اس نے بڑے تیور کے ساتھ کہا ۔

"تو پاپی ہے ، اور دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتا ہے ——— بے شک میرے دل میں اس مسلمان کی عزت ہے ، ہاں میں اس سے محبت کرتی ہوں ، اس ساری مدت میں ایک لمحہ کے لیے بھی میں اسے فراموش نہیں کر سکی ۔ پاپ کی اس نگری میں جہاں زیادہ تر تجھ جیسے رہتے ہیں ، ایسے اوتار ، ایسے فرشتے ، ایسے نیک آدمی بھی مل جاتے ہیں جیسا وہ مسلمان تھا اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ایک غیر مذہب کی لڑکی کو ، ایک ایسی لڑکی کو جس سے نہ وہ واقف تھا ، نہ جسے اس نے دیکھا تھا ، ڈوبنے سے بچایا پھر جب تیرا ہجوم اس کی طرف بڑھ رہا تھا تو بڑی بہادری سے تیری کلائی مروڑ دی ، تو ایک بزدل کی طرح کچھ نہ کر سکا ، اس نے مجھے آزاد کر دیا ، اس نے صرف میری جان ہی نہیں بچائی ، دھرم بھی بچائی ، میں اسے کس طرح بھول سکتی ہوں ؟ بے شک وہ میری نس نس میں بسا ہوا ہے ، وہ میری رُوح میں سمایا ہوا ہے ، جاگتے میں اسی کا خواب دیکھتی ہوں ۔

سوتے میں ابھی کا چال دیکھتی ہوں، کتنی تمنا ہے مجھے کہ ایک مرتبہ وہ مل جائے، ایک مرتبہ، صرف ایک مرتبہ اسے پالوں ــــ"

"کیا کرے گی تو اسے پاکر؟"

"اس کے چرنوں پر سر رکھ دوں گی، اس کی پوجا کروں گی ــــ جیسے دیوتا کی پوجا کی جاتی ہے!"

"تو اس کے چرنوں پر سر رکھے گی؟"

"ہاں، ــــ اور اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھوں گی!"

"تو اس کی پوجا کرے گی؟"

"ہاں! ــــ وہ اسی لائق ہے!"

"تو ایک مسلمان کو، ایک ملیچھ کو، دیوتا اور اوتار سمجھتی ہے؟"

"وہ دیوتا ہی ہے"

"اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو تیرے منگیتر کا ہو چکا ہے!"

"ناگن کس پاپی چپ رہ!"

"چپ کیوں رہوں؟ میں اسے مار ڈالوں گا!"

"نہیں تو اسے نہیں مار سکتا، تو اس کی جان نہیں لے سکتا؟"

کیوں؟ کیوں نہیں ایسا کر سکتا؟"

"وہ تیرا دبیل نہیں ہے، تیرا محکوم نہیں ہے، تیری رعیت نہیں ہے، وہ تو اتنا بڑا آدمی ہے کہ تو خود جاکر اس کے پاؤں پکڑ لیا، اس کی خوشامد کرکے اسے اپنے ساتھ لایا تھا، تیری اور تیرے مہاراجا کی وہ مدد کرے، پھر تیرا ہاتھ اس تک کس طرح پہنچ سکتا ہے؟

"(قہقہہ لگاکر) وہ تو پہنچ چکا!"

"جھوٹ ــــ تو جھوٹا ہے!"

"لیکن اس وقت تو سچ بول رہا ہوں، وہ اب میرا قیدی ہے، بے شک میں اس کی منت کرکے، خوشامد کرکے اسے یہاں لایا تھا۔ مجھے اور مہاراجا کو اس کی مدد کی ضرورت بھی تھی لیکن اب ہم اس کی مدد سے بے نیاز ہیں، اب ہمیں اس کی امداد کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، وہ یہاں ایلچی بن کر آیا تھا۔ شاہی مہمان کی طرح چند روز رہا تھا، اور اب وہ پرانے راج بھون میں قید ہے اور بہت جلد مہاراجا کے حکم سے اس کی گردن اڑا دی جائے گی!"

"(افسردگی، اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں) تجھ جیسے بدفطرت، احسان فراموش، اور کم ظرف شخص سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ تیرا مہاراجا بھی ایسا ہی ہے۔ تم لوگ سب کچھ کر سکتے ہو کوئی پاپ ایسا نہیں جو تم نہ کر سکتے ہو، لیکن بھگوان کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں، جو آج کرو گے وہ کل بھرو گے!"

"جتنی بددعائیں چاہے دے لے، لیکن نہ تو بچ سکتی ہے نہ وہ!"

"مجھے اپنی ذرا بھی پروا نہیں ہے، ابھی وقت مار ڈال!"

"لیکن اس مسلمان کی پروا ہے؟"

"اس کی پروا، میں تو انسان ہوں بھگوان کو بھی ہو گی!"

"ممکن ہے ہو، لیکن اب اسے بھگوان بھی نہیں بچا سکتا"

رانی خاموش ہو گئی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمت رائے بھی کچھ دیر خاموش رہا پھر کہنے لگا،

"میں تجھے بھی اس کے پاس قید رکھوں گا، تاکہ وہ تیرا حال زار دیکھ کر کڑھے، اور تو اس کا حال زار دیکھ کر خون کے آنسو روئے، اور پھر ایک دن ــــ بس میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تجھے اس کے سامنے قتل کروں؟ یا اسے تیرے سامنے!"

بے ساختہ رانی کے منہ سے نکلا،

"میں اس کا قتل نہیں دیکھ سکوں گی، میرے لیے اس سے بڑھ کر فخر اور خوشی کی کوئی بات

نہیں کہ اس کے سامنے قتل کر دی جاؤں ؟

"واقعی ؟ — کیا سچ کہہ رہی ہے تو ؟"

"ہاں ، سوگند لے لے ، یہ میرے دل کی آرزو ہے !"

"لیکن افسوس تیری یہ آرزو پوری نہیں ہو سکتی - وہ تیرے سامنے قتل کیا جائے گا ، اور اس کے بعد تیری باری آئے گی " — لیکن تجھے مطمئن رہنا چاہیے کہ تیری باری نہ آئے گی

اس کے بعد ہمت رائے نے رانی کو ، اپنی شاندار حویلی کے ایک گوشہ میں قید کر دیا اور رگھونندن کو بلا کر ، اس کا نام لیے بغیر ، اس کام پر مامور کیا کہ وہ رانی کو لے جا کر راج بھون میں قید کر دے ، اور جتنی اذیتیں اس کے قلب نازک ، اور تن نازک کو پہنچا سکتا ہے پہنچائے

ٹھیک وقت پر — ۱۲ بجے رات کو — رگھونندن آیا ، اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہمت رائے کا یہ "کٹر" دشمن ، کوئی مرد ، کوئی سپاہی ، کوئی شہسوار نہیں ایک کمزور بے بس ، اور بے سہارا عورت ہے ، رانی اس کے لیے اجنبی نہ تھی - وہ رانی کو جانتا تھا ، جو کچھ اس پر بیت چکی تھی اس سے واقف تھا ، اپنے دل میں اس کے لیے ہمدردی اور ترس کا جذبہ بھی رکھتا تھا ، ا سے شروع سے اب تک ، تمام واقعات معلوم تھے - کچھ بطور خود ، کچھ احمد خاں کی زبانی ، لیکن ایک انجان شخص کی طرح اس نے رانی کو دیکھا کسی طرح کی حیرت کا اظہار نہیں کیا - خاموشی کے ساتھ اسے اپنی تحویل میں لیا اور نصف شب کے سناٹے میں پرانے راج بھون پہنچ گیا -

---

(۳)

نیا رشتہ

پرانے راج بھون کی یہ عمارت ایک قلعہ میں واقع تھی - اب یہ قلعہ بھی از کار رفتہ ہو چکا تھا اور راج بھون بھی - اب یہاں کوئی آبادی نہیں تھی ، سوا ان چند پہرے کے سپاہیوں کے جو یہاں حکومت کی طرف سے اس کام پر مامور تھے کہ سرکاری قیدیوں کی دیکھ بھال کریں ، اور یہ سرکاری قیدی کبھی کبھی آتے تھے ، ورنہ خالی زمانہ عیش و آرام ، بیکاری اور بے فکری میں گزرتا تھا -

آج کل بیکاری اور بے فکری کا زمانہ نہیں تھا ، ایک پر اسرار قیدی یہاں مقیم تھا ، اور اس کی زندگی کا فیصلہ جلد ہی ہونے والا تھا ، عملے کے سب لوگ بڑے چوکس رہتے تھے اور عملہ کے سربراہ ، رگھونندن اور آنند ، سب سے زیادہ ہوشیار اور مستعد رہتے تھے -

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی ، سارے قلعہ پر اور سارے راج بھون پر سناٹا چھایا ہوا تھا ، سب لوگ خواب راحت کے مزے لے رہے تھے - احمد خاں جن کمرے میں قید تھا وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا ، لہٰذا پہرے داروں کو بھی اطمینان تھا جو قیدی آئے تھے ان کے بارے میں تو یہ دھڑکا رہتا تھا کہیں انھیں رہا کرانے کی کوشش نہ کی جائے ان کے حامیوں کی طرف سے ، یا یہ خود بھاگ جانے کی تدبیر نہ کریں ، لیکن یہ

پرولیکا قیدی ـــ یہ بھاگ کر کہاں جا سکتا تھا ؟ اور اسے چھڑانے کے لیے کون حملہ کر سکتا تھا ؟ اور یہ خود بھی اپنی اس قید پر اتنا قانع تھا کہ یہ تک اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ قید اسے ناگوار گزر رہی ہے ۔ اس یکسوئی ، اطمینان اور سکون قلب کے ساتھ اپنے معمولات ادا کرتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ، اس نے ساری زندگی اسی ویرانے میں بسر کی ہے ، اور ساری زندگی یہیں بسر کرے گا ، یہ یہیں پیدا ہوا ہے ، اور یہیں آسودۂ خاک ہوگا ، یہ وجہ بھی تھی اس کی طرف سے بے فکر ہو جانے کی ، اور پھر رگھونندن کے ساتھ اس نے جو کچھ کیا تھا ، اور آنند و رگھونندن کا جو برتاؤ اس کے ساتھ تھا اس کے بعد بھی اس کے بارے میں کوئی خطرہ کسی پہرے دار کے دل میں نہیں گزرتا تھا ۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کی نیند سو رہا تھا ۔ اس کے کمرے سے متصل ایک اور کمرہ تھا جو اب تک بند رہا کرتا تھا ، مگر آج آباد تھا ـــ رانی یہیں لا کر قید کی گئی تھی ۔

رانی نے اس کمرے کے گھٹے گھٹے سے ماحول پر ایک نظر ڈالی اور رگھو سے پوچھا :

" کیا وہ مسلمان قیدی بھی یہیں کہیں قید ہے ؟ "

رگھو نے سامنے کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا :

" جی ہاں یہاں ـــ "

رانی نے پھر سوال کیا " کیا واقعی ان لوگوں نے اسے قتل کروا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے ؟ "

وہ بولا " سُنا تو میں نے بھی ایسا ہی ہے ، آگے بھگوان جانیں ـ"

رانی نے ایک حقارت کی نظر رگھو پر ڈالی ، اور پھر گویا ہوئی :

" کتنے کمظرف ، کتنے ظالم ، اور کتنے تنگ دل ہو تم لوگ ! ـــ بھلا اس غریب نے تمہارا کیا بگاڑا ہے ؟ کیوں تم سب اس کی جان کے پیچھے پڑ گئے ہو ۔ کیوں ایک بے گناہ کی جان لینا چاہتے ہو ؟ کیا مل جائے گا تمہیں ایسا پاپ کر کے ؟ ـــ

ـــ کیا یہ مہاپاپ نہیں ہے ؟ "

رگھو کو رانی کی باتوں میں لطف آ رہا تھا ، وہ اس کے جذبۂ نہاں کو کچھ کچھ محسوس کرنے لگا تھا اس نے کہا :

" یہ تو ٹھیک ہے ، لیکن راج نیتی بھی تو کوئی چیز ہے ـــ "

رانی نے بھڑک کر کہا " کیا بکتے ہو ؟ ـــ تم نہیں جانتے یہ شخص جو اس کمرے میں بند ہے ، کتنا اونچا کتنا اچھا آدمی ہے ـــ "

رگھو نے انجان بن کر کہا " ہوگا ، ہم کیا جانیں ؟ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ راج کا دشمن ہے ! "

وہ جوش کے عالم میں بولی " نہیں وہ کسی کا بھی دشمن نہیں ہے ، نہ کسی انسان کا نہ کسی راج کا ۔ یہ تمت رائے ، یہ ظالم ، یہ فریبی شخص جھوٹا ہے بالکل ! "

رگھونندن نے پھر وہی مختصر سا جواب دیا " ہوگا "

رانی نے ایک نظر رگھونندن کے سراپا پر ڈالی ، پھر بڑی ملائمت کے ساتھ پوچھا :

" کیا تمہیں کچھ فرصت ہے ؟ "

" حکم دیجئے ، فرصت نکل ہی آئے گی "

" میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں ـــ تمہارے فائدے کی ـــ "

" فائدہ ہو یا نقصان ، سن لینے میں کیا حرج ہے ، کہیے سن رہا ہوں ! اور عورت کا ویسے بھی احترام کرنا چاہیے "

" کیا تمہارا یہی خیال ہے ؟ "

" بے شک ہے ، کیا میری ماں نہیں ہے ؟ بہن نہیں ہے ؟ بیوی نہیں ہے ؟ یہ سب عورت ہی نہیں ہیں ؟ کیا ان سب کا میں احترام نہیں کرتا ؟ "

بے ساختہ رانی کے منہ سے نکلا " پھر تو تم بڑے اچھے آدمی ہو ، اچھا تباؤ تو سہی

کتنی بہنیں ہیں تمہاری ؟"

رگھونندن نے جواب دیا :

" صرف دو ـــ لیکن مجھے بڑا پیار ہے ان دونوں سے !"

رانی نے التجا کے ساتھ ایک جذبہ کے عالم میں کہا :

" کیا تم مجھے اپنی بہن بنانے کو تیار ہو ؟ ـــ تمہیں اپنی ان دونوں بہنوں سے بہت پیار ہے ، لیکن تمہاری یہ تیسری بہن تم پر اپنی جان بھی قربان کر دینے سے دریغ نہ کرے گی !"

یہ باتیں رگھو کے دل پر اثر کر گئیں ، ویسے بھی وہ رانی کے دل دوز اور جگر فگار حالات سے باخبر تھا ۔ احمد خاں سے بھی سارا ماجرا سن چکا تھا اور اس وقت جو اثر اس کے اور ہمت رائے کے مابین پیش آئے تھے ان سے بھی باخبر تھا ۔ اس نے ایک تاثر کے ساتھ کہا :

" بے شک میں تمہیں اپنی بہن سمجھتا ہوں ! ایک بہن ایک بھائی سے جو توقع کر سکتی ہے ، وہی تم مجھ سے بھی کر سکتی ہو ۔ بتاؤ کیا کہنا ہے تمہیں ؟"

کچھ دیر تک رانی خاموش رہی ، پھر اس نے کہا :

" بتاؤ تو سہی میرے بدن پر کتنے زیورات ہیں ؟"

رگھونندن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ، اور جواب دیا :

" کافی ہیں ، ـــ لیکن اس سوال کا مطلب ؟"

وہ پوچھنے لگی ، " اچھا یہ بتاؤ ان کی مالیت کیا ہوگی ؟"

اس سوال پر رگھونندن اور زیادہ چونکتا ہوا ، اس نے کہا :

" کئی ہزار کے ہوں گے ، لیکن یہ کیوں پوچھ رہی ہو تم ؟"

وہ بولی ، " یہ سب کچھ میں تمہیں دے دوں گی ، اگر میری ایک بات مان

فوراً ترش رو ہو کر رگھونندن نے جواب دیا ۔

" بہن بھی بنتی ہو ، بھائی بھی کہتی ہو اور رشوت بھی دیتی ہو ـــ یہ کیا ؟"

وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی اس نے کہا :

" یہ ایک مرنے والی بہن کا تحفہ ہے !"

" مرنے والی بہن کا ؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم ؟"

" ہاں ، میں مر جاؤں گی کسی طرح بھی زندہ رہنا مجھے منظور نہیں ہے ، زہر نہ ملا تو سر پھوڑ لوں گی ، سر بھی نہ پھوڑ سکی ، تو کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں گی ۔ یہ بھی نہ کر سکی تو کوئی اور جتن کروں گی ، مگر اس ہتھیارے ہمت رائے کے ہاتھ نہ آؤں گی اس کی ہوس کا نشانہ بننے کو میں کسی قیمت پر تیار نہیں ہو سکتی ! ـــ پھر اگر مرنے سے پہلے اپنا سب کچھ تمہیں دیتی ہوں ، تو کیا برا کرتی ہوں ؟ خفا کیوں ہو گئے تم ؟"

ان باتوں سے رگھونندن کا دل اور پگھل گیا ۔ اس نے کہا :

" کیا تم بھگوان پر بھروسہ نہیں کرتیں ؟"

وہ ایک مجنونانہ قہقہہ لگاتی ہوئی بولی :

" بھگوان پر بھروسہ کر کے کیا پا لوں گی ؟ ـــ دو دفعہ اس پر بھروسہ کر کے اپنی لاج بچا کر بھاگی ، مگر پکڑی گئی اور پھر اس کے قدموں پر لا کر ڈال دی گئی ۔ جو میری آبرو کا محافظ تھا ؟ اور میں تو میں یہ بے چارہ مسلمان ، جو اس کمرے میں قید ہے ، اس تک پر بھگوان نے رحم نہیں کیا ـــ جانتے ہو اس کا جرم کیا ہے ؟"

رگھونندن نے بڑی سادگی کے ساتھ کہا :

" میں نہیں جانتا ـــ کیا تمہیں معلوم ہے ؟"

وہ بولی " ہاں ـــ اس کا جرم یہ ہے کہ اس نے ایک دکھیاری عورت کی مدد کی تھی ، اس نے ایک پاپی کو ظلم کرنے سے روکا تھا ـــ وہ عورت میں تھی ۔ وہ

پاپی ہمت والے تھا "

اور یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ، رگھو نندن کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں ۔ اس نے کہا :

" چپ رہو رانی ، مصیبت کے بادل چھٹ جائیں گے ۔ آدمی بیمار پڑتا ہے لیکن تندرست ہو جاتا ہے ، بادل گھر گھر کر آتے ہیں لیکن پھر دھوپ نکلتی ہے ، رات کی تاریکی اپنے وقت پر ختم ہو جاتی ہے اور سورج پھر چمکنے لگتا ہے ۔ تمہاری مصیبت بھی ختم ہو گی ! "

رانی نے آنسو پونچھ لیے اور کہنے لگی :

" میں اور کچھ نہیں چاہتی ، ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں ، ہر ظلم سہ لوں گی ، مگر یہ چاہتی کہ اس شریف آدمی کا بال بیکا ہو ۔ تم اسے بچا لو ! "

رگھو نندن اس کی تکلیف سمجھ گیا ۔ لیکن اس نے پوچھا :

" یہ کس طرح ہو سکتا ہے ؟ "

وہ بولی ، " اسے کسی طرح چپ چپاتا رات کے سناٹے میں بھگا دو یہاں سے یہ بڑا بہادر ، بڑا جیالا ، بڑا نڈر ہے ۔ ایک مرتبہ یہاں سے نکل جائے پھر دس ہزار ہمت والے بھی اسے نہیں پکڑ سکیں گے ۔ سچ کہتی ہوں ، یہ کام کر کے تم بہت بڑا ثواب کما لو گے — کیا تیار ہو ؟ "

رانی کی اس سادگی پر ، رگھو نندن کو ہنسی آ گئی ، رانی چڑ گئی ، اس نے کہا :

" کیا کوئی بھائی بہن کے دکھ پر ہنستا ہے ؟ تمہیں ہنسی کیوں آئی ؟ "

وہ بولا " ہنسی آئی تمہارے اس بھولے پن پر ، مان لو میں تیار ہو جاؤں اس شخص کو رہا کر دینے پر ، مگر اسے پھاٹک سے کس طرح نکالوں گا ؟ کیا سنتری نکل جانے دیں گے ؟ "

اسی سادگی اور بھولپن کے ساتھ رانی نے کہا :

" قلعوں اور محلوں میں چور دروازہ بھی تو ہوتا ہے ، چور دروازے سے نکال دو اسے "

رگھو نندن نے مسکراتے ہوئے کہا :

" اچھا فرض کرو نکال دیا ، مگر جائے گا کیسے ؟ کیا پا پیادہ ؟ "

اس نے جواب دیا ، " ڈھیر سارے زیور ہیں میرے پاس ، کیا انھیں بیچ کر ایک گھوڑے کا بندوبست بھی نہیں کر سکتے تم ! "

بات کو ختم کرتے ہوئے رگھو نندن نے کہا :

" تم نے ایک بات کی ہے ، اب مجھے سوچنے اور غور کرنے کا وقت بھی تو دو ، ہتھیلی پر سرسوں تو نہیں جما کرتی ! "

(۴)

قید میں خیال ان کا ....!

رگھونندن، رانی کو تسکین و تسلی دے کر چلا گیا!

اس کے جانے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئی، بہت تھکی ہوئی تھی۔ ذہنی طور پر بھی اور اعصابی طور پر بھی، لیکن نیند نہ آئی، کروٹیں بدلنے لگی، رہ رہ کر اس کی نظر سامنے والے کمرے پر جاتی تھی جہاں احمد خاں بے خبری کی نیند سو رہا تھا!

وہ سوچ رہی تھی، یہ شخص، جسے میں اچھی طرح دیکھ بھی نہیں سکی تھی، کیوں اتنا ... سے آج تک میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے؟

اس نے ایک مظلوم اور ستم رسیدہ عورت کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کر کے ... کر دیا کہ انسانیت اور شرافت قوم اور مذہب، اور ملک کے پیمانہ سے نہیں ناپی جا سکتی ... ہمت رائے کا اور میرا مذہب ایک ہے۔ قوم ایک ہے، ملک ایک ہے، لیکن اس نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا جس کے تصور سے روح لرز جاتی ہے۔

اور یہ شخص، جس کا مذہب تلوار کا مذہب ہے، جس کی قوم سنگ دل اور ... مشہور ہے، جو پردیس کا رہنے والا ہے، اتنا بڑا، اتنا اونچا اور اتنا اچھا انسان ... ہوا کہ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری جان بچائی، میری ناموس کی حفاظت کی

اگر اس رات کو یہ نہ ہوتے تو میرا کیا حشر ہوتا؟

کیا میں تالاب کی مچھلیوں کا لقمہ نہ بن گئی ہوتی؟ کیا میری زندگی ختم نہ ہو گئی ہوتی؟ اور اگر کسی طرح بچ بھی جاتی تو کیا ہمت رائے مجھے معاف کر دیتا؟ کیا وہ اپنے ساتھ مجھے گھسیٹتا ہوا نہ لے جاتا؟

کیا اس مسلمان کے وہ الفاظ میں بھول سکتی ہوں جو اس نے ہمت رائے سے کہے تھے؟ اس نے ہمت رائے کے سامنے تلوار نکال لی تھی اور اس سے کہا تھا:

"خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ بیٹھے رہو، اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرنا، اس عورت کا خیال چھوڑ دو، یہ اگر تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو کیوں اسے مجبور کرتے ہو کہ تمہاری ہوس کا نشانہ بنے؟"

"اور جب ہمت رائے کسمسایا تھا، اس نے دھمکی دی تھی تو اس شخص نے اس سے کہا تھا:

"نہیں رات بھر اس تالاب کی جگت پر بیٹھنا پڑے گا۔ صبح ہونے کے بعد ہی تم شہر میں داخل ہو سکتے ہو"

اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

"جاؤ، جہاں تمہارا جی چاہے چلی جاؤ!"

میں اسے دعائیں دیتی ہوئی، اس کی زندگی کی خیر مناتی ہوئی، اپنی جان بچا کر بھاگ گئی، اور اس انسان کو، نہیں اس فرشتے کو، اس بھیڑیئے کے پاس چھوڑ کر چلی آئی۔ اس نے رتھ چلتے ہی اسے گرفتار کر لیا، اور اب اس کی جان کا لاگو ہو رہا ہے۔

کاش میں نے اس کی پیش کش نہ قبول کی ہوتی، نہ بھاگی ہوتی، بلا سے میں گرفتار ہو جاتی، لیکن یہ تو بچ جاتا۔

پھر رات کے اس اندھیرے میں احمد خاں کی ایک دھندلی سی تصویر نظر کے سامنے آ گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، لیکن تصویر نظر کے سامنے سے نہ ہٹی، پھر آنکھیں

کھول لیں لیکن تصویر بدستور نگاہ کے سامنے موجود تھی!

وہ سوچنے لگی :

" یہ ہے وہ شخص ، وہ میرا محسن ، جس نے میری جان ، اور لاج بچا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھے خرید لیا ۔ یہ کہیں بھی رہے ، میں کہیں بھی رہوں ، لیکن ـــ

لیکن کیا ؟

نہیں کچھ نہیں ـــ میں اس کے احسان کو ، اس کی انسانیت کو ، اس کی شرافت کو ، اس کے ایثار کو ، ہمیشہ یاد رکھوں گی !

بس صرف یہی چیزیں ؟ کچھ اور نہیں ؟

ان سب چیزوں سے قطع نظر ، یہ خود بھی تو بہت کچھ ہے ، اس میں یہ خوبیاں نہ ہوتیں تو بھی کیا اس کا بھول جانا ، اسے فراموش کر دینا آسان تھا ؟

اس کی آنکھوں میں کس بلا کی کشش ہے ، اس کی باتوں میں کیا جادو ہے ، اس کے مردانہ تیوروں میں کیسی شان ہے ، کیسی آن ہے ؟

کیا یہ باتیں ، یہ خوبیاں بھلائی جا سکتی ہیں ـــ ؟

اس نے مجھے بچانے کے لیے سب کچھ کیا ، میں اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتی ! کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی بدقسمتی ہو سکتی ہے ؟ کیا یہ بدقسمتی کی انتہا نہیں ہے ؟

لیکن نہیں ، مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ، یہ شخص رگھو نندن ، جس نے مجھے لا کر قید کیا ہے ، جو میرا بھائی بن کر ، اور میرے دل ناشاد کو تسلی دے کر وہیں لایا ہے ، چھوٹا آدمی نہیں ہے ، اس کی باتوں سے شرافت جھلکتی ہے ، اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جو کچھ بھی ممکن ہوگا ، اسے بچانے کے لیے کرے گا !

یہ بچ جائے ، یہ یہاں سے زندہ اور صحیح سلامت نکل جائے ، پھر میں سمجھوں گی کہ میں نے اپنے دل کی مراد پالی ـــ میں نے سب کچھ پالیا ،

لیکن جب تک ایسا نہیں ہوتا !

جب تک رگھو نندن کو موقع نہیں ملتا کہ اسے یہاں سے سلامتی کے ساتھ نکال لے جائے ،

جب تک یہ یہاں ہے ـــ جب تک میں یہاں ہوں ۔

کیا ایسا بھی ہو سکے گا کہ میں اسے دیکھ سکوں ؟ اس سے مل سکوں ؟ شکریہ ادا کر سکوں اس کا ؟ باتیں کر سکوں اس سے ؟ ـــ کیا یہ میرا فرض نہیں ہے کہ دل کی زبان سے اس کا شکریہ ادا کروں ؟ اس کے قدموں پر سر رکھ کر کہوں کہ تو نے ایک پاپی کام اور ہتیارے کے ہاتھ سے مجھے بچا کر ، زندگی بھر کے لیے مجھے خرید لیا ؟ میری روح اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تیری ہو چکی ، اب مجھے دنیا کی کوئی طاقت تجھ سے جدا نہیں کر سکتی ، نہ اس دنیا میں نہ اس دنیا سے آگے جو دنیا ہے وہاں !

---

(۵)

عالمِ خیال

رات گزر گئی!

مگر کس طرح؟ —— رانی صرف کروٹیں بدلتی رہی۔ احمد خاں بے فکری
خیند سوتا رہا۔ رانی کی نگاہِ تصور کے سامنے ایک تصویر تھی۔ ایک جوان رعنا کی تصویر
جو حسنِ مردانہ کا مکمل نمونہ تھا۔ اور جس کی شخصیت میں مقناطیسی کشش تھی، جسے
بہت دن ہوئے صرف ایک مرتبہ چند لمحوں کے لیے دیکھا تھا، لیکن وہ دن
آج کا دن کہ وہ تصویر آنکھوں کے نشیمن سے پھر باہر نہ نکلی۔ وہ تصور نگاہوں
نبا رہا، وہ جمال و جلال کا پیکر دل کے ویرانہ میں کچھ اس طرح آ کر بسا، جیسے
اسی کے لیے بسی تھی، اسی کے لیے بنی تھی۔ اس کے آتے ہی اس کی ویرانی دور ہو گئی
میں آب و رنگ پیدا ہو گیا۔ زندگی پیدا ہو گئی۔ رنگا رنگی پیدا ہو گئی۔

اور وہ شخص —— جس نے میری جان بچائی، لاج بچائی۔ مجھے
چنگل سے نجات دلائی، مجھے بندِ غلامی سے آزاد کیا۔ اب صرف چند دنوں

وہ زندہ رہنے کا حق رکھتا ہے مگر یہ حق اس سے چھینا جا رہا ہے۔

وہ زندگی کا وقار ہے، زندگی کی آبرو ہے، زندگی کی آن ہے، لیکن

زندہ رہنے کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے۔

کیوں؟ کس لیے؟ کس خطا پر؟ کس جرم میں؟

کیا اس کا جرم صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ میں اسے چاہتی ہوں؟

لیکن میں کیوں چاہتی ہوں اسے؟

کیا بات ہے اس میں؟

میرا، اور اس کا عشق نبھ کس طرح سکتا ہے؟

میرا اور اس کا مذہب جدا، قوم جدا، تمدن اور معاشرت الگ، زبان اور رسم و رواج میں مغایرت، میرے اور اس کے مابین اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا زمین اور آسمان میں۔ یہ فاصلہ ہمیشہ قائم رہے گا، کبھی قربت سے نہیں بدل سکتا؟

کیا واقعی؟

نہیں، محبت رسم و رواج سے ناآشنا ہے، وہ مذہب کو بھی نہیں مانتی وہ ہر چیز سے ماورا ہے، بلند ہے۔

لیکن کیا مجھے زیبا تھا کہ میں اس کی جان کی گاہک بن جاتی؟

میں اس کی جان کی گاہک؟ میں اس مردِ شیوا طراز کے خون کی پیاسی؟

اے دل تو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کیا ایسا بھی کبھی ہو سکتا ہے؟ میں تو اس پر اپنی جان قربان کر سکتی ہوں، اس کے پسینہ پر اپنا خون بہا سکتی ہوں۔ میں اس کی جان کی گاہک کس طرح ہو سکتی ہوں؟

یہ وہم ہے، یہ وہم باطل ہے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں، میں اسے زندہ رکھنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دوں گی!

آخر مجھ سے ایسی کیا غلطی ہوئی کہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگی؟

اں یاد آیا، میں نے بھت رائے کے سامنے اقرار محبت کیوں کیا؟

میں نے اسے کیوں بتایا کہ میں اس شخص سے محبت کرتی ہوں ؟

اگر نہ بتاتی ؟

تو شاید یہ پاپی اس کا دشمن جان نہ ہوتا، اسے قتل کرنے کے درپے نہ ہوتا۔ یہ جلن میں، میری دشمنی ہی میں وہ اس درجہ آپے سے باہر ہوا ہے۔

پھر؟ —— پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں کیا کرسکتی ہوں؟

کیا رگھو اپنا وعدہ پورا کرے گا؟ کیا وہ اسے رہا کردے گا؟ کیا میرے زیور بھی اسے نہیں خرید سکیں گے؟

وہ جھوٹا آدمی نہیں معلوم ہوتا، اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھلا آدمی ہے وہ ایک دکھیاری عورت کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ وہ ایک مصیبت کی ماری کا دل نہیں توڑ سکتا۔

اور اگر رگھو نے اپنا وعدہ پورا کیا، اس شخص کو رہا کردیا، پھر؟

پھر میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔ پھر تو میں ایسا محسوس کروں گی جیسے نئی زندگی پالی، جیسے دنیا جہاں کی قیمت مجھے مل گئی، جیسے میں نے سب کچھ پالیا۔

لیکن میرا دل کیوں دھڑک رہا ہے؟

میرے دل میں یک بیک ہلچل کیوں مچ گئی؟

میری آنکھوں میں آنسو کیوں آتے جارہے ہیں؟

کیا میں اس کی جدائی نہیں برداشت کرسکتی؟ اسے ایک مرتبہ پالینے کے بعد اس کا دامن نہیں چھوڑ سکتی۔ اس درجہ قریب آجانے کے بعد —— اب اس سے زیادہ قریب کیا ہوگا کہ یہ سامنے والا دروازہ کھول دوں تو اس کے قدموں میں پہنچ جاؤں —— اس سے دوری نہیں برداشت کرسکتی۔ دنیا کا ہر نقصان گوارا ہے مگر یہ —— نہیں نہیں ہرگز نہیں، کسی قیمت پر نہیں۔

لیکن سوال میری حسرتوں اور آرزوؤں کا نہیں، میرے محبوب اور محسن کی زندگی کا ہے۔ کیا اپنی خوشی کے لیے، اپنی عارضی مسرت کے لیے، اس بے گناہ کو موت کے گھاٹ اترجانے دوں؟ اسے اپنی آنکھوں سے قتل ہوتا دیکھ لوں؟ کیا دیکھ سکوں گی؟

میرا اور میری آرزوؤں کا حشر کچھ بھی ہو، مگر اسے زندہ رہنا چاہیے، اسے اس پاپی کے پنجہ سے رہا ہوجانا چاہیے۔ میری خوشی اسی میں ہے کہ وہ آزاد ہوجائے، میں زندگی بھر کی جدائی جھیل لوں گی۔

اور —— اور میں جو اس سے چاہت کا دعویٰ کررہی ہوں، یہ محبت صرف میری طرف تو ہے، وہ کیا جانے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں، شاید وہ کبھی جان بھی نہیں سکے گا، نہ جانے وہ کس سے محبت کرتا ہے؟ آخر اس کے سینہ میں بھی دل ہے، اور یہ دھڑکتا ہوا دل ضرور چاہتا بھی ہوگا کسی خوش قسمت کو —— !

کون ہے وہ خوش قسمت؟ —— کوئی بھی ہو، رانی تو نہیں ہوسکتی!

وہ کیوں ایک ایسی عورت کو چاہنے لگا، جس میں کوئی گن نہیں، کوئی سبھاؤ نہیں —— اور، اور روپ بھی نہیں۔

وہ خود جیسا حسین ہے ویسی ہی اس کی محبوبہ بھی ہونی چاہیے، میں تو اس کی خاک پا کی برابری بھی نہیں کرسکتی۔

مجھے اس کی منزل کھوٹی نہیں کرنی چاہیے۔ مجھے اس کے راستے کا پتھر نہیں بننا چاہیے۔ مجھے زیبا نہیں کہ اس کا دامن پکڑ کر کھینچوں اور اسے کہیں کا نہ رکھوں۔ وہ جہاں بھی رہے خوش رہے، جس سے محبت کرے، بھگوان سے میری پرارتھنا (دعا) ہے کہ کامیاب ہو۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتی، یہی میری حسرت ہے، یہی میری آرزو ہے!

رات بہت چلی تھی، صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا، وہ نہ سو سکنے کے باوجود آنکھیں ملتی ہوئی بستر سے اٹھی، اور اس دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی جو احمد خاں کے کمرے میں کھلتا تھا۔

(۶)

یہ کیا؟

احمد خاں نماز فجر ادا کر رہا تھا،

نماز ختم کی تو قرآن شریف لے کر بیٹھ گیا، اور خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کرنے لگا!

آج رانی نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا کہ مسلمان عبادت کس طرح کرتے ہیں اور احمد خاں کا رکوع و سجود دیکھ کر وہ انگشت بدنداں رہ گئی، کتنا وقار تھا اس طرز عبادت میں، کتنی سادگی تھی اس خدائے واحد کے سامنے رکوع میں جاتے، سر بسجود ہوتے اور اس کی بڑائی اور عظمت کا گن گانے میں، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خدا اس شخص کے سامنے موجود ہے، جیسے یہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

خود رانی بھی ہمیشہ سے اپنے بھگوان کی پرستار رہی تھی، اپنے دیوتاؤں دیویوں اور اوتاروں کی پوجا کرتی چلی آ رہی تھی، لیکن اس طرح محو ہو کر، اس طرح دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر، اس طرح ہمہ تن وقف نیاز کش ہو کر، تو اس نے کبھی سر نہیں جھکایا تھا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑی اس کی جھوٹی سی دراز سے یہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہی تھی اور اس کی یہ حالت تھی کہ خود بخود اس کے پاؤں اٹھنے لگے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی

اس عبادت میں خود بھی شریک ہو جائے۔ لیکن وہ ایسا کر نہ سکی۔

او رپھر وہیں کھڑے کھڑے اس نے دیکھا کہ نماز سے فارغ ہو کر احمد خاں نے جزدان سے قرآن شریف نکالا اور خوش الحانی کے ساتھ تلاوت شروع کر دی۔

یہ کیا ہے؟

وہ سوچنے لگی، یہ ایک ناقابل فہم، لیکن حد درجہ دلکش نغمہ ہے جو اس کے منہ سے نکل رہا ہے۔

اسے یاد آیا، خود اس کے مذہب کا جہاں تک تعلق ہے، نغمہ، بھجن، کیرتن، رقص یہ ساری چیزیں جزو مذہب ہیں۔ مذہب کے قواعد و رسوم کی طرف متوجہ کرنے کے لیے بھجن سے زیادہ دلکش، اور شیریں کوئی چیز نہیں۔

لیکن یہ بھجن جو اس نے سنے تھے، جو اس نے گائے تھے، جن میں اس نے شرکت کی تھی ایسی زبان میں تھے جسے ماں کی گود میں اس نے سیکھا تھا، جس کے ایک ایک لفظ، اور ایک ایک حرف سے وہ مانوس اور آشنا تھی، جس کی فصاحت و بلاغت اور حلاوت کی وہ رمز آشنا تھی اور کوئی شبہ نہیں، وہ ان چیزوں سے لذت اندوز ہوتی تھی۔

مگر یہ شخص جو کچھ پڑھ رہا ہے، اس کے منہ سے جو بول نکل رہے ہیں، جو نغمہ کس زبان سے ادا ہو رہا ہے زبان اور مفہوم و معنی نہ سمجھ سکنے کے باوجود کیا بات ہے کہ وہ دل میں اترا جا رہا ہے؟

ان بولوں میں جو اس کے منہ سے نکل رہے ہیں، کیسا جادو ہے کہ دل خود بخود کھنچا جا رہا ہے؟ ——— یہ کیا چیز ہے؟ یہ کیسا نغمہ ہے؟ یہ کیسا جادو ہے؟ کیا یہ جادو کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے؟

جادو میں بھی وہ کشش نہیں جو ان سمجھ میں نہ آنے والے الفاظ کے اندر پوشیدہ ہے۔

جاؤں ؟ پوچھوں یہ تو کیا پڑھ رہا ہے ؟ ان الفاظ کے پڑھنے میں کیا لذت ہے ؟ کیا مطلب ہے ان الفاظ کا ؟ ——

اور دفعتہً رانی کے دماغ نے کام کرنا بند کر دیا، اس نے دیکھا اور بار بار آنکھیں مل مل کر دیکھا کہ احمد خاں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ وہ تلاوت کر رہا ہے اور رو رہا ہے۔ اس کی آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا گریہ گلوگیر ہو گیا ہے۔ موتی کی طرح آنسو کے قطرے آنکھوں سے ڈھلک رہے ہیں۔ گلاب کی پتی کی طرح ہونٹ لرز رہے ہیں —— کیوں ؟ یہ رو کیوں رہا ہے ؟

اور پھر رانی نے دیکھا کہ احمد خاں نے بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ، قرآن شریف کو جزدان میں لپیٹا، اور اپنے خدائے نادیدہ سے دعا مانگنے لگا —— زیر لب۔

پھر اس نے قرآن شریف کو چوما، اور ادب سے اس کی جگہ رکھ دیا۔

یہ سارے مناظر دیکھ دیکھ کر رانی پر عجیب سی کیفیتیں طاری ہوتی رہیں۔ کبھی اس کا جی چاہتا وہ خود بھی رونے لگے، کبھی ترنگ اٹھتی، دروازہ کھولے، اور اس کمرہ میں چلی جائے، اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر پوری محویت کے ساتھ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے اسے سنتی رہے۔

لیکن یہ ساری باتیں دل ہی میں پیدا ہوتی اور دل ہی میں ختم ہوتی رہیں، اتنی ہمت نہ پیدا ہو سکی کہ دل کی آواز پر عمل بھی کر سکتی!

آج اس نے پہلی مرتبہ دن کی روشنی میں، صبح کے اجالے میں، احمد خاں کو دیکھا اس شب بلا کے بعد آج پہلی مرتبہ اس نے اپنے محبوب اور محسن کو اپنے قریب پایا تھا۔

اور یہ محسوس کر کے اسے ایک طرح کا فخر سا محسوس ہوا تھا کہ اس نے جو چراغ اپنے محبوب اور محسن کی بنائی تھی وہ مبہم سا نقش جو اس نے اس نہ بجھنے والے

دیکھا تھا، درحقیقت کتنا ارفع و اعلیٰ تھا اس کے تصور سے اس کے خیال کی بنائی ہوئی تصویر سے۔

خود بخود اس کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا،

لیکن یکایک کسی کی آہٹ، اس نے محسوس کی جیسے کوئی اس طرف آ رہا ہے، وہ جلدی سے ہٹی اور پھر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی!

---

(۷)

بے کلی بیخودی کچھ آج نہیں

یہ رگھو نندن تھا !

رانی اسے ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگی، پھر اس نے بڑی بے تابی اور اشتیاق کے ساتھ

" رگھو میں تمہارے قیدی سے ملنا چاہتی ہوں !"

رگھو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی ، وہ گویا ہوا :

" ملا دوں گا ، لیکن کیا کرو گی مل کر ؟

وہ بولی " انسان کے روپ میں یہ اوتار کیا اس قابل نہیں کہ اس کے درشن کیے جائیں ؟ اس کے پاؤں چھوئے جائیں ، اس کے سامنے سر جھکایا جائے ؟ —

پھر میں تو اس کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتی ہوں !"

رگھو نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن کر سوال کیا ۔

" انسان کو اوتار بنا دینا کچھ کھیل تو نہیں ہے اور یہ مسلمان لوگ جو نہ دیوی دیوتاؤں کو ، بھلا اوتار کیسے بن سکتے ہیں ؟ کچھ دیوانی ہوئی ہو ؟"

وہ کہنے لگی " جو چاہو کہہ لو لیکن مجھے درشن کرا دو — رگھو تم اسے نہیں جانتے ، واقعی وہ انسان کے روپ میں اوتار ہے ۔ انسان تو ہم تم ہیں ۔ ہمت رائے ...

یہ شخص انسان کہا جا سکتا ہے ؟ یہ اوتار کے سوا کچھ نہیں ہے — توبہ کرو ، کان پکڑو ۔

رگھو نے توبہ کر لی ، کان پکڑ لیے اور پھر اس نے دروازے پر دستک دی ، فوراً دروازہ کھل گیا ۔ احمد خاں با ہزاراں تمکین و رعنائی برآمد ہوا ، رانی کو دیکھ کر کچھ ٹھٹکا ، رگھو نے ہمت بندھائی ۔

" آئیے ، چلے آئیے ، آپ رک کیوں گئے ؟"

احمد خاں وہیں کھڑا رہا ۔ وہ رانی کو بالکل بھول چکا تھا ۔ پہچان نہ سکا ۔ رگھو نے رانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا :

" یہ آپ سے ملنا چاہتی تھیں — آپ پہچانتے ہیں انھیں ؟"

احمد خاں کچھ سوچنے لگا ، پھر اس نے کہا :

" نہیں ، مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے انھیں کبھی دیکھا ہو ۔ یہاں کے دو چار آدمیوں سے تو ملنے کا ضرور اتفاق ہوا ، ورنہ اس اجنبی سرزمین پر کسی خاتون سے ملنے کا نہ کوئی امکان تھا ۔ نہ ضرورت ، پھر کیسے پہچان سکتا ہوں انھیں ؟"

رگھو ہنسنے لگا ، " آپ کا حافظہ کمزور معلوم ہوتا ہے ، کیا آپ اس اجنبی سرزمین پر کسی خاتون سے نہیں ملے ؟"

احمد خاں نے فوراً جواب دیا " نہیں بھئی نہیں ۔ نہیں غلط فہمی ہو گئی ہے کچھ "

رگھو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا " غلط فہمی اگر ہوئی ہے تو انھی شریمتی جی کو ہوئی ہوگی ، یہ تو آپ سے ملنے کے لیے ایسی بے تابی ظاہر کر رہی تھیں جیسے مدتوں کی رسم و راہ ہو آپ دونوں میں !"

احمد خاں کچھ جھینپ سا گیا ، اس نے ہکلاتے ہوئے کہا :

" مجھ سے ملنے کے لیے ؟ — تعجب ہے !"

رگھو نے جیسے یاد دلاتے ہوئے کہا " اس اجنبی سرزمین پر آپ نے جب پہلے پہل

قدم رکھا تھا تو کسی عورت سے مڈبھیڑ ہوئی تھی ؟ کسی ڈوبتی ہوئی عورت کو تالاب سے نکالا تھا آپنے ؟ کسی عورت کی جان اور لاج بچائی تھی کسی کے پنجۂ ہوس سے ؟"

احمد خاں کو سب کچھ یاد آگیا ، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا ،

" رانی " ـــــ

رگھو نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا " جی ہاں ، ان کا نام رانی ہے ـــ "

احمد خاں نے ایک نظر رانی کے چہرۂ زیبا پر ڈالی ، اور کہنے لگا ،

" وہ رات کا وقت تھا ، لیکن اب یاد آگیا ۔ یہ وہی ہیں ۔ ان کی وہ دھندلی سی تصویر اب تک میری نظر کے سامنے ہے ، میں پہچان گیا ۔"

رگھو نے کہا " یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ نے انھیں پہچان لیا ۔ ان کا بھی یہ خیال ہے کہ آپ کو بہت اچھی طرح پہچان چکی ہیں یہ ! "

ان باتوں کو سنی ان سنی کرتے ہوئے ، احمد خاں نے کہا :

" لیکن یہ یہاں کیسے آگئیں ؟ " ـــــ

رگھو نے بتایا ، " گرفتار ہو کر آئی ہیں ، یہاں قید ہیں ! "

یہ الفاظ سن کر احمد خاں کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہوئے ، اس نے کہا ،

" رگھو یہ تو بہت بڑا پاپ ہے "

" پاپ کیسا سرکار ؟ "

" اس سے بڑھ کر پاپ کیا ہو سکتا ہے کہ ایک شریف عورت کو ، طاقت اور زور کے بل پر اس کے گھر سے جبراً اٹھوا کر منگوا لیا جائے ۔ اور اسے برباد کرنے کی ناپاک کوشش کی جائے ۔ اسے گھر بار سے ، ماں باپ سے ، بھائی بہن سے ، کنبہ خاندان سے چھین لیا جائے ۔"

" لیکن اس دنیا میں کیا نہیں ہوتا ، ایسے واقعات تو ہر روز ہوتے رہتے ہیں ! "

" (جوش کے عالم میں) رگھو اس خاتون کی میرے دل میں بہت عزت ہے ، میں نے اپنی لاج بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی ، اور اب پھر اسے پکڑ لایا گیا ہے ، کیا تم اس کی مدد نہیں کر سکتے ؟ "

" بھلا مجھ جیسا شخص کسی کی مدد کیا کر سکتا ہے ؟ "

" (اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ) یہ صرف الفاظ ہیں ، انسان سب کچھ کر سکتا ہے ۔ تم بھی انسان ہو اور سب کچھ کر سکتے ہو ۔"

" تو بتائیے کیا کر سکتا ہوں میں ؟ "

" تم اس پاپ میں حصہ نہ لو ! "

" کیا کروں پھر ؟ "

" تم اسے ابھی ، اور اسی وقت رہا کر دو ، جتنی دور تک ہو سکے اسے خود پہنچا آؤ بلکہ یہ بہت بڑے ثواب کا کام ہے ، اور تمھیں یہ سعادت حاصل کرنی چاہیے ۔"

" لیکن آپ جانتے ہیں پھر میرا حشر کیا ہوگا ؟

" کیا ہوگا تمہارا حشر ؟ "

" میں مار ڈالا جاؤں گا ، یا جو کر بھیک مانگ کر زندگی بسر کرنا پڑے گی ! "

" تم موت سے ڈرتے ہو ؟ ابھی کچھ عرصہ ہوا تم بیمار پڑے تھے کیا مر نہیں سکتے تھے ؟ پھر راجو کیا کرتی ؟ کیا اب نہیں بیمار پڑ سکتے ؟ اب موت نہیں آ سکتی ؟ اگر ایسا ہوا تو راجو کیا کرے گی ؟ جو کام خدا کا ہے اسے تم نے اپنے ذمہ کیوں لے لیا ہے ؟ رزق دینا ، زندہ رکھنا خدا کا کام ہے بندے کا نہیں ! "

رگھو نے کوئی جواب نہیں دیا ، خاموشی سے احمد خاں کی باتیں سنتا رہا ۔ احمد خاں نے اپنی باتوں کا جواب نہ پا کر پہلے سے زیادہ جذبے کے ساتھ کہا ۔

" اگر تم ڈرتے ہو ، تو میں یہ کام کرنے پر تیار ہوں ! "

رگھو نے چونک کر احمد خاں کو دیکھا اور بولا :

" یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟ آپ کیا کر سکتے ہیں ؟ آپ کیا کریں گے ؟"

احمد خاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا :

" اگر تمہیں مجھ پر اعتماد و اعتبار ہو تو میں یہ کر سکتا ہوں کہ رات کو ، انھیں اس شہر کی سرحد سے باہر پہنچا دوں ، اس کے بعد واپس آجاؤں گا ، مجھ سے جب پوچھ گچھ ہو ، تو بے تامل تم میرا نام لے سکتے ہو کہ اس شخص کی مدد سے رانی بھاگی ہے ، اور میں جرم کا اقبال کروں گا !"

رانی اور رگھو کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی ۔ رگھو نے کہا :

" گویا آپ ایک جان بچا کر اپنی زندگی قربان کرنے کو تیار ہیں ؟"

وہ بے پروائی کے ساتھ بولا " میں موت سے نہیں ڈرتا ۔"

" لیکن آپ کی زندگی اتنی سستی بھی نہیں ہے !"

" زندگی ہر انسان کی برابر ہے ، لیکن قیمتی زندگی وہ ہے جو دوسروں کے بچانے میں کام آجائے ۔ میں اپنی زندگی کو قیمتی بنانا چاہتا ہوں ، کیا تم میری مدد نہیں کر سکتے ؟"

رگھو نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ رانی اٹھی ، اور احمد خاں کے پاس آکر کھڑی ہو گئی ، کہنے لگی :

" ایک دفعہ نہیں ہزار بار بھی میری زندگی ختم ہو جائے مگر میں اسے گوارا نہیں کر سکتی کہ میری وجہ سے آپ پر آنچ آئے ۔ میں حالات کا مقابلہ کروں گی ۔ ہرگز آپ کی مدد سے نہیں بھاگوں گی ۔"

احمد خاں ٹکٹکی باندھ کر رانی کی طرف دیکھنے لگا ۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر رانی کی اس جذباتیت نے اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا ، اور رگھو نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی :

" جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا لیکن چند دن تو صبر کیجئے ۔"

---

(۸)

محبت

احمد خاں کے کردار سے رانی پہلے ہی بہت متاثر تھی ، اس کی دلیری ، جرأت اور شرافت طبع نے اسے پہلی ہی مرتبہ اسیر کر لیا تھا ، آج اس کی باتیں سنیں اور روشنی میں اس کا دیدار کیا ، اس کے کردار اور سیرت کی جھلک دیکھی ۔ اسے قریب سے بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو دل کی کچھ عجیب سی حالت ہو گئی ، وہ اپنے انتخاب پر فخر محسوس کرنے لگی ۔ اسے اپنی قسمت پر ناز تھا کہ انسانوں کے اس تمام گروہ میں کتنا بلند تر ، اور برتر انسان ہے احمد خاں جسے اس کا دل چاہنے پر مجبور ہو گیا ہے ۔ رگھو کی موجودگی میں کبھی راجو یا آنند کی موجودگی میں اور کبھی کبھی ان دونوں کے بغیر بھی رانی اور احمد خاں میں ملاقات اور بات چیت ہوتی رہتی ۔ ایک روز رانی احمد خاں کے کمرے میں پہنچ گئی ، اس نے پوچھا :

" میرا آنا آپ کو ناگوار تو نہیں گزرا ؟"

احمد خاں نے زیر لب تبسم کے ساتھ جواب دیا ۔

" بھلا آپ کا آنا بھی ناگوار گزر سکتا ہے ؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی " کیوں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں مجھ میں ؟"

احمد خاں نے بھی ہلکے سے تبسم کے ساتھ جواب دیا :

" آپ سرخاب کے پر کی محتاج ہیں ؟ آپ خود اپنی توہین کرتی ہیں ؟

رانی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔ اس نے محسوس کیا تاں شاید دونوں باجوں سے بج رہی ہے ۔ دل کی مرجھائی ہوئی کلی کھل گئی ۔ مستقبل کے اندیشے اور وسوسے کافور ہو گئے ۔ احمد خاں کا حشر کیا ہونے والا ہے اور وہ خود زندگی اور موت کی کشمکش میں کس طرح داخل ہو چکی ہے ، یہ سب باتیں ذرا دیر کے لیے اس نے فراموش کر دیں اس نے تبسم کی بجلیاں گراتے ہوئے کہا :

" آپ بھی میری بے بسی کا مذاق اڑا رہے ہیں ؟ میں اگر کچھ ہوتی تو ان حالات کو ہوتی ؟ یہ درگت بنتی میری ؟ ایک پاپی اس طرح میرے ناموس اور عزت سے کھیلتا ؟

احمد خاں سنجیدہ ہو گیا ، اس نے کہا :

" شاید آپ ہمت رائے کی بزدلانہ حرکتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہیں ؟ —— بے شک وہ پاپی ہے ، ظالم ہے ، خود غرض ہے ، ہوس پرست ہے ، لیکن وہ کسی کے تقدس کو داغدار نہیں کر سکتا ۔ اس کے پاس کوئی قوت نہیں ہے جس کے بل پر وہ تاروں کی روشنی چھین سکے ، چاند پر خاک ڈال سکے ۔ سورج کی روشنی کو بادل بن کر ڈھک لے ۔

" یعنی آپ کا مطلب ہے ——

" ہاں میرا مطلب ہے کہ آپ تاروں کی روشنی ہیں آپ چاند کا نور ہیں ، آپ کی شرافت حفظ ناموس اور بلندیٔ طبع ایک ایسی روشن اور تابندہ حقیقت ہے جس کے سامنے سورج بھی نہیں ٹھہر سکتا ۔ یقین کیجیے ، میرے دل میں آپ کی عزت ہے اور ذرا کی ذرا احمد خاں کی گویائی سکوت میں تبدیل ہو گئی ۔ رانی ٹکٹکی لگائے دیکھنے لگی ۔ وہ سننا چاہتی تھی کہ اس " اور " کے بعد وہ کیا کہتا ہے ؟ لیکن اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا ۔ احمد خاں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :

" اور ، —— اور اگر میں محبت کر سکتا تو صرف آپ سے کرتا ! "

رانی کا دل اور زیادہ تیزی سے دھڑکنے لگا وہ سوچنے لگی ، اگر کوئی میرے اور اس کے راستے میں حائل نہ ہوتا ، تو یقیناً یہ میری محبت کا جواب محبت سے دے سکتا تھا ، لیکن وہ کون ہے جو ہم دونوں کے درمیان حائل ہے ؟ کیا اس کی بیوی ؟ کیا اس کی محبوبہ ؟ کیا یہ شادی کر چکا ہے ؟ کیا یہ کسی کے دام محبت میں گرفتار ہے ؟ پھر بے ساختہ اس کے ہونٹوں نے جنبش کی اور وہ بولی :

" جانتی ہوں میں ، اس قابل نہیں کہ آپ مجھ سے محبت کر سکیں ، لیکن کیا آپ میری محبت قبول بھی نہیں کر سکتے ؟ ——

احمد خاں چونک پڑا ، یہ الفاظ سننے کے لیے وہ تیار نہیں تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ رانی کو دیکھنے ، اسے پرکھنے اور ان چند دنوں میں اس کے اخلاق و کردار کا قریب سے جائزہ لینے کے بعد وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا لیکن اسے اپنی مجبوریوں کا علم تھا ، وہ جانتا تھا ایک غیر مذہب اور غیر قوم کی لڑکی سے اسے محبت کرنے کا ہرگز حق نہیں ہے لیکن رانی کے یہ الفاظ اس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے ۔ ان الفاظ نے سوکھے دھانوں کو سیراب کر دیا ، وہ آرزو جو دل میں پیدا ہو چکی تھی ، لیکن نامرادی کے حوالے ہو چکی تھی وہ پھر سے تر و تازہ ہو گئی ، اس نے کچھ سکتے سکتے کہا :

" کیا آپ واقعی —— ؟ "

بغیر کسی تامل اور جھجک کے رانی نے جواب دیا :

" ہاں میں آپ سے محبت کرتی ہوں ، شاید میں ہمیشہ سے آپ کو چاہتی آ رہی ہوں ! "

" ہمیشہ سے ؟ "

" ہاں جب میں نے آپ کو نہیں دیکھا تھا ، جب بھی میں آپ سے محبت کرتی تھی ، کیونکہ شاید عالم بالا میں آپ سے محبت کرنے لگی تھی ، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ

ایک مرتبہ رات کے اندھیارے میں آپ کو دیکھتی اور چاہنے لگتی، آپ کو اس میں قید دیکھتی، اور میرا دل آپ کے لیے تڑپنے لگتا، میرے آپ کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں ہے، میرے اور آپ کے درمیان اختلافات کے سمندر حائل ہیں، میرے اور آپ کے عقیدے میں، رسم و رواج میں، معاشرت اور زندگی بسر کرنے کے اصول میں زمین آسمان کا اختلاف ہے، اور یہ اختلاف بہت شدید اور سنگین قسم کا ہے، لیکن اس کے باوجود، میں آپ کو چاہتی ہوں، اور چاہتی رہوں گی، یہی عقیدہ میری زندگی ہے اسی عقیدے پر میری موت ہوگی؟

"ایسا نہ کہیے۔"

"کیوں منع کرتے ہیں آپ دل کی بات زبان پر لانے سے؟ ابھی کہہ چکی ہوں کہ میں اس قابل نہیں کہ آپ مجھ سے محبت کر سکیں۔ آپ خود بھی ابھی اقرار کر چکے ہیں کہ مجھ سے محبت نہیں کر سکتے۔ میری مجبوری قدرت کی پیدا کی ہوئی ہے، آپ کا مجبوری بھی میں اچھی طرح سمجھتی ہوں، لیکن اس کے باوجود اگر میں آپ سے محبت کرتی رہوں تو آپ کا حرج کیا ہے؟

جوش اور جذبہ کے عالم میں احمد خاں نے جواب دیا:

"حرج؟ —— یہ میری سب سے بڑی عزت افزائی ہے، میں نے اپنی بے بسی کا اظہار محبت نہ کر سکنے کے لیے یوں کیا تھا کہ میرے اور آپ کے درمیان جیسا کہ آپ خود کہہ چکی ہیں فکر و نظر کے اختلافات کا سمندر حائل ہے، لہٰذا میں اپنی محبت کا جواب روکنے پر مجبور ہوں، لیکن یہ آپ نے کیا کہا کہ آپ اس قابل نہیں کہ ——"

رانی بول پڑی،

"کچھ غلط تو نہیں کہا، کہاں آپ، کہاں میں؟ کہاں چمکتا ہوا سورج، کہاں خاک پڑا ہوا ذرۂ بے مقدار؟"

"میں نہیں سمجھ سکا آپ کا مطلب؟ —— سورج تو میں نے آپ کو کہا تھا، اور خاک کا ذرہ میں تھا، آپ نے بات الٹ کیوں دی؟ کیا یہ زبردستی اور ظلم کی انتہا نہیں ہے؟"

یہ کہہ کر احمد ہنسنے لگا۔ رانی بھی ہنسنے لگی۔ پھر وہ بولی:

"اچھا یہ باتیں چھوڑیئے یہ بتائیے کیا آپ محبت کو ہر چیز پر بالا نہیں سمجھتے؟"

"سمجھتا ہوں، اس دنیا میں محبت سے بڑھ کر ٹھوس اور ناقابل مزاحمت کوئی حقیقت نہیں ہے۔"

"پھر آپ مجبور کیوں ہیں؟ حوصلہ کیوں ہارے دیتے ہیں؟"

احمد خاں نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا اور گویا ہوا۔

"کیا یہی سوال میں آپ سے بھی نہیں کر سکتا؟"

رانی کے پھول سے گال سرخ ہو گئے۔ پھر ایک آہ سرد کے ساتھ گویا ہوئی:

"لیکن پھر بھی ہماری محبت پروان نہیں چڑھ سکتی۔ یہ پرانا راج بھون، یہ پرانا قلعہ، یہ دشمن سرزمین ہمیں پناہ نہیں دے سکتی۔"

احمد خاں نے کچھ فخر کچھ پندار کے ساتھ کہا:

"لیکن ہمیں اینٹ اور چونے کی بنی ہوئی اس بوسیدہ اور کہنہ عمارت سے پناہ طلب کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

بے بسی کے ساتھ رانی نے سوال کیا:

"پھر کیا یہیں ہماری قبر بنے گی؟"

احمد خاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

"رگھو کی وجہ سے یہی ہوتا نظر آتا ہے۔"

رانی نے متحیر ہو کر پوچھا "رگھو کی وجہ سے؟"

"ہاں، وہ میرا دوست ہے، ورنہ میں ان مٹھی بھر سپاہیوں کو قتل کر کے محبت کو چاہت توڑ کے یہاں سے صحیح سلامت نکل سکنے کی ہمت رکھتا ہوں۔"

(۹)

یہ کیسا شخص ہے ؟

رانی اور احمد خاں میں بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ رانی خوش تھی کہ اس نے اپنی محبت کا جواب پالیا، جسے وہ چاہتی تھی وہ اپنے دل میں اس کی جگہ رکھتے ہیں۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے پوچھا،

"مگر رگھو آپ کے پاؤں کی بیڑی کیوں بن گیا ہے ؟ جن ہاتھوں نے چھپتا ہوا چھرا ہمت رائے کو دکھایا تھا وہ رگھو کے سامنے بے بس کیوں ہیں ؟"

احمد خاں نے جواب دیا "رگھو کے سامنے نہیں اس کی شرافت کے سامنے، اس کی محبت کے سامنے، وہ دشمن نہیں دوست ہے، وہ اپنے حدود سے باہر جا کر بھی میری خدمت کرتا ہے۔ مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر میں یہاں سے فرار ہو جاؤں تو سارا الزام رگھو پر آجائے گا۔ ہمت رائے اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کا سارا خاندان تباہ ہو جائے گا۔ اس کی بیوی راجو بہت چاہتی ہے اسے، وہ رو رو کر خودکشی کرلے گی، اپنی جان بچانے کے لیے، اتنے اچھے نیک اور شریف آدمی کی جان لے لوں، اس کا خاندان تباہ کر دوں یہ نہیں ہو سکتا کسی قیمت پر بھی نہیں ـــ"

احمد خاں یہ باتیں کر رہا تھا اور رانی تصویرِ حیرت بنی اسے دیکھ رہی تھی۔ ۔ ۔ سوچ رہی تھی یہ کیسا شخص ہے ؟ کیا خود غرضی، اور خود پرستی کی دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں، جو اپنی جان بچانے کے لیے بھی، دوسروں کو کسی طرح کا گزند نہ پہنچنے دیں ؟ جو دوسروں کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی جان کی بھی پروا نہ کریں۔ سنتے سنتے وہ بولی :

"یہ بات آپ ہی کہہ سکتے تھے !"

احمد خاں نے پوچھا "یہ کیوں بھئی ؟"

وہ کہنے لگی "آپ کی جگہ میں ہوتی تو ایسا نہ کر سکتی، اپنی جان بچانے کے لیے میں دو سو آدمیوں کا قتل ہو جانا بھی گوارا کر لیتی۔ آپ کی جگہ رگھو ہوتا، آنند ہوتا، کوئی اور ہوتا وہ بھی ایسا ہی کرتا، ہم جیسے لوگ دوسروں سے ہمدردی صرف اسی وقت تک کر سکتے ہیں جب تک ہمیں کسی طرح کا نقصان نہ پہنچے، لیکن اگر ہمیں کسی طرح کا نقصان پہنچتا ہو، تو پھر کسی کی بھی پروا نہیں کرتے !"

اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا،

"مگر یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ میرا خیال ہے آپ ہمیشہ سے ایسا ہی کرتے آئے ہیں !"

احمد خاں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا "یہ آپ نے کیسے جان لیا ؟"

وہ ایک ادا کے ساتھ بولی "اس دن جب آپ ہمت رائے کو اپنے ساتھ کر بلکہ پر مجبور کر گئے تھے اور مجھے کہا تھا بھاگ جاؤ۔"

احمد خاں ہنسنے لگا "میں نے یہ کب کہا تھا کہ بھاگ جاؤ، اتنا گستاخ تو نہیں ہوں۔"

وہ ہنستی ہوئی کہنے لگی "الفاظ یہ نہ ہوں گے مگر مطلب تو یہی تھا ـــ یک بیک مجھے ہوا ـــ سوچتی ہوں اگر اس دن آپ نہ مل گئے ہوتے، آپ نے میری

جان اور آبرو نہ بچائی ہوتی، آپ نے ہر خطرہ کو لبیک کہتے ہوئے اور ہر خطرے کے لیے سینہ سپر ہو کر میرے لیے راستہ نہ صاف کر دیا ہوتا تو میرا کیا حشر ہوتا؟"

احمد خاں ان باتوں سے بہت متاثر ہوا، وہ جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ رانی پھر بول اٹھی،

"سچ تو یہ ہے کہ زندگی کی آخری سانس تک بھی آپ کا شکریہ ادا کرتی رہوں تو کبھی حق ادا نہ ہوگا۔ آپ نے مجھے خرید لیا، آپ نے میری روح کو خرید لیا، اپنے ..."

اور پھر اس کے نازک اور خوبصورت ہونٹ لرزنے لگے، شاید وہ ابھی اور کچھ کہنا چاہتی تھی مگر گلا رندھ گیا، گریہ گلوگیر ہو گیا، دل کی بات زبان تک نہ آسکی۔ احمد خاں نے تاثر کے عالم میں کہا:-

"ارے آپ تو رونے لگیں! اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ بہرحال جو خوف وہ درپیش نہیں آیا، آپ بچ گئیں خوش ہو جیے اس پر، رہا میں، سو میں نے جو کچھ کیا وہ انسانی برادری کے رشتہ سے کیا، کم از کم اس وقت تک میرے دل کے کسی گوشہ میں آپ کے لیے نہ کوئی آرزو تھی نہ تمنا۔ میرا یہ اقدام تمام تر خلوص اور ... پر مبنی تھا۔"

وہ بولی "بے شک تھا، میں کب انکار کرتی ہوں! —— اور ظاہر ہے جن کے لیے دل میں آرزوئیں مچل سکتی ہوں اور تمنائیں پیدا ہو سکتی ہوں اسے آپ کی طرح بلند اور برتر مخلوق ہونا چاہیے۔"

"اور آپ کیا ہیں؟"

"میں کیا ہوں؟"

"ہاں بتائیے، معلوم تو ہو آپ اپنے آپ کو کیا خیال کرتی ہیں؟"

"وہی جو ہوں!"

"یہ سلسلہ تو بڑی دیر تک قائم رہ سکتا ہے۔ مبہم جواب کے بجائے صاف بات کہیے۔"

"میری حیثیت اس کے سوا کیا ہے کہ "جو کسی کے کام نہ آسکے" میں وہ ایک مشت غبار ہوں۔"

"اچھا شاعری بھی آتی ہے آپ کو؟"

"اگر شاعری نام ہے بیان حقیقت اور اظہار واقعہ کا تو بے شک آتی ہے ورنہ نہیں۔"

"جی نہیں شاعری میں معاف کیجیے گا، مبالغہ ہوتا ہے، رائی کا پہاڑ ہوتا ہے اور اگر زیادہ سچ بولنے پر مجبور کریں گی تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ جھوٹ اور دروغ سے بھی کام لیتے ہیں شاعر، — کیا آپ یہ الزام، اتنا بڑا اور سنگین الزام تسلیم کرتی ہیں؟"

"اگر شاعری کی وہی تعریف ہے جو آپ نے کی ہے اور شاعر ہونا الزام ہے تو آپ اپنی صفائی دیجیے کیونکہ مبالغہ اور رائی کا پہاڑ آپ کی باتوں میں ہے اور میری بات جو آپ نے شاعروں کے لیے کہی تھی اتنی جرأت نہیں کر اسے لوٹا سکوں۔"

"یعنی جھوٹ اور دروغ؟"

"جی ہاں — لیکن یہ آپ کے الفاظ ہیں میرے نہیں۔"

"اچھا میں بحث کو طول نہیں دیتا، ورنہ شاید آپ لڑنے پر تیار ہو جائیں گی اور میرا جہاں تک تعلق ہے میں ساری دنیا سے لڑ سکتا ہوں مگر ——"

"مگر مجھ سے نہیں لڑ سکتے؟"

"جی ہاں واقعی مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے۔"

"مگر اتنی دیر سے یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"باتیں — کیا باتیں کرنے کو بھی آپ لڑائی سمجھتی ہیں؟ — پھر تو مجھے چپ

ہو جانا چاہیے ۔۔۔ لیکن ایک سوال ضرور کروں گا ، اس کا جواب دیجیے ۔"

" فرمائیے کیا سوال ہے آپ کا ؟"

" سوال یہ ہے کہ ہمت رائے کے پنجۂ ہوس سے بچ نکلنے کے بعد بھی آپ مغموم اور افسردہ کیوں ہیں ؟ آپ کی اس کیفیت نے مجھے بھی پریشان اور دلگیر بنا رکھا ہے ۔ کیا آپ میرے لیے بھی خوش نہیں رہ سکتیں ؟"

" آپ کے لیے سب کچھ ، جو ناممکن ہو ۔ وہ بھی کر سکتی ہوں ، اب کوشش کروں گی آپ مجھے افسردہ نہ دیکھیں ۔"

" لیکن اس افسردگی کا کوئی سبب بھی تو ہوگا ۔"

" کیا وہ آپ کو نہیں معلوم ؟"

" بالکل نہیں معلوم ۔"

" آپ جانتے ہیں میں قید میں ہوں ، میں ہمت رائے کی قیدی ہوں ، اس نے میری تلاش میں زمین و آسمان ایک کر دیئے ، اس کے آدمیوں نے جنگل جنگل ، دریا دریا ، اور صحرا صحرا مجھے تلاش کیا ۔ اور بالآخر مجھے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے وہ مجھے پکڑ کر لائے اور ہمت رائے کے سامنے اس طرح ڈال دیا جس طرح بھیڑ کے پر کتر دیئے جائیں اور وہ صیاد کے سامنے بے بسی کے ساتھ تڑپ رہا ہو ۔ اس نے مجھے ذلیل کیا ، گالیاں دیں ۔ مذاق اڑایا میرا ۔ صرف اسی پر اکتفا نہ کیا ، دھمکیاں دیں اور اس کے بعد اس قلعہ میں لا کر بند کر دیا ۔ اب پھر میری زندگی ، میری آبرو میرا ناموس اسی کے ہاتھ میں ہے ۔ اب پھر زندگی کے مقابلہ میں موت مجھے زیادہ عزیز ہے ، آپ ہی انصاف سے کہئے کیا مجھے خوش رہنے کا حق ہے ؟ کیا مجھے زیادہ بھی غمگین اور افسردہ رہنے کا اس دنیا میں کوئی استحقاق رکھتا ہے ؟"

یہ کہتے کہتے رانی کی آنکھیں پھر آب گوں ہو گئیں ۔ لیکن اس نے ضبط سے

اور آنسو نکلنے نہیں دیئے ۔ احمد خاں نے اس کی یہ کیفیت بھانپ لی تسلی اور دلدہی کے لہجہ میں اس نے کہا :

" آپ پریشان نہ ہوں ، ہمت رائے آپ کا کچھ نہیں کر سکتا ۔"

اس افسردگی اور اضطراب کے باوجود رانی مسکرانے پر مجبور ہوگئی ۔ اس نے کہا :

" ہمت رائے وہ شخص ہے جس نے آپ جیسے ساونت اور بہادر کو اس پنجرے میں قید کر رکھا ہے ، اس کا داؤں آپ پر تو چل سکتا ہے لیکن وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟"

احمد خاں کچھ سوچنے لگا ، تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا ۔

" وہ اس وقت تک آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا جب تک احمد خاں زندہ ہے ۔ جب تک احمد خاں کے بازوؤں میں دم ہے ، ہاں وہ قتل ہو لے تو بے شک وہ سب کچھ کر سکتا ہے ، لیکن اس کا قتل کرنا بھی بچوں کا کھیل نہیں ہے ، وہ اس کو مار کے گا تب مرے گا ۔"

رانی یہ باتیں غور اور توجہ سے سنتی رہی ، پھر بولی ،

" میں جانتی ہوں میری جان اور آبرو بچانے کے لیے آپ جان پر کھیل سکتے ہیں ، اور اس میں صرف میری ہی تخصیص نہیں ہر بے کس اور مظلوم کے لیے آپ ایسا کر سکتے ہیں ، لیکن آپ اس حقیقت کو کیوں نظر انداز کر رہے ہیں کہ اس نے یہاں آپ کو اس لیے قید نہیں کیا ہے کہ آپ آرام کریں ، ستائیں ، تفریح کریں ، اس لیے قید کیا ہے کہ کسی دن بار آپ کو قتل کر دے ۔ وہ اتنا پاپی ہے کہ ہرگز آپ کو معاف نہیں کر سکتا ۔"

احمد خاں نے ہنس کر کہا :

" اور میں اتنا بے غیرت بھی نہیں ہوں کہ اس کی معافی کا ننگ گوارا کروں ! تو پھر کیا بہادری کے معنی یہ ہیں کہ آپ ہنستے ہنستے مسکراتے قتل ہو جائیں ۔"

"نہیں، یہ بھی میری ذلت ہے۔ میں اس کے ہاتھ سے موت کا جام نہیں پی سکتا۔"

"تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟ کیا کریں گے آپ؟"

"جس طرح آٹے سے بال نکلتا ہے اسی طرح نکل جاؤں گا اس پرانے راج بھون سے، اس ناقابل تسخیر حصار سے!"

"لیکن کیونکر؟"

"یہ سوچنا میرا کام ہے"

"مگر رگھو؟ کیا وہ آپکے پاؤں کی زنجیر تو نہیں بنے گا؟"

احمد خاں کچھ سوچنے لگا، پھر اس نے بے بسی کے ساتھ گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا:

"ہاں رانی میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

رانی نے متحیر اور سراسیمہ ہو کر احمد خاں کی طرف دیکھا اور گویا ہوئی۔

"یعنی؟ —— کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

احمد خاں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"رانی میں کچھ نہ کرنے پر مجبور ہوں، کسی قیمت پر بھی میں رگھو، آنند، اور راجو کے لیے مصیبت نہیں بن سکتا۔ تم نہیں جانتیں، یہ کتنے اچھے لوگ ہیں، تمہیں نہیں معلوم، میرے بدترین دشمن کے ملازم ہونے کے باوجود، یہ کس طرح میری خدمت کرتے ہیں، انھیں مجھ پر اعتماد ہے، یہ مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں، یہ تمہت راے کی ہدایات کے برخلاف، ہر سہولت اور آسانی مجھے بہم پہنچاتے ہیں۔ میں بچ جاؤں اور انھیں موت کے منہ میں چھوڑ جاؤں تو جانتی ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"نہیں جانتی کیا انجام ہوگا، آپ ہی بتائیے"

احمد خاں نے جوش اور جذبہ کے عالم میں کہا:

"پھر مجھے اپنے وجود سے نفرت ہو جائے گی، میں خود اپنے آپ سے متنفر ہو جاؤں گا پھر خودکشی کے سوا میرے لیے کوئی چارۂ کار نہیں رہ جائے گا۔"

رانی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی!

ابھی ذرا دیر پہلے احمد خاں کی باتوں نے اسے ڈھارس دی تھی، تسلی دی تھی، اسے یقین ہو گیا تھا، اب وہ بھی بچ جائے گی، اور احمد خاں بھی لیکن ان باتوں نے وہ اطمینان چھین لیا، وہ ڈھارس ختم ہو گئی، وہ مسرت جو ذرا دیر کے لیے دل کے غم کدے میں اٹھی تھی، رخصت ہو گئی، اسے اپنی جان کی اپنی زندگی کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی احمد خاں کی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے وہ خوفناک منظر ایک مرتبہ پھر آگیا جسے بارہا، عالم تصور میں دیکھ دیکھ کر وہ لرز اٹھی تھی۔ کانپ اٹھی تھی۔

یعنی احمد خاں کا کٹا ہوا سر!

احمد خاں کا لاشہ بے جان۔

پہلے بھی یہ منظر عالم تصور میں اس نے دیکھا تھا، اس کی روح تڑپ اٹھی تھی۔ اور اب پھر پوری ہولناکی کے ساتھ وہ منظر نظر کے سامنے تھا۔

وہ جانتی تھی، اس مختصر سی مدت میں جو یہاں گزری تھی اس نے اچھی طرح اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے لیکن اپنی آن اور اپنے عزم کو اس محبت پر قربان نہیں کر سکتا۔ وہ سمجھ رہی تھی جو کچھ اس کے منہ سے نکلا ہے وہ ہو کر رہے گا۔

پھر وہ کیا کرے؟ ایک ہی ترکیب سمجھ میں آسکی، اور اسی پر اس نے عمل کیا:

"تو پھر ابھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر۔"

اور وہ رونے لگی۔

اسے روتا دیکھ کر احمد خاں اٹھ کر ٹہلنے لگا، اتنے میں دروازہ کھلا اور رگھو

نمودار ہوا، اس کے چہرے پر بھی اس وقت عجیب کیفیت طاری تھی، رانی کا
دل دھڑکنے لگا۔
"کہیں یہ قتل کا پروانہ لے کر تو نہیں آیا ہے؟"

اُڑ گیا پنچھی

قفس کی تیلیاں توڑیں تڑپ کر
نہیں آتا انہیں آزاد کرنا!

(۱)

خبرِ بد

رگھو نندن خلافِ معمول اس وقت بہت سنجیدہ اور متفکر نظر آ رہا تھا، جب بھی وہ احمد خاں یا رانی کے سامنے آتا تھا اس کے ہونٹوں پر تبسم کھیلتا رہتا تھا لیکن آج ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے کسی گہری فکر نے اسے تشویش اور اضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

یہ بات رانی نے بھی تاڑ لی اور احمد خاں نے بھی، دونوں نے تقریباً بیک آواز پوچھا
"کیا بات ہے رگھو، تم کبھی اتنے سنجیدہ تو نظر نہیں آئے تھے، آج کیا بات ہے؟ کچھ ہم کو بھی تو بتاؤ؟"

رگھو ایک طرف خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس نے کہا:
"میں ایک بہت بری خبر لے کر آیا ہوں!"

احمد خاں کے چہرے سے کسی طرح کے تاثر کا اظہار نہیں ہوا، گویا وہ ہر طرح کی خبر سننے کو تیار ہے، لیکن رانی کانپ گئی، اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا:
"کیا ہے وہ خبر؟"

رگھو پر صدمہ، اضطراب اور سراسیمگی کا عالم طاری تھا اس نے کچھ کہنا چاہا مگر

کہہ نہ سکا، احمد خاں نے مسکراتے ہوئے کہا :

" کیا بات ہے رگھو؟ شاید ان لوگوں نے میرے قتل کا فیصلہ کر لیا ہے، بلکہ یہ بری خبر ہے؛ نہ خلافِ توقع ——— (زیرِ لب تبسم کے ساتھ) لیکن یہ کام کون انجام دے گا تم یا آنند؟"

رگھو رونے لگا، اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا :

" اگر آپ نے مجھے جوتے مار لیے ہوتے، قتل کر دیا ہوتا تو بھی مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی، کیا آپ اتنا نیچ سمجھتے ہیں مجھے؟ میرا ہاتھ اٹھ سکتا ہے آپ پر؟"

رانی اٹھی اور ایک بھکارن کی طرح رگھو کے سامنے آ کھڑی ہو گئی، کہنے لگی :

" رگھو بھائی بھگوان کے لیے کہہ دو، تم بری خبر نہیں لائے ہو، اور اگر لائے ہو تو وہ میرے قتل کی ہے۔ ان کی (احمد خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) نہیں۔"

احمد خاں نے ذرا درشت اور سخت لہجہ میں رانی کو مخاطب کیا :

" اتنی کمزور اور بزدل نہ بنو رانی"

رانی نے احمد خاں کو جواب نہیں دیا، اسی طرح دست بستہ رگھو کے سامنے کھڑی رہی؛ اس نے التجا کے انداز میں کہا :

" رگھو بھائی، میں ابھی اور یہیں مرنے کو تیار ہوں۔ تلوار لاؤ اور اشارہ دو میری گردن لیکن بھگوان کے لیے انکار کر دو کہ تم ان کے قتل کا فرمان لے کر نہیں آئے ہو جب تک جواب نہیں دے دیتے میں اسی طرح کھڑی رہوں گی۔"

رگھو نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن تکلم نے ساتھ نہ دیا۔ رانی اب صورتِ حال کو سمجھ چکی تھی اس نے کہا :

" اور اگر تم ہم دونوں کا فرمانِ قتل لے کر آئے ہو، تو پھر بھی اتنا رحم کرو کہ پہلے مجھے اس دنیا سے رخصت ہو لینے دو۔"

احمد خاں نے آج پہلی مرتبہ رانی کے بدن میں ہاتھ لگایا، اس نے اس کا بازو پکڑا اور اسے بٹھاتے ہوئے کہا :

" رانی تم خاموش ہو جاؤ ——— بالکل خاموش رہو۔"

رانی مزاحمت نہ کر سکی، بیٹھ گئی اور بے بسی کے ساتھ احمد کی طرف دیکھنے لگی۔ احمد اس کی اس کیفیت سے متاثر ہوا اور اپنے سخت برتاؤ پر نادم بھی ہوا۔ اس نے شاید تلافی کی کوشش کرتے ہوئے نرم اور ملائم لہجہ میں کہا :

" میں جانتا ہوں تمہیں میری زندگی عزیز ہے، اس لیے عزیز تر ہے کہ تم مجھے عزیز رکھتی ہو ———"

وہ بول پڑی " میں آپ کے بارے میں کوئی بری خبر نہیں سن سکتی ———"

احمد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا :

" یہ بات بھی مجھے معلوم ہے لیکن رانی، تم مجھے بچا نہیں سکتیں ———"

وہ بیٹھے بیٹھے انتہائی بے تابی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی :

" بچالوں گی، میں آپ کو بچالوں گی۔ میرے ہوتے آپ کو کسی طرح کا گزند نہیں پہنچ سکتا۔ میں موت کا پنجہ مروڑ دوں گی، اس کے سامنے اپنے آپ کو پیش کر دوں گی۔"

احمد نے ہاتھ کے اشارہ سے اسے روکا اور کہا۔

" یہ جذباتی باتیں ہیں رانی، موت کا ایک وقت مقرر ہے اور اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔"

وہ مضطرب ہوتی ہوئی بولی " کیوں نہیں ٹال سکتا؟"

احمد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا " اس لیے کہ یہ وقت خدا نے مقرر کیا ہے، اور اس دنیا میں کوئی ایسا ہے جو خدا کا ہاتھ پکڑ سکے؟ خدا کا فیصلہ بدل سکے؟ خدا کے حکم کو ٹال سکے؟ ——— نہیں رانی ایسا نہیں ہو سکتا، خدا نے موت کا جو وقت مقرر کر دیا ہے"

وہ اٹل ہے —"

رانی نے بڑی بے بسی کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"اٹل ہے؟"

احمد کو ترس آگیا اس بے بسی کے سوال پر، اس نے جواب دیا۔

"ہاں رانی اٹل ہے، لیکن ایک بات تو سنو، جس طرح موت کا وقت اٹل ہے اسی طرح اس بات کا بھی تو یقین کرو، کہ جب تک وہ وقت نہیں آجاتا، دنیا کی کوئی طاقت موت کو بلا بھی نہیں سکتی۔ اگر میرا وقت نہیں آیا ہے، تو دس ہزار رانا لاکھ اور ایک لاکھ ہمت رانے بھی مجھے نہیں مار سکتے' اور اگر آگیا ہے تو پھر میرے قتل کا فیصلہ واپس لے لیا جائے تو بھی مجھے مرنا پڑے گا۔ کوئی بیماری، کوئی حادثہ، کوئی زخم بھی میری ہستی ناپائدار، اور زندگی مستعار کو ختم کر دے سکتا ہے۔"

رانی یہ تقریر چپ چاپ سنتی رہی، کچھ بول نہ سکی، احمد نے اسے مزید دلاسا دیتے ہوئے کہا:

"ہمارے رسولؐ کے بھائی اور خلیفہ حضرت علیؓ کا قول ہے" موت میری محافظ ہے" کتنی بلیغ بات ارشاد فرمائی ہے، کتنا اونچا فلسفہ ہے یہ، اور اس سے بڑھ کر کیا بات اور جو بھی کیا سکتی ہے؟ جب تک ہمارا وقت نہیں آجاتا موت خود ہماری حفاظت کرے گی، ہر حادثہ ٹل جائے گا۔ ہر آفت لوٹ جائے گی۔ ہر بیماری صحت سے بدل جائے گی۔ اور جب وقت آگیا تو ایک معمولی سی پھانس، زندگی کا رشتہ منقطع کرنے کے لیے کافی ہے بغیر بیماری کے بھی آدمی مر سکتا ہے۔"

رانی اب بھی خاموش رہی، احمد نے بہت زیادہ اپنائیت، دل سوزی، اور ... کے ساتھ پوچھا:

"کیوں رانی مطمئن ہو گئیں تم؟"

رانی نے منہ سے کچھ نہیں کہا مگر دن ہلا دی، اگویا لکنت ہو گئی، احمد اس کے اور قریب آگیا، اس نے کہا:

"میں تمہارا اترا ہوا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ میری حالت خیر ہونے لگتی ہے تمہیں مغموم اور دلگیر دیکھ کر، اب تک تم پر دہی کیفیت طاری ہے؟ آخر کیوں؟"

رانی اب بھی منہ سے کچھ نہیں بولی، آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، احمد نے اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے، اور گویا ہوا:

"ہر معاملہ میں ضد نہیں کرتے، کبھی دوسروں کی بھی مان لیتے ہیں؟ آخر تم نے میرے دل پر آرے چلانے کا فیصلہ کیوں کر لیا ہے؟"

رانی نے اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا:

"آخر آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟"

وہ بولا "صرف یہ کہ ہنسو، مسکراؤ، خوش رہو!"

وہ زہر خند کرتی ہوئی بولی:

"کس تقریب میں؟ کس لیے؟ کیوں؟"

وہ کہنے لگا "اس لیے کہ جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے، اس لیے کہ جس وقت کا کھٹکا تھا، وہ وقت آگیا آخر"۔ اس لیے کہ اب ہم اس دنیا میں پھر کبھی نہیں مل سکیں گے ... وقت۔ یہ تھوڑا سا وقت قدرت نے عطا کر دیا ہے اس سے فائدہ کیوں نہ ... ہنسی بول کر کیوں نہ صرف کر لیں؟ اب تک میں نے تم سے کچھ نہیں ... اجازت دو تو آج ایک بات کہوں؟"

رانی ... نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی وہ بولا:

"صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں — میں تم سے محبت کرتا ہوں!"

... غم و الم ہونے کے باوجود یہ الفاظ سن کر شادی مرگ کی کیفیت طاری

ہوگئی رانی پر۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کہ واقعی اس نے ملا کی مراد پالی ہے۔ یہ نعمت اسے اتنی اچانک، یوں دفعتاً مل جائے گی اسے تو اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچا تھا۔

وہ دل و جان سے اسے چاہتی تھی۔

آج سے نہیں اسی دن سے جب پہلے پہل اس نے اس ترک تیغ زن، اس جوان حسن مردانہ کے اس پیکر کو دیکھا تھا لیکن وہ خود بھی اس سے محبت کر سکتا ہے، اس کا یوں علی الاعلان اقرار کر سکتا ہے، یہ آس تو اس نے کبھی نہیں باندھی تھی۔

اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک پیدا ہوئی۔ نشاط لازوال کی کیفیت چہرۂ زیبا پر چھا گئی "جاں نذر دیتی بھول گئی اضطراب میں"

یکایک احمد خاں کے الفاظ اس کے کانوں میں پڑے وہ کہہ رہا تھا:

"محبت ایسی چیز نہیں جو الفاظ کا بوجھ اٹھا سکے، وہ بے انتہا نازک چیز جیسے آبگینہ، محبت ایسی چیز بھی نہیں جو اقرار و اعلان کی رسوائی برداشت کر سکے۔ وہ تو ایک کیفیت ہے اور اس لیے ہے کہ دل اس سے لذت لیتا رہے۔ محبت بے زبان ہوتی ہے اور اسے بے زبان ہی رہنا چاہیے۔ اس کی زبان بے زبانی ہی ہے، یہ لفظ یہ اقرار، میری زبان تک نہ آتا اگر میں تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت نہ ہو رہا ہوتا۔ میں جانتا ہوں تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو اور میں تمہیں مطمئن کرنے کے لیے یہ اقرار کر رہا ہوں۔ امید ہے تم مجھے اور میری محبت کو یاد رکھو گی —— یاد رکھو گی نا؟"

رانی کی آنکھوں سے بھر چوئے اشک رواں ہو گئے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"ان الفاظ نے وہ سب کچھ مجھے دے دیا، جس کی میں آرزو کر سکتی تھی یہ مہربانی

میری زندگی کے ساتھی ہیں۔ یہ موت کو بھی مجھ پر آسان بنا دیں گے۔ آپ نے مجھے سب کچھ دے دیا۔ میری توقع سے کہیں زیادہ۔ میں اس قابل نہ تھی، لیکن آپ نے میرے ٹوٹے ہوئے اور حسرت نصیب دل کو نئی زندگی عطا کر دی۔ جی چاہتا ہے آپ کا شکریہ ادا کروں لیکن کس طرح؟"

"(مسکراتے ہوئے) کیا میں بتاؤں کہ میرا شکریہ کس طرح تمہیں ادا کرنا چاہیے؟"

"ہاں بتائیے، آپ ہی سے پوچھ رہی ہوں۔"

"لیکن مشکور تو میں ہوں شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے۔"

"یہ کیوں؟ یہ کیسے؟"

"تم نے اپنے دل میں ایک ایسے شخص کو جگہ دی جو اس کا سزاوار نہ تھا، مجھ سے تمہیں نفرت کرنی چاہیے تھی، اس سے محبت کرنے لگیں، جو اس لائق تھا کہ آپ کے قتل کا تماشہ دیکھتیں، اس پر اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہو گئیں۔ کیا یہ بہت بڑی نعمت نہیں ہے؟ کیا میں اس کا شکریہ نہ ادا کروں؟"

"(مسکراتے ہوئے) آپ چور بھی ہیں؟"

"چور؟ —— نہیں!"

"ضرور ہیں، آپ نے میرے الفاظ چرا لیے، آپ نے میرے دل کی بات چھین لی، جو بات میرے لب تک آتی آتی رہ گئی وہ آپ نے کہہ دی، ایک چور اس سے زیادہ اور کیا کرے گا؟"

"تو میں اس الزام کو تسلیم کیے لیتا ہوں، لیکن ایک عہد لینا چاہتا ہوں تم سے۔ وعدہ کرو؟"

"کیا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ آپ کی بات رد بھی کی جا سکتی ہے میری جان سے ہم ادکم ہوش و حواس کے عالم میں تو ایسا نہیں ہو سکتا!"

"میں چاہتا ہوں تم اسلام قبول کر لو!"

ذرا سے تامّل کے بعد رانی نے کہا،

"کیوں چاہتے ہیں آپ یہ بات؟"

وہ بولا "اس لیے کہ دنیا کی زندگی بہت مختصر ہے اگر عمر طبعی تک انسان جیے تو کتنا جیے گا؟ حد سے حد سو برس، لیکن یہ سو برس کی مدت ہمیشگی کے مقابلہ میں لمحہ سے ایک سیکنڈ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، اس زندگی کے بعد جو زندگی شروع ہوگی وہ فنا پذیر نہیں ہوگی، ایک مرتبہ مر کر انسان امر ہو جاتا ہے پھر کبھی نہیں مرتا، ہمیشہ زندہ رہتا ہے، میں چاہتا ہوں رانی میری خواہش ہے کہ اس زندگی کے بعد جب ہمیشگی کی زندگی حاصل ہو تو میں اور تم جدا جدا نہ رہیں۔ ہماری روح ایک دوسرے کو قبول کر چکی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ "ہم کہیں اور تم کہیں"؟"

جواب میں رانی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ کمرہ ایک زوردار قہقہہ سے گونج اٹھا،

یہ رگھو نندن کا قہقہہ تھا،

وہ بے تحاشہ اور بے ساختہ ہنسے چلا جا رہا تھا، احمد خاں نے حیرت سے اس کو دیکھا،

پھر پوچھا،

"تم ہنس کیوں رہے ہو رگھو؟"

وہ اسی طرح ہنستا ہوا بولا "اس بات پر، کہ اس دنیا میں آپ جیسے اونچے درجے اور نیک لوگ بھی خود غرض ہو سکتے ہیں!"

احمد خاں کے چہرے کا رنگ بدل گیا، اس نے ایک حد تک ترشی کے ساتھ پوچھا،

"میں خود غرض ہوں؟ ―― کونسی خود غرضی دیکھی تم نے مجھ میں؟"

رگھو نے جواب دیا، اس سے بڑھ کر آپ کی ―― اور مجھے رانی سے جو شکایت ہے ―― خود غرضی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے رانی کے ساتھ اس زندگی کی دیوار

قدم رکھنے کا فیصلہ کر لیا، جہاں موت کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہوگی اور مجھ سے بات بھی نہ پوچھی، ویسے رانی نے بھی مجھے بھائی بنا لیا ہے، اور میرا خیال ہے کہ آپ بھی مجھے بھائی سے کم نہیں سمجھتے؟ ―― کیا میں اس قابل نہیں تھا کہ مجھے بھی آپ ساتھ رکھنے کی کوشش کرتے، جس طرح بے لوث، سچی، اور کھری خدمت میں آپ کی یہاں کر رہا ہوں وہاں بھی کرتا۔"

احمد مسکرانے لگا، "اچھا یہ بات ہے؟"

رگھو نے جواب دیا "جی ہاں یہ بات ہے، لیکن معمولی نہیں بہت بڑی بات ہے۔"

احمد نے شائستگی اور ملائمت کے ساتھ جواب میں کہا:

"ہاں ہے تو، لیکن میرے بھائی دین اور مذہب کا معاملہ ایسا نہیں ہے جو مروت یا جبر سے اختیار کیا جائے، اور اسلام تو خاص طور پر، اس معاملہ میں جبر و اکراہ کا قائل نہیں ہے۔"

وہ بولا، "ہاں یقیناً نہیں ہے اتنا تو میں بھی جانتا ہوں۔"

"پھر میں تمہیں پرانا دین چھوڑ کر نیا دین اختیار کرنے پر کس طرح مجبور کرتا؟ یہ تو خوشی کا سودا ہے، اگر اسلام کو تم صحیح مذہب سمجھتے ہو تو از خود بغیر میرے کہے سنے قبول کر لو اور اگر ایسا نہیں ہے تو اپنے دین پر قائم رہو۔"

"اسلام میرے نزدیک صحیح دین ہے یا غلط یہ تو پھر بتاؤں گا، لیکن اگر بات وہی ہے جو آپ نے فرمائی تو پھر رانی کو اتنی دل سوزی اور حسرت کے ساتھ کیوں صلاح دی آپ نے مسلمان بن جانے کی؟"

(مسکراتے ہوئے) اس لیے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں، وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ ہم دونوں کی روح ایک ہو چکی ہے۔ خدا نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے لیے پیدا کیا ہے، میں جنت میں بھی بغیر ان کے نہیں رہ سکتا اور ――

"میرا خیال تھا کہ آپ مجھ سے بھی محبت کرتے ہیں کیونکہ مجھے آپ سے محبت ہے۔ میرا یہ خیال بھی تھا کہ ہم دونوں کی روحوں میں جو اتحاد ہے وہ ہر چیز سے بالا ہے، مگر آج معلوم ہوا کہ میرا خیال غلط تھا" "خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم"۔

احمد نے رگھو کو گلے سے لگا لیا اور کہا :

"یہ بات نہیں ہے رگھو، مجھے تم بہت عزیز ہو، بھائی سے بھی زیادہ"

رگھو نے طنز کیا "جی ہاں الفاظ کی حد تک"

احمد نے ابھی کچھ جواب نہیں دیا تھا کہ آنند آ گیا۔ اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

---

(۲)

جذبۂ وفا

رانی اس وقت سراپا اضطراب بنی ہوئی تھی۔ رگھو کے منہ سے یہ سن کر کہ وہ ایک بری خبر لایا ہے، اسے اندیشہ ہائے دور و دراز نے گھیر لیا تھا، اور اب آنند کو سراسیمہ اور دہشت زدہ دیکھ کر اس کی جان نکل گئی۔ وہ سوچنے لگی آج ضرور کچھ ہونے والا ہے، آج قسمت کوئی نہ کوئی گل کھلا کر رہے گی۔ اس نے چاہا کہ پوچھے آنند کیا بات ہے تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ کیا رگھو کی طرح تم بھی کوئی خبر بد لے کر اپنے ساتھ آئے ہو؟ قتل کی خبر لے کر تو رگھو آیا تھا، پھر تم کونسی خبر لے کر آئے ہو؟ — لیکن اس کے منہ سے ایک حرف تک نہ نکلا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گونگی ہو گئی ہے، اسے بولنا ہی نہیں آتا۔

آنند نے ان لوگوں سے کوئی بات نہیں کی، البتہ رگھو سے پوچھا :

"تم کب آئے یہاں"

اس نے جواب دیا "ابھی تھوڑی دیر ہوئی آیا ہوں — کیوں ؟"

وہ کہنے لگا، "کیا ہمت رائے سے تمہاری کوئی بات ہوئی تھی یہاں آنے سے پہلے ؟"

جواب میں وہ بولا "ہاں، اس نے مجھے بلایا تھا، اور بات بھی ہوئی تھی—

— لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا تمہیں بھی بلایا تھا؟ تم سے بھی کوئی بات ہوئی تھی؟
وہ بولا "ہاں وہیں سے تو آرہا ہوں!"
رگھو کے چہرے پر سفیدی چھاگئی، اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا:
"کیا تم سے بھی وہی بات ہوئی جو مجھ سے ہوئی تھی؟"
ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ کہنے لگا۔
"ہاں رگھو —— لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوگا؟"
رگھو کے چہرے پر خوشی کا رنگ چھاگیا، اس نے سوال کیا:
"کیا تم بھی یہی سوچ رہے ہو آنند؟"
وہ گویا ہوا "کیا مجھے اپنے سے جدا سمجھتے ہو؟ کیا آنند اور رگھو دو میں گھنٹوں اور پہروں، دن میں اور رات میں، کیا ہم دونوں اس مسئلہ کو نہیں سوچا کرتے تھے؟ کیا ہم دونوں نے فیصلہ نہیں کر لیا تھا کہ ——
رگھو اٹھ کھڑا ہوا، اس نے اعتماد اور اطمینان کی نظروں سے آنند کو دیکھا اور پوچھا:
"تو کیا تم اس فیصلہ پر قائم ہو؟"
آنند نے عزم، اور تہور کے ساتھ جواب دیا:
"مرد اپنے قول سے نہیں پھرا کرتے، کیا تم آنند کو اب تک نہیں سمجھ سکے؟"
رگھو پر سر خوشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی، اس نے سراپا نشاط و سرور بن کر سوال کیا:
"میں آنند کو اتنا ہی جانتا ہوں، جتنا اپنے آپ کو، مجھے تم پر فخر ہے، میں اپنے بھائی پر بھی اتنا اعتماد نہیں کرتا جتنا تم پر، راجو سے مجھے کتنی محبت ہے جانتے ہو، لیکن ایک لمحہ بھی تامل کیے بغیر اگر وقت پڑ جائے تو راجو کو تم پر قربان

کر سکتا ہوں۔"
آنند نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن مجھے بھی تو قربان کر سکتے ہو کیسی بری۔۔۔ کیا نہیں؟"
رگھو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "نہیں کیسے کہہ سکتا ہوں؟ لیکن کیا تم مجھ سے پیچھے ہو؟ تم بھی ایسا نہیں کر سکتے؟"
آنند نے جواب دیا "ہاں بھئی، ہم دونوں قربان ہو جائیں گے مگر (احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ان پر آنچ نہیں آنے دیں گے ——"
احمد حیران و پریشان ان دونوں کی یہ مبہم سی باتیں سن رہا تھا، اب اس نے پوچھا:
"تم لوگ اتنی دیر سے میرے بارے میں باتیں کر رہے تھے؟"
آنند نے کہا "جی ہاں آپ ہی کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔"
احمد نے پوچھا "تو بتاؤ بات کیا ہے؟ —— اتنا تو رگھو کے آتے ہی اور ایک منٹ یہ سنتے ہی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ میرے قتل کا فیصلہ ہو چکا ہے، شاید تم بھی یہی خبر لائے ہو۔ مگر یہ قربانی کا قصہ کیسے چھڑ گیا یہ سمجھ میں نہیں آیا، کون قربان کر رہا ہے؟ کس کے لیے ہو رہی ہے؟ اور کیوں؟ کچھ معلوم تو ہونا چاہیے۔"
آنند نے سوال کیا "کیا اب تک رگھو نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟"
"نہیں!" احمد خاں نے جواب دیا۔

فرمایا، "ہاں آخری، اور قطعی، پرسوں صبح تڑکے اس حکم کی تعمیل بھی ہو جائے گی۔"

میں نے پوچھا "کیا قیدی کو اطلاع دے دوں؟"

مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہاں اسے یہ خوشخبری سنا دو اسے اطلاع دے دو کہ وہ پرسوں صبح صبح قتل کر دیا جائے گا!"

احمد خاں نے بے پروائی کے ساتھ کہا، "اگر میرا وقت آ گیا ہے تو میں خوشی سے موت کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہوں۔"

رگھو نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "کس کا وقت آیا ہے اور کس کا نہیں یہ بات صرف بھگوان ہی کو معلوم ہے۔ بہرحال ہمت رائے کا فیصلہ یہی ہے۔"

رانی نے بڑی مایوسی اور آشفتگی کے عالم میں سوال کیا۔

"تو کیا تم مرجانے دوگے۔ انھیں (احمد خاں کو)؟"

رگھو اور آنند نے تقریباً بیک آواز کہا "جب تک ہم زندہ ہیں اس وقت تو ان کا بال بیکا نہیں ہو سکتا۔ ہاں ہماری گردن کٹ جائے، پھر چاہے جو کچھ ہو۔"

احمد خاں: تو کیا تم مجھے بچا لوگے؟

آنند: ارادہ تو یہی ہے۔

رگھونندن: نہ بچا سکے تو اپنی جان تو دے ہی دیں گے۔

احمد خاں: لیکن یہ کچھ نہیں ہوگا۔ میں راجو پر اتنا بڑا ظلم نہیں کر سکتا، اپنی وجہ سے اسے بیوہ نہیں بننے دوں گا۔

راجو: یہ کہیے، اگر ان کی جان آپ کے کام آ جائے تو مجھے خوشی ہوگی، میں ہمیشہ قائم خوشی سے سر دوں گی۔

احمد خاں: (حیرت سے) راجو یہ تم کہہ رہی ہو؟

راجو: (خود اعتمادی کے ساتھ) ہاں اور سچے دل سے کہہ رہی ہوں۔

(۳)

اِنکشاف

رگھونندن نے کہا "لیکن آپ نے اور رانی نے مجھے بولنے کا موقع ہی کب دیا! میں تو صرف اتنا کہہ پایا تھا کہ ایک بری خبر لے کر آیا ہوں، اتنا منہ سے نکلا تھا کہ آپ دونوں میں، وہ بحث شروع ہو گئی کہ میں تو حیران رہ گیا۔ لاکھ لاکھ بولنے کی کوشش کی، بار بار ارادہ کیا کہ بولوں، لیکن آپ خاموش ہوتے تو رانی بولنے لگتی تھیں، وہ خاموش ہوتی تھیں تو آپ کا سلسلۂ کلام شروع ہو جاتا تھا۔"

رانی نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا "اچھا بھئی جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اب شروع کر دو اپنی کہانی!"

رگھو نے بتایا "آج ہمت رائے کے دربار میں طلبی ہوئی تھی۔ میرے [illegible] دیکھتا گیا ہوں، غیر معمولی طور پر خوش اور مسرور ہیں مجھے دیکھتے ہی باچھیں کھل گئیں —

"مہارانا نے فیصلہ کر لیا ہے کہ احمد خاں کو قتل کر دیا جائے —"

یہ سن کر میری جان نکل گئی لیکن اپنے ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے سوال کیا:

"کیا یہ آخری فیصلہ ہے؟"

احمد خاں : میں اس جذبہ کی قدر کرتا ہوں ، لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

رانی : آخر آپ کی ان باتوں کا مطلب کیا ہے ؟

احمد خاں : مطلب صرف یہ ہے کہ اپنے لیے کسی اور کو مبتلائے مصیبت کرنا ... کسی حیثیت پر بھی مجھے گوارا نہیں۔

رگھوناتھ : کیا رانی کے لیے بھی نہیں ؟

احمد خاں : رانی کو کیا ہوا ہے ؟

رگھوناتھ : ہمت رائے نے مہارانا سے رانی کے قتل کی بھی اجازت حاصل کر لی ہے ، وہ بھی آپ کے ساتھ قتل کی جائے گی۔

احمد خاں : لیکن رانی کا جرم ؟

رگھوناتھ : اس کے تین جرم ہیں اور تینوں ناقابل معافی ہیں ، پہلا جرم یہ ہے کہ وہ ہمت رائے کی ہوس کا نشانہ بننے پر تیار نہیں ۔ نہ جبر و جور سے ، نہ مال و زر سے ، نہ ترغیب اور دھمکی سے ۔ اب ہمت رائے اس سے بالکل مایوس ہو چکا ہے۔

احمد خاں : اور دوسرا جرم ؟

رگھوناتھ : اور دوسرا جرم پہلے سے زیادہ ناقابل معافی ہے ، وہ یہ ہے کہ وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔

احمد خاں : کیا ہمت رائے کو الہام ہوتا ہے ؟ وہ رانی کے دل کا حال کیا جانے ؟

رگھوناتھ : رانی نے خود اس کے سامنے اس جرم کا اقرار کیا ہے ؟

احمد خاں : (رانی کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے) یہ کیا حرکت تھی ؟

رانی : تو کیا جھوٹ بول دیتی ؟

احمد خاں : کیا اس نے یہ سوال کیا تھا ؟

رانی : ہاں ، اس نے یہ سوال کیا تھا ۔ میں نہیں جانتی اس کے دل میں یہ خیال کیوں آیا ؟ لیکن جب اس نے پوچھا ، تو میں جھوٹ نہ بول سکی۔

احمد خاں : اچھا یہ تو ہوئے دو جرم ، اور تیسرا ؟

رگھوناتھ : تیسرا جرم یہ کہ رانی اپنا دھرم چھوڑ چکی ہے ، اور اس جرم کی سزا قتل ہے۔

احمد خاں : کیوں رانی کیا یہ سچ ہے ، واقعی ؟

رانی : اسلام قبول کرنے کا فیصلہ آج میں نے کیا ہے ، گو سوچ بہت دنوں سے رہی تھی۔

رگھوناتھ : ہمت رائے کا خیال یہ ہے کہ جو عورت ایک غیر مذہب کے مرد سے محبت کرتی ہے وہ ضرور بد دین ہے۔

آنند : بتایئے کیا رانی کا بچانا آپ کا فرض نہیں ہے ؟

راجو : رانی آپ سے کتنی سچی محبت کرتی ہے ، آپ شاید اب تک نہیں جانتے ہیں حقیقت کو ؟

احمد خاں : جانتا ہوں ، جو حقیقت تم سب کی نظر سے اب تک پوشیدہ ہے وہ یہ کہ میں رانی سے کتنی محبت کرتا ہوں ، خیر ، اس مسئلہ پر بحث کا یہ موقع نہیں یہ میرا اور رانی کا ذاتی معاملہ ہے ـــــ لیکن ایک بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔

آنند : وہ کون سی بات ہے ؟

احمد خاں : اگر ہمت رائے کو مجھے قتل کرنا تھا تو وہ ہر وقت ایسا کر سکتا تھا ، اتنے دنوں تک خواہ مخواہ قید رکھنے کے بعد یہ فیصلہ کیوں کیا گیا ؟

رگھوناتھ : آج یہ بات بھی ہمت رائے نے اگل دی ،

احمد خاں : (اشتیاق کے ساتھ) کیا کہا اس نے ؟

رگھونندن : اس نے کہا کہ مہاراج سارے ہندوستان پر اپنا راج قائم کرنا چاہتے ہیں، اور بادشاہت اس وقت لودھی کے ہاتھ میں ہے اور اسے وہ تنہا اپنی قوت سے ختم نہیں کر سکتے۔

احمد خاں : اسی لیے اس نے ہمت رائے کو ایلچی بنا کر دولت خاں کے پاس بھیجا تھا؟

رگھونندن : جی ہاں —— لیکن پھر انھیں خیال آیا کہ اگر دولت خاں کی مدد سے لودھی کا خاتمہ ہو بھی گیا تو بات نہیں بنے گی۔

احمد خاں : کیوں نہیں بنے گی؟

رگھونندن : پھر لودھی کے بجائے دولت خاں بادشاہ بن جائے گا۔

احمد خاں : ظاہر ہے، اگر دولت خاں لودھی کے خلاف جنگ کرتا اور کامیاب ہوتا تو ضرور تخت حکومت حاصل کر لیتا لیکن وہ اس کے لیے ——

رگھونندن : جی ہاں، پھر مسلم حکومت کا ختم کرنا مشکل ہو جاتا۔ لہٰذا مہارانا نے ایک تدبیر اور سوچی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا ایلچی بنا کر موتی چند کو بابر کے پاس بھیجا ——

احمد خاں : (چونک کر) بابر؟ —— کیا کہا بابر؟

رگھونندن : جی ہاں، وہ کابل کا بادشاہ ہے۔

احمد خاں : (سنجیدگی کے ساتھ) مجھے معلوم ہے لیکن وہ بھی تو مسلمان ہے!

رگھونندن : جی ہاں ہے، لیکن وہ لودھی کو شکست دینے کے بعد یہاں رہے گا نہیں۔ وہ ہندوستان کے لیے کابل کا تخت نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ جھکڑوں پر سونا چاندی ہیرے، جواہرات، اور بہت سامال غنیمت لے کر اپنے دیس پھر واپس چلا جائے گا۔ مہارانا چند دن تک اس کا نائب بن کر اور پھر خود مختاری اختیار کر کے اس دیس پر، جو اس کا اور اس کے آبا و اجداد کا ہے، حکومت کریں گے اور ہمارا

اتنی طاقت حاصل کرے گا کہ کوئی اسے شکست نہیں دے سکے گا۔

آنند : آپ جب یہاں پہنچے ہیں تو موتی چند کابل جا چکا تھا، مہارانا نے سوچا کہ اگر بابر ان کی پیش کش قبول کر لیتا ہے تو آپ کو قتل کر کے معاملہ ختم کر دیا جائے گا۔

احمد خاں : اور اگر نہیں کرتا؟

آنند : تو اعزاز و اکرام کے ساتھ آپ کو رہا کر دیا جائے گا، آپ سے معذرت کی جائے گی ہمت رائے کو آپ کے بارے میں کچھ سزا دی جائے گی اور پھر بہت سے تحائف کے ساتھ موتی چند کو آپ کے ساتھ ایلچی بنا کر روانہ کر دیا جائے گا!

احمد خاں : ترکیب تو بہت اچھی سوچی تمہارے مہارانا نے۔

آنند : ایسی چوٹ پڑی نہیں سکتی۔

(۵)

چال

رگھو نندن اور آنند کی باتیں سن کر احمد خاں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی
دشمن اتنا کاری وار کر سکتا ہے ۔ یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی ، دشمن اتنا
چالاک اور ہوشیار ہے۔ اس طرف اس نے کبھی توجہ بھی نہ کی تھی. معاملہ اتنی نازک صورت
اختیار کرے گا ایسا اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچا تھا ۔
اگر یہ چال کامیاب ہو گئی تو انجام کیا ہوگا ؟
پھر یہی ہوگا کہ مسلم حکومت کا نام و نشان ہندوستان سے مٹ جائے گا
رانا سانگا یا کسی اور دشمن کی حکومت قائم ہو جائے گی ۔
یہ سوچ کر احمد خاں پر اضمحلال اور افسردگی کی کیفیت طاری ہو گئی ۔ وہ سوچنے
لگا ، اگر لودھی اتنا ناعاقبت اندیش ، بے عقل ، خود غرض اور پیکر کبر و نخوت نہ ہوتا تو
حکومت کیوں کمزور ہوتی ؟ اس کے پرانے وفادار ساتھی کیوں چھوڑتے ؟ دولت خاں
جیسا بہادر اور جاں نثار اس سے الگ کیوں ہوتا ؟
کیا واقعی لودھی خاندان کے ختم ہونے کا وقت قریب آگیا ہے ؟
کیا درحقیقت مسلم حکومت اس ملک سے ختم ہو جائے گی ؟

یہ بھی بھر مسلمان جوان اولوالعزم ، باہمت ، اور سراپا جوش و جہاد اسلاف
کی اولاد ہیں ، جو خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لیے، اللہ کا دین پھیلانے کے لیے
اس ملک میں اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑ کر جان دینے اور جان لینے کے لیے آئے
تھے ، ختم ہو جائیں گے ؟
کیا میں کچھ نہیں کر سکتا ، کیا اس نازک ترین مرحلہ پر مجھے کچھ نہیں کرنا چاہیے ؟
پھر اس کے ذہن میں خیال آیا کہ مجھے جلد از جلد دولت خاں کے پاس پہنچنا
چاہیے اور اسے آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ پچھلی رنجشیں اور تلخیاں فراموش کر دے
اور لودھی سے صلح کر لے ۔ اس کا ساتھ دے ، اور واقعی اگر بابر آ رہا ہے تو اس سے
مقابلے کے لیے تیار ہو جائے ۔ رانا سانگا کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ بابر یہاں
رہ نہیں سکتا وہ محمود غزنوی کی طرح آئے گا اور مال غنیمت لے کر چلا جائے گا ۔
وہ شہاب الدین غوری کی طرح فتح کرے گا ، اور واپس چلا جائے گا ۔ وہ تیمور لنگ
کی طرح فتح کر سکتا ہے مگر جم کر رہ نہیں سکتا ۔ وہ یہیں کے کسی آدمی کو اور غالباً
اپنے دوست رانا سانگا کو اپنا نائب بنا کر رخصت ہو جائے گا اور پھر مسلمان جو
آج فاتح ہیں مفتوح بن جائیں گے ۔ جو آج حاکم ہیں محکوم ہو جائیں گے ، جن کا
بول بالا ہے ذلت اور رسوائی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائیں گے ۔
احمد خاں یہی باتیں سوچ رہا تھا کہ رانی نے قفل خاموشی توڑا ۔ وہ رگھو نندن
سے مخاطب ہوئی :
" لیکن رگھو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ بابر یہاں آ کر واپس نہ جائے ، یہیں رہ جائے ؟"
رگھو نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا ۔
" ہو تو سکتا ہے لیکن ہوگا نہیں ۔"
احمد خاں نے سوال کیا " کیوں نہیں ہوگا ؟"

رگھو نے بتایا اس لیے کہ بابر کا فائدہ اسی میں ہے کہ آئے، فتح کرے، اور مال غنیمت سے لدا پھندا واپس چلا جائے، یہاں رہ کر وہ کیا کرے گا؟ کہاں کابل کے مرغزار، اور جوئبار، سبزہ زار اور کہسار، کہاں یہ ویس، نہ جہاں دیسی نہریں ہیں نہ باغات، نہ پھل، نہ پھول، جنت سے نکل کر جہنم میں رہنا کون منظور کر سکتا ہے؟[1]

لیکن رانی جیسے بحث کرنے پر تلی ہوئی تھی، اس نے کہا:

"بظاہر تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔ میں بھی ایسا ہی سوچتی ہوں۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ جو کچھ ہم سوچ رہے ہیں وہی وہ بھی سوچے؟ ہو سکتا ہے وہ کابل کی چھوٹی سی حکومت کے مقابلہ میں اس ملک کی وسیع حکومت کو ترجیح دے اور یہیں رہ جائے!"

رگھوناتھ نے ایک مرتبہ سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا:

"اگر ایسا کیا اس نے تو اس کا حشر لودھی اور دولت خاں سے بھی برا ہوگا۔"

احمد خاں نے اس گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ رانی اور رگھو کی باتیں سن رہا تھا۔ رانی نے پھر ایک سوال کیا۔

"کس طرح؟ ذرا اپنی بات سمجھاؤ بھی تو!"

رگھو نے کہا "بالکل یہی بات میں نے بھی ہمت رائے سے پوچھی تھی!"

رانی نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا:

---

[1] بابر نے اپنی تزک میں ہندوستان کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کا ہندوستان موسم اور پیداوار کے لحاظ سے کوئی کشش نہیں رکھتا تھا۔

"پھر اس نے کیا جواب دیا؟"

رگھو نے بتایا، "اس نے کہا اور میرے خیال میں ٹھیک کہا، "اوّل تو بابر خود یہاں نہیں رہے گا اور اگر بفرض محال اس نے ایسی حماقت کی تو بڑی آسانی سے ختم کر دیا جائے گا، کیونکہ وہ یہاں بالکل اجنبی ہوگا!"

رانی نے پھر پوچھا "اجنبی ہوگا؟ — کیا لودھی اجنبی نہیں ہے؟ وہ ہمارا کون لگتا ہے؟"

رگھوناتھ نے کہا "تم مطلب نہیں سمجھیں، لودھی کا خاندان عرصہ سے یہاں حکومت کر رہا ہے جہاں ہم جیسے لوگ اس کے مخالف ہیں اور اسے ختم کرنے کے منصوبے تیار کر رہے ہیں وہاں کچھ ہمارے قوم کے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کے وفادار ہیں اور ہر حالت میں اس کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ اس خاندان کی حمایت سارے مسلمان کر رہے ہیں، کیونکہ ان کی زندگی اور وقار، اور دم خم کا انحصار مسلم حکومت پر ہے۔ پٹھانوں کا جہاں تک تعلق ہے وہ بھی اس کے لیے جان دے سکتے ہیں جو موجودہ بادشاہ کے مخالف ہیں وہ اس کے باپ کے ثنا خواں ہیں اور وقت پڑنے پر اپنے اختلافات بھول جائیں گے اور اس کا ساتھ دینے پر آمادہ اور تیار ہو جائیں گے!"

"مگر بابر کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا؟" رانی نے پوچھا۔

"ہاں!" رگھوناتھ نے جواب دیا "اس لیے کہ بابر سے پٹھانوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کے لیے بھی وہ بالکل نیا ہوگا، اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے وہ تو ہرگز اس کی تائید و حمایت نہیں کریں گے، شاید ایک ہندو بھی ایسا نہ ملے جو اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو، پھر ایک اور بات بھی نظر انداز نہ کرنی چاہیے وہ یہ کہ خاندان چونکہ عرصہ سے حکمران ہے اس لیے وہ یہاں کے وسائل و ذرائع

پر پورے طور پر قابض ہے، یہاں کے راستوں سے، اور تمام مقامات سے اچھی طرح واقف ہے۔ اگر بھاگنا پڑے تو جانتا ہے کہاں پناہ لے؟ اگر مدد کی ضرورت ہو تو جانتا ہے کس کی طرف ہاتھ بڑھائے؟ اسے معلوم ہے دوست کون ہے اور دشمن کون؟ بھروسہ کس پر کیا جا سکتا ہے اور کس پر نہیں کیا جا سکتا؟ لیکن بابر ان تمام چیزوں سے ان تمام باتوں سے ناواقف ہوگا۔ لہٰذا بڑی آسانی سے اس کا قلع قمع کیا جا سکے گا کیا نہیں؟"

رانی بولی "ہاں بات تو سمجھ میں آتی ہے!"

آنند نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"بابر آئے یا نہ آئے، آئے تو چلا جائے یا کبھی نہ جائے، لودھی کو شکست دے یا فتح، بابر لودھی کو ختم کر دے یا خود بادشاہ بن جائے یہ باتیں رانا اور ہمت رائے کے سوچنے کی ہیں۔ ہمیں تو یہ سوچنا ہے کہ خاں صاحب کو اس قید سے کس طرح رہا کیا جائے؟ یہ سوچو!

---

(۶)

فیصلہ

رگھو اور آنند نے پوری سچائی اور خلوص کے ساتھ عہد کیا کہ وہ رانی اور احمد خاں کو ضرور شہر سے باہر نکال آئیں گے، احمد خاں نے کہا:

"میں تمہاری اس پیشکش کو قبول کرتا ہوں، عام حالات میں شاید اسے قبول کرتے ہوئے مجھے تامل ہوتا، لیکن اب میرے فرض کا تقاضا یہ ہے کہ اسے قبول کر لوں اور یہاں سے جلد از جلد روانہ ہو کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جاؤں۔"

پھر احمد خاں رانی سے مخاطب ہوا، اور دریافت کیا:

"کیا تم بھی میرے ساتھ چلو گی؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی،

"اگر آپ لے چلیں گے!"

راجو بول پڑی، "اندھا کیا چاہے دو آنکھیں؟"

سب بے ساختہ ہنسنے لگے۔ پھر احمد خاں نے رانی سے کہا "لیکن کہاں تک؟"

وہ تیوری چڑھا کر بولی "اس سوال کا مطلب؟"

احمد خاں نے کہا "مطلب یہ کہ تمہاری منزل مقصود کیا ہے؟ جہاں کہو وہاں پہنچا دوں۔"

وہ بولی "میری منزل مقصود ؟ کنواں، دریا، نہر، خندق، تالاب میں سے جو چیز بھی پہلے مل جائے، مجھے اسی میں دھکیل دیجیے گا!"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ راجو نے کچھ فخر، کچھ شکایت اور کسی حد تک تلخی کے ساتھ کہا:

"یہ بھی اچھی رہی، اس بیچاری نے آپ کو چاہا، آپ کے لیے اپنا دھرم تک چھوڑ دیا، آپ کے لیے روئی، آپ کے لیے جاگی، اپنے آپ کو قربان کر دینے پر تیار ہوگئی اور آپ اس سے پوچھ رہے ہیں کہ تیری منزل مقصود کیا ہے؟ اسے کہتے ہیں زخموں پر نمک چھڑکنا!"

احمد خاں کچھ شرمندہ سا ہوگیا کہنے لگا:

"راجو تم تو مجھے اور رانی کو لڑانے کا جتن کر رہی ہو، لیکن یاد رکھو کہ وہ مجھ سے نہیں لڑ سکتی۔ خفا بھی نہیں ہو سکتی۔ اسے غلط فہمی میں بھی مبتلا نہیں کیا جا سکتا۔"

راجو نے ہنستے ہوئے کہا "اب آ گئے خوشامد پر۔"

رگھو بولا "خوشامد نہیں راہ راست پر آ گئے۔"

احمد خاں نے سمجھاتے ہوئے کہا "تم جو چاہو کہہ لو بھئی۔ بات کا خواہ مخواہ تم نے بتنگڑ بنا دیا، میرا مدعا تو صرف اتنا تھا کہ بہت رائے نے رانی کو اس کے ماں باپ سے، کنبہ سے، وطن سے دور کر دیا ہے، ضرور اس کے دل میں تڑپ ہوگی کہ وہاں جائے، وہاں رہے تو کیوں نہ اسے پہنچا آؤں خود جا کر۔"

راجو بولی "بس زیادہ باتیں نہ بنائیے" —— کیا وہ مسلمان نہیں ہوگئی؟"

"ہاں وہ مسلمان ہونے پر آمادہ ہے، مگر پھر؟"

"کیا مسلمان بن کر وہ وہاں جا سکتی ہے؟ رہ سکتی ہے؟ اس کے کنبے والے قبول کر لیں گے؟ رکھ لیں گے؟ کیا قتل کر کے اس کا گوشت چیل کوؤں کو نہ کھلا

دیں گے؟ اور پہنچانے بھی کون جائے گا، آپ؟"

"تو اس سے کیا؟"

"کچھ نہیں ہوا، ہوتا کیا، بس صرف اتنا ہوگا کہ یہاں آپ کو کوئی ایک آدمی تلوار سے حل کرتا، وہاں بہت سے آدمی لاٹھیوں سے سر پھاڑ دیں گے ——"

(ہنستے ہوئے) تم مجھے ڈرا رہی ہو؟"

"میں جانتی ہوں آپ بڑے بہادر ہیں، لیکن خواہ مخواہ جان دینا بہادری نہیں ہے، بہادری یہ ہے کہ یہاں سے جس قدر جلد ممکن ہو جائیے اور اپنے بادشاہ کو بچائیے۔ حکومت کو بچائیے!"

"ہاں ٹھیک کہتی ہو، ایسا ہی کروں گا!"

"لیکن کب؟ ——"

رگھو بول پڑا "آج رات کو ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے!"

احمد خاں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "میں تیار ہوں، لیکن رہ رہ کر تمہارا، اور رانی کا خیال آتا ہے، تم دونوں کا کیا حشر ہوگا؟"

رگھو نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "آپ ہماری فکر نہ کیجیے، جیسا کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا!"

کچھ سوچتے ہوئے احمد خاں نے ایک عزم کے ساتھ فیصلہ کن انداز میں کہا:

"میں صرف ایک شرط پر جا سکتا ہوں یہاں سے!"

رگھو نے اشتیاق کے ساتھ کہا "وہ شرط بھی بتا دیجیے، ہم دیکھیں اب کیا نئی بات نکلتی ہے!"

احمد خاں نے کہا "تم تینوں کو بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا!"

بات کا تینوں پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ یہ ایسی بات تھی جسے کسی نے بھی نہیں

سوچا تھا۔ آنند نے پوچھا۔

"یعنی ہم لوگ بھی یہاں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے چلیں؟ یہ کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

احمد خاں نے بہت مختصر سا جواب دیا "ہاں"

رگھو نے سوال کیا "لیکن اس سے فائدہ کیا ہوگا؟"

احمد خاں نے کہا "فائدہ یہ ہوگا کہ ہم سب ایک کشتی کے مسافر بن جائیں گے، ڈوبیں گے تو ساتھ ڈوبیں گے، تیریں گے تو ساتھ تیریں گے —"

پھر اس نے ایک جھجھلتی سی نظر حاضرین پر ڈالی اور گویا ہوا،

"رانی کی بات اور تھی، تمہیں تم سے نہیں کہتا کہ اپنا دھرم بدل لو، اپنے دھرم پر اتنی ہی راسخ الاعتقادی سے قائم رہو جتنے اب ہو، وہاں بھی تم پر کوئی پابندی نہ ہوگی، شوق سے بتوں کو پوجو، پوجا پاٹ کرو، ہون کرو، یگیہ کرو، جو تمہارا جی چاہے کرو، کوئی مداخلت نہیں کرے گا، لیکن اب ہم زندگی کے باقی دن ساتھ ہی بسر کریں گے — تخت یا تختہ!"

دفعتہً راجو کے منہ سے نکلا "منظور ہے"۔

رگھو حیرت سے ٹکٹکی باندھ کر بیوی کو دیکھنے لگا۔ آنند نے پوچھا:

"اب بولو کیا کہتے ہو؟"

وہ بولا "جو ہمیں کہنا چاہیے تھا وہ اس نے کہہ دیا، کون کہتا ہے عورت ذات ناقص ہوتی ہے۔ ہم نے تو فیصلہ کر لیا، اب تم بتاؤ کیا کہتے ہو؟"

وہ گویا ہوا "اپن کب پیچھے ہٹنے والے ہیں"۔

رانی نے تحسین و آفرین اور ستائش و ممنونیت کی نظروں سے راجو کو دیکھا اور کہا

"کیا کہنا ہے راجو تیرا۔"

(۸)

نویدِ قتل

شاید وہ ابھی کچھ اور کہتی کہ دفعتہً رامو بھاگا بھاگا آیا، یہ رگھو کا رشتہ میں سالا ہوتا تھا اور اسے بہت چاہتا تھا، اس نے آتے ہی کہا،

"بھرت رائے آ رہا ہے اسی طرف"!

یہ سنتے ہی رگھو، آنند، راجو اور رانی سب پر اضطراب کی کیفیت طاری ہوگئی احمد خاں نے قدرے برہمی کے ساتھ کہا

"آتا ہے تو آنے دو — کیا کرلے گا"

رانی اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے راجو سے کہا:

"تو میرے ساتھ میرے کمرے میں چل"

پھر احمد خاں سے بولی "یہ وقت بہادری دکھانے کا نہیں ہے۔ بہادری کے جوش میں دشمن کا شکار بن جانا دانشمندی کے خلاف ہے، جوش کو دبا کر دشمن کو داؤں پر لگانے لگا دینا اصل بہادری ہے"۔

پھر اس نے رگھو اور آنند سے کہا "ذرا خیال رکھنا ان کا، اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو تم سنبھال لینا۔"

اور پھر راجو کا ہاتھ پکڑ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اسے گئے چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ ہمت رائے آگیا۔ احمد خاں اسی طرح بیٹھا رہا۔ رگھو اور آنند ادب سے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

ہمت رائے نے ایک نظر ان دونوں پر ڈالی، پھر احمد خاں سے مخاطب ہوا۔

"میرے دوست، میں تمہیں ایک خبر دینے آیا ہوں، سنو، لیکن کلیجہ تھام کر"

احمد خاں نے نفرت اور حقارت سے بھری ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور بولا

"تمہیں جو کچھ کہنا ہے کہو، میں تمہاری گفتگو کو کلیجہ تھام کر سنتا ہوں، یا بیکیجھ وکیف بن کر، یہ سوچنا میرا کام ہے؟"

اب تک ہمت رائے کھڑا ہوا تھا، اب بیٹھ گیا، اور شوخی کے ساتھ گویا ہوا۔

"افسوس مہارانا نے میری ایک نہ سنی اور آپ کے قتل کا فیصلہ کر دیا۔ مجھے بہت افسوس ہے، لیکن کیا کر سکتا ہوں؟ حکم حاکم مرگ مفاجات تو آپ نے سنا ہی ہوگا!"

احمد خاں نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

"وہ حاکم جس کا حکم کبھی نہیں ٹل سکتا ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے خدائے واحد۔ باقی میں نہ انسانوں کو حاکم مانتا ہوں، نہ ان کی حاکمیت تسلیم کرتا ہوں، ان بچاروں کی بساط ہی کیا ہے۔ چند دن کی زندگی، وہ بھی خطرات سے گھری ہوئی، بیماری آزاری، دشمنی، بغاوت، نہ جانے کیا کیا، ایسے انسان بھلا کیا حکم چلائیں گے!"

"لیکن مجھے تو نہیں یاد پڑتا کہ مہارانا نے کسی کے قتل کا حکم صادر کیا ہو اور وہ بچ گیا ہو۔"

"مجھے بھی کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں آتا کہ جس کی موت نہ آئی ہو اور وہ مر گیا ہو۔"

"(برہمی کے ساتھ) کیا تم مرنے سے بچ سکتے ہو؟"

"اگر وقت آگیا ہے تو ضرور مرنا پڑے گا، اور اگر نہیں آیا ہے تو تم نے

اور مہارانا جیسے دس لاکھ آدمی بھی میرا بال بیکا نہیں کر سکتے!"

"کیا تم موت سے نہیں ڈرتے؟"

"ڈر کر کیا کروں؟ کیا ان لوگوں کو موت معاف کر دیتی ہے جو اس سے ڈرتے ہیں؟ اور جو نہیں ڈرتے انھیں جب چاہے دبوچ لیتی ہے؟"

ہمت رائے حیرت سے احمد خاں کو دیکھ رہا تھا، اور وہ کہے جا رہا تھا۔

"میرے دوست ایک بات کان کھول کر سن لو، میرا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ موت انہی کے پیچھے لگتی ہے جو اس سے خائف رہتے ہیں، اور جو سینہ سپر ہو کر اس کا مقابلہ کرتے ہیں ان سے وہ کترا کر نکل جاتی ہے، تم بزدل ہو، تم موت سے ڈرتے ہو، لہٰذا اپنی خیر مناؤ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارا وقت قریب آگیا ہے تم اب صرف چند دن کے مہمان ہو —"

ان الفاظ میں نہ جانے کیسا جادو تھا کہ ہمت رائے کا چہرہ وفور دہشت سے سفید پڑ گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، بدن پر رعشہ سا طاری ہو گیا، ایسا معلوم ہوا جیسے موت سامنے، بالکل سامنے کھڑی ہے۔ دم لبوں پر آگیا ہے۔ اور وہ بس اب مرا ہی چاہتا ہے۔ اس نے انتہائی سراسیمگی اور دہشت کے عالم میں کہا:

"میں نہیں مرنا چاہتا، میں نے کوئی خطا نہیں کی ہے۔ میں نہیں مروں گا!"

احمد خاں نے ایک قہقہہ لگایا، اور بڑے اطمینان سے کہا:

"کیا صرف وہی لوگ مرتے ہیں جو خطاوار ہوں؟ یہ ہر روز دنیا میں لاکھوں لوگ جو بغیر کسی سے لڑے جھگڑے بستر پر اور گھر میں دم توڑتے ہیں کیا یہ خطاوار ہوتے ہیں؟ — ویسے تم انسانیت کے اتنے بڑے مجرم ہو کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے، تم فریبی ہو، دغاباز ہو، محسن کش ہو، ننگ انسانیت ہو، تمہیں تو

کل کے بجائے آج اور آج کے بجائے ابھی ختم ہو جانا چاہیے۔ اور بلاشبہ ایسا ہوگا۔"

ہمت رائے کی وہ دہشت اب بڑی حد تک کافور ہو چکی تھی۔ اس کا حوصلہ بحال ہو چکا تھا، اس نے کہا:

"کل کا چمکنے والا سورج بتا دے گا کہ کون زندہ رہتا ہے اور کون قتل ہو جاتا ہے۔"

احمد خاں نے زیر لب تبسم کے ساتھ جواب دیا۔

"لیکن سورج کل کے بعد بھی تو چمکے گا! ــــ اور جہاں تک موت کا تعلق ہے وہ کل کا انتظار کیوں کرے گی، وہ تو اپنے وقت پر آئے گی، ممکن ہے ابھی آجائے ممکن ہے کل آئے اور ہو سکتا ہے برسوں نہ آئے۔"

ہمت رائے نے دانت پیستے ہوئے کہا:

"یہ بات دوسروں کے لیے ہے۔ تم بہرحال کل مرو گے، یہ میرا دعویٰ ہے میرا یہ دعویٰ بھی ہے کہ اب تمہیں بھگوان بھی نہیں بچا سکتے۔"

احمد خاں نے کوئی جواب نہیں دیا صرف مسکرانے پر اکتفا کیا، لیکن اس تبسم میں حقارت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

ہمت رائے نے رگھو سے کہا:

"رانی کہاں ہے؟ ــــ مجھے اس کے کمرے تک لے چلو، میں اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں!"

رگھو نے رانی کے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور راہ نمائی کرتا ہوا چل پڑا۔

---

(۸)

ہندی عورت

یہ دونوں رانی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ راجو اب تک موجود تھی، دونوں کچھ باتیں کر رہی تھیں، لیکن رگھو اور ہمت رائے کی جھلک دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

ہمت رائے یہاں آکر بالکل بدل گیا۔

ابھی احمد خاں کے کمرے میں اس کی جو کیفیت تھی اب بالکل اس سے مختلف تھی، وہاں وہ نفرت، برہمی، اشتعال اور دہشت کی کیفیتوں سے دوچار تھا، یہاں ایک فاتح کی حیثیت سے نمودار ہوا تھا۔

راجو سے دیکھ کر سرو قد کھڑی ہو گئی، رانی اسی طرح بیٹھی رہی۔ ہمت رائے پلنگ کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ پھر زہر خند کرتا ہوا گویا ہوا:

"کہو رانی کیا حال ہے؟"

وہ آنکھیں چار کیے بغیر بولی،

"اچھی ہوں، بھگوان جس حال میں بھی رکھے، اس کا شکر ہی ادا کرنا چاہیے۔"

ہمت رائے ہنسنے لگا اس نے کہا "آج کل بھگوان کی یاد بہت ستا رہی ہے،

ہم سے تو وہی اچھا ـــــ کیا اپنے مسلمان محبوب کو بھول گئیں ؟"

رانی نے حقارت اور نفرت سے بھری ہوئی ایک نظر اس پر ڈالی اور بولی

" تم یہاں کیوں آئے ہو؟ کیا یہ بھی نہیں چاہتے کہ قید خانے میں اس کی زندگی بسر کر سکوں ؟"

ہمت رائے نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا :

" قید خانے میں اس و سکوں کس کو مل سکتا ہے ـــــ یہ تو مصیبت ، دکھ تکلیف اور اذیت کی جگہ ہے ۔ اگر سکون کی جویا ہو ، اگر امن کی طالب ہو ، اگر عیش درکار ہے ، اگر سرور و راحت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہو تو یہاں سے نکلو ، میرے شبستان عیش میں چلو ، وہاں تمہیں ہر طرح کی عافیت ، راحت اور آسائش میسر ہوگی"

رانی نے چڑ کر کہا " مجھے نہیں چاہیے تمہاری بخشی ہوئی راحت و آسائش "

" کیوں ؟ ـــ آخر کب تک خفا رہو گی مجھ سے ؟"

" زندگی بھر ـــ آخر تم یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں تم سے انتہائی نفرت کرتی ہوں ۔ میں تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی ۔ تمہاری وجہ سے اگر مجھے جہنم مل رہی ہوگی میں جہنم کو ترجیح دوں گی ، میرا پیچھا چھوڑ دو !"

یہ باتیں سن کر ہمت رائے وفور غضب سے کانپنے لگا ، اس نے کہا :

" تجھے اب تک ہوش نہیں آیا ہے ؟ تو اب تک اپنی ضد پر قائم ہے ؟"

رانی نے بغیر کسی تامل اور جھجک کے جواب دیا " ہاں !"

ہمت رائے نے اور زیادہ برہم ہو کر کہا :

" پھر تجھے بھی مرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے "

" میں تو نہ جانے کب سے موت کی راہ دیکھتی رہی ہوں لیکن نہ جانے کیوں راستہ بھول گئی ہے ، ساری دنیا کے چکر لگاتی ہے ، مگر ادھر کا رخ نہیں کرتی "

اسے یہاں بھیج دو تو میں تمہارا شکریہ ادا کروں گی "

" اطمینان رکھو وہ آئے گی اور بہت جلد آئے گی اور بڑے ٹھاٹھ سے آئے گی ۔ تجھے اپنے ساتھ لے جائے گی ۔ صرف تجھ ہی کو نہیں ، اسے بھی ـــ احمد خاں کو بھی جسے تو چاہتی ہے ، جس پر تو جان دیتی ہے ، جس کے لیے تو اپنے آپ کو قربان کرنے پر تیار ہے "

رانی نے کوئی جواب نہیں دیا !

یہ خبر سن کر اس پر پہلے جیسی دہشت بھی نہیں طاری ہوئی ۔ یہ خبر اس نے اس طرح سنی جیسے کوئی نہایت ہی معمولی بات ہے ۔ اس کے طرز عمل میں یہ تبدیلی دیکھ کر ہمت رائے کو حد درجہ حیرت ہوئی ، آخر اس سے ضبط نہ ہو سکا ، اس نے کہا :

" کیا یہ خبر سن کر تجھے دھچکا نہیں لگا ؟"

" بالکل نہیں ، ـــ ذرا بھی نہیں "

" کیوں ؟ ـــ کیا اب تو اسے نہیں چاہتی ؟ اب تجھے اس کی زندگی کی پروا نہیں ہے ؟"

" نہیں ـــ جب میں ہی اس دنیا سے رخصت ہو رہی ہوں تو کسی اور کو بچانے کی فکر کیوں کروں ؟"

" کیا تو چاہتی ہے کہ احمد خاں قتل ہو جائے ؟"

" میں کچھ نہیں چاہتی سوائے اس کے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ ، میرا سر نہ کھاؤ ، میرے قتل پر مامور کیا ہے اسے حکم دو کہ کل کے بجائے ابھی اور اسی وقت اور میں تمہاری آنکھوں کے سامنے میری گردن مار دے تاکہ تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو ، تمہیں پوری طرح خوشی حاصل ہو ، تمہارے دل میں جو کانٹا میرے وجود کا ہے وہ نکل جائے "

ہمت رائے نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور رانی کے بالکل قریب پہنچ گیا،
اس نے کہا:
" رانی بے شک مہارانا سے میں نے تیرے قتل کا فرمان حاصل کر لیا ہے، لیکن
میں اب بھی تجھے بچا سکتا ہوں۔ اب بھی تیری زندگی تجھے واپس مل سکتی ہے۔"
" شکریہ ـــ اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی!"
" میں اب بھی تیرے ناز اٹھانے کو تیار ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ تجھ سے شادی
کروں گا، تجھے اپنے دل کی ملکہ بنا کر رکھوں گا، میری ہر چیز تیرے اختیار اور
تصرف میں ہوگی، حتیٰ کہ خود میں بھی۔"
" لیکن مجھے تم سے اور تمھاری ہر چیز سے انتہائی سخت اور شدید قسم کی نفرت ہے
تم میں اور تمھاری کسی چیز میں میرے لیے کوئی کشش نہیں ہے۔"
ہمت رائے کا یہ باتیں سن کر خون کھولنے لگا۔ اس کا جی چاہا تلوار میان سے
نکالے اور اس ضدی، خودسر اور باغی عورت کی گردن اڑا دے، لیکن اس نے
ضبط سے کام لیا۔ رگھو نندن پاس ہی کھڑا تھا، اس نے کہا :-
" رگھو ـــ"
وہ ادب سے سر جھکا کر گویا ہوا " حکم سرکار!"
ہمت رائے نے کہا " جو یہ عورت چاہتی ہے وہ نہیں ہوگا، یہ مرنا چاہتی ہے
مگر میں اسے زندہ رکھوں گا، اور تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ یہ زندہ رہے گی مگر دن
میں کئی مرتبہ اسے مرنا پڑے گا!"
رگھو خاموشی سے یہ باتیں سنتا رہا، یکایک ہمت رائے نے کہا:
" احمد خاں کے قتل کا فرمان مہارانا کی بارگاہ سے صادر ہو چکا ہے۔ تم
رانی کو اچھے سے کپڑے پہنا کر قتل گاہ میں لے جانا اور احمد خاں کو اس کے سامنے

قتل کرانا ۔ اسے قتل ہوتے یہ اچھی طرح سے دیکھ لے، پھر اسے چوٹی سے پکڑ کر
گھسیٹتے ہوئے میرے ہاں لے آنا۔ میں اس حادثہ پر اس سے تعزیت کروں گا۔"
رگھو نے جواب دیا :
" بہت خوب سرکار!"

---

(۹)

دل لگی

ہمت رائے چلا گیا ـــــ احمد خاں کے قتل کا اور رانی کے نئے دور ابتلا کا اعلان کر کے، کوئی اور دن ہوتا، تو گو احمد خاں اس اعلان کو صبر اور وقار کے ساتھ سنتا، اور ہر آفت اور مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرتا، لیکن رانی کی جان پر بن جاتی راجو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ آنند کا چہرہ وفور دہشت سے سفید پڑ جاتا اور رگھو تندن دلیر اور بہادر ہونے کے باوجود کانپنے لگتا، اس لیے کہ یہ سب جانتے تھے وہ ظاہر میں انسان باطن میں شیطان ہے، ظلم، شقاوت اور سنگ دلی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ زیر دستوں، محکوموں، اور بے بس دشمنوں اور مخالفوں کے ساتھ اس کا برتاؤ وہ ہوتا ہے، جو شیر کا بکری کے ساتھ۔

لیکن آج کیفیت ہی دوسری تھی۔

اس کے سامنے تو آنند اور رگھو وغیرہ دست بستہ سر جھکائے کھڑے رہے، لیکن اس کے جاتے ہی، سب نے مل کر ایک زور دار اور زبردست قہقہہ لگایا، آنند نے ہمت رائے کا مذاق اڑایا

ان لوگوں کا شور و غوغا سن کر دوسرے کمرے سے احمد خاں بھی آ گیا۔ اس نے

"یہ خوشی کیوں منائی جا رہی ہے؟ کیا ہمت رائے کچھ انعام دے گیا ہے؟"

آنند نے کہا "وہ کیا انعام دے گا، کنجوس مکھی چوس، ہاں دھمکیاں دے گیا ہے۔"

راجو نے لقمہ دیا "گالیاں بھی تو دے گئے ہیں انعاماً۔"

آنند بولا "ہاں بھئی وہ بس یہی چیزیں دے سکتا ہے۔"

احمد خاں نے کہا "لیکن ہمت رائے بہت زور زور سے بول رہا تھا، جیسے غصہ میں ہو، کیا رانی سے الجھ پڑا تھا؟"

راجو نے رانی کی طرف سے جواب دیا "ہاں ان کے پیچھے تو پنجے جھاڑ کر پڑ گیا تھا وہ۔"

اور پھر اس نے ہمت رائے کی ہو بہو نقل اتارتے ہوئے سارا ماجرا بیان کر دیا نقل اتنی کامیاب تھی کہ سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ رانی نے ہنستے ہوئے کہا:

"اری راجو تو ناٹک سبھا کیوں نہیں کھول لیتی؟ سچ ہزاروں کے وارے نیارے کرے گی!"

وہ بولی "کھول تو لوں ناٹک سبھا، لیکن شرط یہ ہے کہ ہمت رائے بھی اس میں کام کرے۔"

رانی نے پوچھا "یہ کیوں؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟"

وہ بولی "میرے اندر کام کرنے کی امنگ اس کی دلچسپ حرکتیں دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔"

آنند نے پوچھا "تو کیا رائے ہے، اسے بھی ساتھ لیتے چلیں باندھ کر؟"

راجو نے جواب دیا "سچ مزا تو بڑا آئے گا، ضرور لے چلو۔"

"اگر دھر لیے گئے تو یاد رکھو ہم میں سے ایک کو بھی جیتا نہ چھوڑے گا۔"

"وہ خود کب جیتا بچے گا؟ دھر لیے جائیں، یا بچ کر نکل جائیں اسے تو قتل کرنا ہے۔"

میں نے آج تک مکھی بھی نہیں ماری، ترس آجاتا ہے، کیڑوں مکوڑوں تک کی جان لیتے ہوئے، لیکن اگر بہت رائے قابو میں آجائے تو اپنے ہاتھ سے اس کی گردن پر چھری پھیر دوں۔"

رانی نے پوچھا "تمہارا ہاتھ نہیں کانپے گا راجو؟"

وہ بولی "کہہ تو رہی ہوں مکھی تک نہیں مار سکتی میں لیکن اس موذی کی گردن پر چھرے پھیر دوں، مرغی کی طرح اسے پھڑپھڑاتا دیکھوں، پھر بھی دل نہ کڑھے اس پاپی پر — میں کہتی ہوں یہ آدمی ہے؟"

رانی نے پوچھا "آدمی نہیں تو کیا ہے؟"

وہ بولی "راکھشس ہے راکھشس، اس کا مارنا پن ہے پاپ نہیں۔"

رگھونندن نے کہا "اری چپ رہ کیوں بڑھ بڑھ کر باتیں کئے جا رہی ہے، ابھی وہ کھڑا تھا تو دم نکلا جا رہا تھا اب آجائے تو غش کھا جائے گی۔"

راجو بڑے انداز سے تیکھی نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی بولی "ہوں —"

---

(۱۰)

اڑ گیا پنچھی

پرانے راج بھون میں آج قیامت برپا تھی۔

پنچھی اڑ گیا!

پنجرہ خالی رہ گیا!

احمد خاں کا درِ زنداں کھلا ہوا تھا، لیکن وہ نہیں تھا۔

رانی کا محبس بدستور اپنی جگہ پر قائم تھا، لیکن وہ طائرِ بلند بال کی طرح نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

صریحاً رگھونندن، آنند، راجو اور راموتک غائب تھے، اس کا مطلب سوا اس کے اور کیا تھا کہ یہ سازش تھی اور اس سازش میں ان نمک حراموں نے دل کھول کر حصہ لیا تھا، صرف دشمن ہی نہیں گیا اپنے ساتھ ان لوگوں کو بھی لیتا گیا جو حکومت کے رازوں سے، اس کے آئندہ پروگراموں سے، اس کے منصوبوں سے پورے طور پر واقف تھے۔ یہ دشمن کے ساتھ جا کر دشمن بن جائیں گے، ہر راز افشا کر دیں گے، یہ ملک کے باغی اپنی ہی فوج کو کچلنے اور پامال کرنے میں ذرا تامل نہیں کریں گے۔

بہت رائے نے اپنے آدمیوں کو ان لوگوں کی تلاش میں روانہ کیا۔ ہر چہار طرف

مخبروں، جاسوسوں اور مسلح سپاہیوں کے دستے گشت پر روانہ ہو گئے، کونہ کونہ چھان مارا، جنگل جنگل دیکھ آئے، کوئی جگہ خواہ وہ آباد ہو یا ویران، ایسی نہیں تھی جہاں ان کے قدم نہ پہنچے ہوں، لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہیں آیا۔ ان لوگوں کا کہیں پتہ نہیں چلا۔

ہمت رائے کا یہ حال تھا کہ اس کا ایک قدم، پرانے راج بھون میں تھا اور اپنی حویلی میں۔ کبھی وہ فوجی صدر دفتر کا چکر لگاتا، کبھی پولیس کے افسروں سے بات چیت کرتا۔ اب تک اس نے اس حادثہ کی اطلاع مہاراجہ کو نہیں دی تھی، اس لیے کہ وہ بھی یہ خبر بد سنتے ہی آپے سے باہر ہو جاتے۔ وہ چاہتا تھا جس طرح بھی ہو سکے، پہلے ان لوگوں کو گرفتار کر لے۔ پھر ایک تحفہ کے طور پر مہارانا کی خدمت میں پیش کرے اور ان پر شکاری کتے چھوڑ کر ان کی لاشوں کا "تکا بوٹی" کر ڈالے۔ تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔

ہمت رائے کا ایک دوست ہیم چند تھا۔ یہ مہاراجہ کا بھی معتمد خاص تھا اور دربار میں ایک اونچے منصب پر فائز تھا۔ پولیس کا محکمہ اسی کی تحویل میں تھا۔ ہمت رائے ہیم چند کے پاس گیا اور اسے یہ خبر سنائی، وہ بھی گھبرا گیا، اس نے کہا:

" یہ تو غضب ہو گیا، اگر مہارانا کو یہ خبر ملی تو تمہاری خیر نہیں۔ وہ چلتے پرزے اور شفیق ہی تنے ہی سخت گیر اور تند خو بھی ہیں۔"

ہمت رائے کے دل میں خود بھی یہی باتیں آ رہی تھیں۔ بڑی دیر سے وہ اسی کشمکش میں گرفتار تھا۔ ہیم چند کی صاف صاف گفتگو نے اسے اور زیادہ حواس باختہ کر دیا۔ اسے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا، اس کے کانوں میں احمد خاں کے وہ الفاظ گونجنے لگے جو ابھی کل ہی اس نے آنند وغیرہ کے سامنے کہے تھے، "تو کیا اس کی پیش گوئی صحیح ثابت ہو گی؟ کیا قبل اس کے کہ احمد خاں کی گردن کٹے مجھے پھانسی کے تختہ پر

چڑھنا پڑے گا؟"

اس نے التجا اور خوشامد کے لہجہ میں ہیم چند سے کہا:

" بھگوان کے لیے، کچھ کرو، تم میرے بچپن کے دوست ہو، کیا تم بھی کام نہ آؤ گے؟"

یہ موقع مروت کا نہ تھا، ہیم چند نے بغیر کسی ایچ پیچ کے صاف الفاظ میں اصل بات کہہ دی:

" بھائی میں تمہارے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ مال دولت، اسباب، زمین جائداد، مکان، نہر، تالاب، جو کچھ میرا ہے وہ تمہارا ہے، لے لو، کیا مجال ہے انکار بھی کر جاؤں، لیکن، مر نہیں سکتا، تمہارے لیے جان نہیں دے سکتا۔"

ایسا معلوم ہوا جیسے زمین اس کے پاؤں تلے سے نکلی جا رہی ہے، اس نے رکتے رکتے ڈوبتے ہوئے انداز میں کہا:

" لیکن میں تمہاری جان کب طلب کر رہا ہوں؟ میں تو تم سے مدد کا جویا ہوں۔"

ہیم چند: یہ تو ٹھیک ہے، لیکن اس وقت تمہاری مدد کے معنی اپنی جان سے ہاتھ دھونا ہی — بتاؤ تو سہی کیا کروں میں؟

ہمت رائے: مہارانا کو اس حادثہ کی اطلاع نہ ہونے دو۔

ہیم چند: کیا تم سمجھتے ہو اگر میں اپنی زبان بند رکھوں تو مہاراجہ تک یہ خبر نہیں پہنچے گی؟ اگر یہ خیال ہے تو تمہارے پرلے درجے کے بے وقوف ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ہمت رائے: ہاں، یہ تو ٹھیک کہتے ہو، ان کے خبر رساں اور پرچہ نویس انھیں اطلاع دے ہی چکے ہوں گے۔

ہیم چند: بے شک — اب جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ میں خود سے مہارانا کے پاس کچھ دیر تک نہ جاؤں، لیکن اگر انھوں نے بلوایا تو جانا پڑے گا، اور خیر بھی

دینی پڑے گی،

ہمت رائے : لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا؟

ہیم چند: اس سے یہ فائدہ اٹھا سکتے ہو کہ جس طرح ہو سکے، ان بھگوڑوں اور غداروں کو تلاش کرو۔ کنویں میں بانس ڈال دو اور انھیں ڈھونڈ نکالو۔ تمہاری زندگی کی عافیت صرف اسی بات پر منحصر ہے۔

ہمت رائے : وہ تو کر رہا ہوں۔ میرے آدمی، فوج کے آدمی، پولیس کے آدمی زمین کے گز بنے ہوئے ہیں لیکن یہ کمبخت نہ جانے کہاں چھپ گئے ہیں، نہ جانے زمین کھا گئی ہے یا آسمان نگل گیا ہے لیکن پتہ نہیں چلتا ——

ہیم چند : تو بس پھر اب ایک ہی تدبیر ہے۔

ہمت رائے : (مطمئن ہو کر) کوئی تدبیر ہے تمہارے ذہن میں؟

ہیم چند : تم بھی بھاگ جاؤ۔

ہمت رائے : (افسردگی کے ساتھ) اس حالت میں کہ زندگی سے بیزار ہوں، تم مذاق کر رہے ہو؟ مذاق اڑا رہے ہو میرا؟

ہیم چند : یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے، مذاق نہیں۔

ہمت رائے : لیکن میں بھاگ کر کہاں جا سکتا ہوں؟ —— احمد خاں دولت خاں یا لودھی کے پاس چلا گیا، رگھو اور آنند بھی اس کے ساتھ ہیں۔ ان سب کو پناہ مل گئی لیکن مجھے کون پناہ دے گا؟ میں کہاں جاؤں گا؟

ہیم چند : تو پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ وہ بھی انتہائی ذلت اور رسوائی کے ساتھ تمہارا سر خطا معاف کر سکتے ہیں مگر نہیں بخش سکتے۔ تو یہ جرم ان کی نظر میں مجھے ڈر لگ رہا ہے وہ قیامت برپا کر دیں گے۔

ہمت رائے : تم انھیں سمجھا نہیں سکتے؟

ہیم چند: کیا سمجھاؤں؟ تم سے بڑھ کر ان کا خاص آدمی کون ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ تمہارے خون کے پیاسے ہو جائیں تو کس میں ہمت ہے کہ سفارش کا لفظ بھی زبان پر لا سکے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ اس شخص کو انھوں نے تمہاری تحویل میں دیا تو تمہیں چوکس رہنا چاہیے تھا۔

ہمت رائے : تم بھی مجھے الزام دے رہے ہو؟

ہیم چند : الزام نہیں دیتا، ایک اصولی بات کہتا ہوں۔ ذمہ داری بہرحال تمہاری ہے اور تم اس سے کسی طرح بچ نہیں سکتے!

ہمت رائے : تو کیا میں خود بھی احمد خاں کے ساتھ جا کر قید ہو جاتا؟

ہیم چند : یہ میں نے کب کہا؟

ہمت رائے : پھر تمہارا کیا مطلب ہے؟ چوکسی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے، کہ اسے راج بھون میں قید کیا جہاں پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا۔

ہیم چند: لیکن وہ بھاگ گیا۔

ہمت رائے : مجھے کیا معلوم تھا کہ رگھو اور آنند اس سے مل جائیں گے؟

ہیم چند: تمہارا فرض تھا کہ برابر ڈیوٹی بدلتے رہتے، پھر رگھو اور آنند ایسا نہیں کر سکتے تھے۔

ہمت رائے : ہاں بے شک یہ مجھ سے غلطی ہوئی۔

ہیم چند: اب اس کا خمیازہ بھگتو، ورنہ ان مجرموں کو لا کر حاضر کرو۔

ہمت رائے : کاش یہ میرے بس میں ہوتا۔

ہیم چند: مجھے تم سے ہمدردی ہے، دلی ہمدردی ہے لیکن بتاؤ میں کیا کروں؟

ہمت رائے : تم کچھ نہیں کر سکتے کوئی کچھ نہیں کر سکتا، جو کچھ کریں گے بھگوان کریں گے اب تو جو کچھ آس ہے انہی سے ہے۔

ہیم چند : لیکن ایک بات میری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتی ،
ہمت رائے : وہ کیا بات ہے ؟
ہیم چند : رانی ان لوگوں کے ساتھ کیوں بھاگی ؟
ہمت رائے : اس کا جواب تو وہی دے سکتی ہے ۔
ہیم چند : مانا اسے تم سے نفرت تھی وہ تمہاری سخت گیریوں سے بیزار، دل گرفتہ اور ملول تھی، اس کے دل میں تمہارے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی، لیکن وہ احمد خاں کے ساتھ جا کر کیا کرے گی ؟ رامو۔ رگھو، آنند کا تو یہ ہے کہ انھیں احمد خاں لودھی کے دربار میں، یا دولت خاں کے ہاں ملازمت دلائے گا۔ مگر رانی ؟ اس کا حشر کیا ہوگا ؟
ہمت رائے : وہ احمد خاں سے محبت کرتی تھی۔
ہیم چند : (حد درجہ متحیر اور حواس باختہ ہو کر) کیا کہا ؟ وہ احمد خاں سے محبت کرتی تھی ؟
ہمت رائے : ہاں، ـــــ یہ شرم کا مقام ہے لیکن واقعہ بہرحال واقعہ ہے۔
ہیم چند : تمہیں کیسے معلوم ؟
ہمت رائے : اس نے میرے سامنے اقرار کیا،
ہیم چند : اس نے اقرار کیا کہ وہ اس مسلمان سے محبت کرتی ہے ؟
ہمت رائے : ہاں، ـــــ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ!
ہیم چند : اور تم نے اس کی زبان نہ کاٹ لی، اس کی گردن نہ اڑا دی ؟
ہمت رائے : میرا خیال تھا وہ کمزور دل کی عورت ہے احمد خاں کے قتل کے بعد راہ راست پر آجائے گی، کل میری اس سے جو گفتگو ہوئی تھی اس سے بھی میں نے یہی اندازہ کیا تھا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ اندر ہی اندر کھچڑی پک رہی ہے اور

فرار کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں،
ہیم چند : بہرحال جو کچھ ہوا بہت برا ہوا !

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مہارانا کا چوب دار حاضر ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ہمت رائے کا خون سوکھ گیا۔ ہیم چند بھی گھبرا گیا۔ چوب دار نے ہیم چند سے کہا :

"آپ کی طلبی ہوئی ہے دربار میں "

ہیم چند چوبدار کے ساتھ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، لیکن چوب دار نے پلٹ کر ہمت رائے کی طرف دیکھا، اور گویا ہوا :

"آپ کو بھی یاد فرمایا ہے "

یہ الفاظ بجلی بن کر ہمت رائے کے قلب ناتواں پر گرے، اگر کسی نے اس کے سینہ میں خنجر گھونپ دیا ہوتا تو شاید اتنی تکلیف نہ ہوتی، جتنی طلبی کا فرمان سن کر ہوئی لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات مزاحمت اور مقاومت ممکن نہ تھی۔ مری ہوئی آواز کے ساتھ جواب دیا :

"چلو چلتا ہوں بھئی "

لیکن چوب دار نے بم کا ایک اور گولہ ہمت رائے کے سینے پر پوری قوت اور طاقت کے ساتھ مار دیا، اس نے کہا :

"مہاراجہ کا حکم ہے کہ آپ اپنے ساتھ احمد خاں اور رانی کو بھی لے کر حاضر ہوں "

ہمت رائے اور ہیم چند کی نظریں ملیں، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا کچھ کہنا بھی چاہا، لیکن مصلحت دیکھ کر رک گئے۔ خاموشی اختیار کر لی۔

ہمت رائے نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے چوب دار سے سوال کیا۔

"کیا مہارانا غصے میں ہیں اس وقت ؟ دوست سچ سچ کہنا، منہ مانگا انعام دوں گا "

چوب دار ہمت رائے سے اچھی طرح واقف تھا، یہ بھی جانتا تھا کہ یہ شخص

مال و دولت کے اعتبار سے ریاست کے چوٹی کے لوگوں میں ہے بلکہ سارے میواڑ میں اس سے بڑا کوئی آدمی نہیں، یہ اگر منہ مانگا انعام دینے پر تیار ہے تو واقعی دلدّر دور ہو جائیں گے۔ اس کا طرزِ عمل بدل گیا۔ نیازمندی اور فروتنی کے ساتھ اس نے کہا:

"ہاں —— مہارانا اس وقت بہت خفا ہیں۔"

"لیکن کس پر خفا ہیں؟ کیوں خفا ہیں؟"

"رانی کے کچھ عزیز آئے ہیں انھوں نے آپ کی شکایت کی ہے۔ یہ شکایت سن کر مہاراج نے کہا، آخر تم لوگ کسی نہ کسی سے رانی کی شادی کرتے۔ ہمارے بیٹے میں کیا عیب ہے کیوں نہ اس سے بیاہ دو۔ رانی بن کر رہے گی اس کے پاس دودھ میں نہائے گی۔ سونے چاندی سے کھیلے گی۔ ہر آرزو اور حسرت پوری ہوگی۔"

چوب دار کے یہ الفاظ سن کر ہمت رائے کی باچھیں کھل گئیں اس نے کہا:

"تم تو کہہ رہے تھے خفا ہیں مہارانا؟"

وہ بولا "سنیے تو سہی —— یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ آپ کا وہ پرانا دشمن اور مہارانا کا نیا مصاحب کشن پرشاد حاضر ہوا، اس نے آتے ہی سارا کھیل بگاڑ دیا۔"

چوب دار باتیں کرتے کرتے ذرا سے رکا۔ ہمت رائے نے سوال کیا:

"اس کمبخت نے کیا کھیل کھیلا آ کر؟"

چوب دار نے بتایا "اس نے آتے ہی مہارانا کو اطلاع دی کہ احمد خاں قلعہ سے فرار ہو گیا ہے۔ یہ سن کر مہارانا چونکنا ہوئے۔ پھر کشن نے کہا:

"رانی بھی بھاگ گئی ہے احمد خاں کے ساتھ۔"

یہ سن کر مہارانا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ غصّہ سے کانپنے لگا۔ ابھی ان کے منہ سے کچھ نہیں نکلا تھا کہ کشن پرشاد کہنے لگا۔

"اور مہارانا صاحب! قلعہ کے محافظ، رگھونندن اور آنند بھی، راجو اور رامو سمیت احمد خاں کے ساتھ فرار ہو گئے ہیں۔ پنچھی اڑ گیا، پنجرہ خالی پڑا ہے۔"

یہ سن کر مہارانا نے سوال کیا "یہ سب کیسے ہوا؟"

کشن پرشاد نے بتایا "ہمت رائے / لودھی اور دولت خاں سے مل گیا ہے اسی نے ان سب کو بھگایا ہے۔ ورنہ جس قلعہ میں پرندہ پر نہیں مار سکتا وہاں سے قیدی فرار ہو جائے، اور اپنے ساتھ قلعہ کے محافظوں کو بھی لیتا جائے۔ اور یہ سب اس اطمینان سے جائیں کہ محافظ قلعہ یعنی رگھونندن کی بیوی راجو اور اس کا سالا رامو بھی رفیق سفر ہوں کس طرح ممکن ہے؟ —— کھلی ہوئی سازش ہے، اسے سازش کے سوا کسی اور نام سے یاد ہی نہیں کیا جا سکتا۔"

یہ سن کر مہارانا کچھ دیر سر جھکائے سوچتے رہے پھر مجھے حکم دیا کہ آپ کو، اور انھیں (بھیم چند کو) اپنے ساتھ لے کر فوراً پہنچوں۔"

---

(۱۱)

ہمّت رائے کا قتل

یہ قیامت کی گھڑی تھی!

ہمت رائے مہارانا سانگا کے سامنے کھڑا تھا اور وہ پیکرِ جلال بنے خون
اور شرر ریز آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے!

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اب نہ جانے کیا ہوگا۔

مہارانا برہمی اور غضب کے عالم میں نہ جانے کیا حکم صادر فرمائیں گے!

ہمت رائے شہر کا سب سے معزز، دولت مند، بااثر، بارسوخ اور سمجھدار
آدمی تھا، مہارانا کی ناک کا بال تھا، ان کا منہ چڑھا مصاحب تھا، ان کا
اور مشیر تھا، معتمد اور محرم راز تھا، اس کے اثر و رسوخ اور وجاہت کا دبدبہ
خیر لوہا مانتے ہی تھے مگر مہارانا بھی اس کی دھونس مانتے تھے! — مگر آج!

مگر آج معاملہ بے ڈھب تھا، آج مہارانا کا رنگ کچھ اور تھا، آج ہمت
کی ساری شوخی، بذلہ سنجی، حاضر جوابی، تعلّی جواب دے چکی تھی!

مہارانا نے خشم آلود نگاہوں سے ہمت رائے کو دیکھا اور بے ساختہ سوال کیا:

"احمد خاں کہاں ہے؟"

ہمت رائے نے چاہا کہ کچھ جواب دے لیکن مہارانا نے اسی لب ولہجہ میں ایک
سوال اور جڑ دیا۔

"رگھونندن کہاں ہے؟"

ہمت رائے کی ہمت جواب دینے لگی۔ اس مرتبہ اس کے لبوں نے جنبش نہیں کی،
وہ ہراساں اور سہمگیں اپنے آقا، اور اپنے مہارانا کو دیکھتا رہا، مہارانا نے پھر پوچھا

"آنند کہاں ہے؟"

ہمت رائے کے پاس بھلا کیا جواب تھا؟ وہ کیا کہہ سکتا تھا؟ اس نے حسرت بھری
نظروں سے اپنے اس مہارانا کو دیکھا جو اسے دیکھ کر پھول کی طرح کھل جایا کرتا
تھا، جو اصرار کے ساتھ اسے اپنی مجلسوں میں بلاتا تھا، اور دوستانہ طور پر باتیں کرتا
تھا، جو اسے شراب و کباب، رقص و سرود اور عیش و نعم کی رنگ آرائیوں میں
شریک رکھتا تھا، جو اس کی ایک ایک بات پر سر دھنتا تھا، جو اس کے لطیفے سن سن کر
ہنستے ہنستے لوٹ جاتا تھا آج قہر و غضب کا مجسمہ بنا ہوا ہے، قاتل نگاہوں سے اسے
گھور رہا ہے۔ اس نے بے بسی کی ایک نظر اپنے ولی نعمت پر ڈالی، اور ایک
ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گیا۔

مگر اس کی یہ بے بسی، اس کی یہ خاموشی، اس کی یہ سراسیمگی بھی مہارانا کو متاثر
نہ کر سکی۔ انہوں نے اور زیادہ کرخت، درشت اور سخت لب ولہجہ میں اپنے اس غلام
سے سوال کیا:

"راجو کہاں ہے؟ رامو کہاں ہے؟"

مہارانا نے کبھی راجو، رامو، آنند اور رگھونندن سے دلچسپی نہیں لی تھی، کبھی
ان کا ذکر نہیں کیا تھا، ان کی بات نہیں پوچھی تھی، ان کا ذکر نہیں کیا تھا، انہیں شرف
باریابی عطا فرمایا تھا،

مگر آج ؟

مگر آج یہ سب یاد آرہے تھے۔ بری طرح یاد آرہے تھے۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ایک مرتبہ پھر ایسا معلوم ہوا جیسے کان کے پردے پھٹ جائیں گے۔ مہارانا کی سامعہ خراش آواز اس کے پردۂ گوش سے ٹکرائی۔

"تیری وہ محبوبۂ دل نواز رانی کہاں ہے ؟"

آخر بے چارہ کب تک خاموش رہتا ؟ کب تک سوالوں کی یہ بوچھاڑ، جو تیروں کی بوچھار سے ہرگز کم نہ تھی، اکب تک برداشت کرتا رہتا۔ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا :

"بھاگ گئے، سب لوگ !"

مہارانا نے اور زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ دریافت فرمایا :

"کہاں گئے بھاگ کر ؟"

ہمت رائے نے اپنی قوت گویائی بحال کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یہ نمک حرام، غدار اور بے وفا لوگ کہاں گئے ہیں کاش اب مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ کہاں ہیں تو ابھی تن تنہا جاکر انھیں گرفتار کر لاؤں اور آپ کے قدموں پر لاکر ڈال دوں !"

مہارانا نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر ہمت رائے نے موقعہ نہ دیا، اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :

اگر یہ مجھے مل جائیں تو انھیں ایسی سزا دوں گا کہ دریا کی مچھلیاں اور دشت پر بسیرا لینے والی چڑیاں ان کے حال پر روئیں گی —— مہارانا آپ نہیں جانتے میرے دل کا کیا حال ہو رہا ہے ؟"

مہارانا نے زہر خند کرتے ہوئے کہا :

"ہم جانتے ہیں تمہارا کیا حال ہو رہا ہے، تمہیں رانی یاد آرہی ہے، تم اس کے فراق میں جان سے گزرے جارہے ہو، تم نے اسے اپنانا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکے !"

ہمت رائے نے روتے ہوئے کہا :

"میں اس سے نفرت کرتا ہوں، میں اس کا دشمن ہوں، وہ مجھے مل جائے تو اپنے ہاتھ سے اسے قتل کر دوں گا !"

مہارانا نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور کہا :

"ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تم رانی سے کیا سلوک کرنا چاہتے ہو، سوال یہ ہے کہ تم نے اسے اغوا کیوں کیا ؟ اس کے ماں باپ سے اسے کیوں چھڑایا ؟ اس کے بے گناہ منگیتر کو کیوں قتل کرایا ؟"

ہمت رائے حیرت سے اپنے آقا کی صورت دیکھنے لگا۔

ان میں سے کونسی بات تھی جو بہت پہلے سے انھیں معلوم نہ تھی ؟ نہ صرف انھوں نے کبھی برہمی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس کارنامہ پر خوشنودی مزاج کا اظہار فرمایا۔ جب وہ رانی کو اس کے گھر سے چھین کر لایا تھا، اور یہ خوش خبری مہارانا کو سنائی تھی تو انھوں نے اس کارنامہ کی داد دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔

"ہمت رائے تم نے عاشقوں کی لاج رکھ لی، بڑا کام کیا۔ ہمیں تم سے یہی امید تھی۔"

اور آج وہی مہارانا پوچھ رہے ہیں "تو نے اسے اغوا کیوں کیا ؟ .....
...... ؟ تو نے اس کے ماں باپ سے اسے کیوں چھڑایا ؟ تو نے اس کے بے گناہ منگیتر کو کیوں قتل کیا" حالانکہ پہلی مرتبہ جب یہ خبر سنی تھی تو کہا تھا "ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ ایک محبوب کے دو عاشق بیک وقت

زندہ نہیں رہ سکتے۔ تم نے وہی کیا ہمت رائے جو ایک غیرت مند عاشق کو کرنا چاہیے تھا۔"

مگر آج ؟

مگر آج وہی بات اس طرح پوچھی جا رہی ہے جیسے اس سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

وہ سوچنے لگا "کیا مہارانا واقعی مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں ؟"

دل نے کہا، ضرور قتل کرنا چاہتے ہیں ورنہ یہ ان ہونی باتیں کیسی ؟

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ایک مرتبہ پھر مہارانا نے اسے مخاطب کیا۔

"ہم نے احمد خاں کو تمہاری حراست میں دیا تھا، وہ کہاں ہے ؟ لاؤ اسے ہمارے حضور میں پیش کرو۔ ہم اپنے ہاتھ سے اسے قتل کریں گے !"

ہمت رائے کی قوت گویائی ایک مرتبہ پھر جواب دے گئی۔

اور دفعتہً مہارانا کا طرز عمل بدل گیا۔

اب تک وہ قہر مجسم بنے ہوئے تھے اب یکایک پھر بے تکلف دوست بن گئے فرمایا :

ہمت رائے بات یہ ہے کہ شہنشاہ بابر نے ہماری دعوت قبول کر لی ہے وہ لودھی خاندان کا نام و نشان مٹانے اپنی فوج لے کر بہت جلد آ رہا ہے۔"

گفتگو کا موضوع بدلنے سے ہمت رائے کی جان میں جان آئی، اس نے سوچا اب کوئی ناخوشگوار حادثہ نہیں پیش آئے گا۔ اس کی ساری پریشانیاں دور ہو گئیں دہشت کا فور ہو گئی، اضطراب اور سراسیمگی کا پتہ بھی نہ رہا، اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

" یہ تو بہت بڑی خوشخبری ہے۔"

مہارانا نے اور زیادہ اسے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔

" اب وقت آ گیا ہے کہ ہمارا دیرینہ خواب پورا ہو، لودھی خاندان مٹ جائے گا، مسلم حکومت ختم ہو جائے گی، بابر طوفان کی طرح آئے گا، اور آندھی کی طرح چلا جائے گا، اس کے بعد ——"

ہمت رائے نے لقمہ دیتے ہوئے کہا :

" اس کے بعد ہمارے مہارانا اس پورے ملک کے مالک بن جائیں گے۔"

مہارانا نے تائید کی،

" ہاں —— یہ ملک ہمارا ہے۔ یہ دیس ہمارا ہے، یہ زمین ہماری ہے، یہ جنگل یہ پہاڑ، یہ دریا، سب ہمارے ہیں، ان پر آ کر غیر مذہب اور غیر ملک کے لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ وہ ہمارے آقا اور مالک بن گئے تھے، ہم اپنی نا اتفاقی اور کمزوری کے باعث ان کے محکوم بن گئے تھے، لیکن —— لیکن زمانہ اور بھی بدلے گا۔ ایک بار ابھی ——"

ہمت رائے نے جوش سے بے قابو ہو کر کہا۔

" بے شک، بے شک، ایسا ہی ہو گا، ان مسلمانوں کا نام و نشان مٹ جائے گا۔"

مہارانا نے اسے اپنا محرم راز بناتے ہوئے کہا :

" ہم نے بابر سے وعدہ کیا ہے کہ اس کی فوج سے اور زر و مال سے مدد کریں گے لیکن ——"

" لیکن ہرگز نہیں کریں گے !"

" (مسکرا کر) خوب سوچا تم نے، واقعی ایسی حماقت کا ارتکاب ہم نہیں کر سکتے۔ ان دونوں موذیوں کو لڑنے دو، جو ہار جائے گا وہ پٹ جائے گا۔ جو جیت جائے گا وہ بھی بے جان ہو جائے گا۔ ہم بڑی آسانی سے اسے دھکیل دیں گے اس کی سرزمین

ہیں، اسے واپس چلا جانا پڑے گا — ویسے گمان غالب یہ ہے کہ جیت بابر کی ہوگی!"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"اب لودھی کا خاتمہ کیس ہوا ہی چاہتا ہے۔ صرف بابر کے آنے کی دیر ہے۔"

"آپ کی اطلاع کیا ہے؟ کب تک آجائے گا وہ؟"

"اسے بس آیا ہوا سمجھو۔ ہمارا خیال ہے ایک مہینہ کے اندر اندر پہنچ جائے گا۔"

"خدا کرے وہ ایک مہینہ آج ہی ختم ہوجائے۔"

مہارانا نے زور دار قہقہہ لگایا۔ ہمت رائے بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگا۔

پھر مہارانا نے فرمایا "ہمت رائے، یہ بڑا نازک وقت ہے!"

"کیوں مہارانا، نازک وقت کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ اگر کہیں کمبخت لودھی یا دولت خاں کو ہمارے عزائم کی، بلکہ یوں کہو ہماری چال کی خبر مل گئی تو جانتے ہو کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں ہوگا میرے آقا۔"

"نہیں ہمت رائے بے وقوف نہ بنو۔ پھر بابر کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہماری شامت آجائے گی!"

"وہ کیسے آقائے ولی نعمت؟"

"وہ اس طرح کہ پھر دولت خاں اور لودھی اپنے اختلافات ختم کرکے دوست بن جائیں گے اور متحدہ طور پر حملہ کردیں گے ہم پر، اور ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ان کی متحدہ یلغار کا مقابلہ کرسکیں۔ ہم شکست کھا جائیں گے، ہم مٹ جائیں گے!"

"نہیں مہاراج ایسا نہیں ہوگا۔ لودھی کی یہ ہمت نہیں کہ آپ پر حملہ کرسکے، اور دولت خاں میں یہ سکت ہے کہ آپ پر یلغار کرے۔ میں ان دونوں کو بہت اچھی طرح

جانتا ہوں!"

"ہاں تم جانتے ہو، دونوں کو ہمیں معلوم ہے — لیکن میرے عزیز، اگر انھیں یہ یقین ہوگیا کہ بابر واقعی آرہا ہے تو مرنے سے پہلے ہمیں مارنے کی ضرور کوشش کریں گے؟"

"لیکن منہ کی کھائیں گے، کر کیا سکتے ہیں!"

"منہ کی اس وقت کھائیں گے جب وہ ہماری کمزوریوں سے واقف نہ ہوں۔ انھیں ہماری تیاریوں کا علم نہ ہو، وہ ہمارے فوجی راز نہ جانتے ہوں۔"

"لیکن —"

"لیکن اگر وہ یہ سب کچھ جان گئے ہیں، یا جان جائیں گے تو ہم نقمۂ تر کی طرح ان کے منہ میں چلے جائیں گے!"

"لیکن ہماری راز کی باتیں انھیں کس طرح معلوم ہوسکتی ہیں؟ کون بتا سکتا ہے؟"

مہارانا نے اپنا منہ ہمت رائے کے کان سے لگالیا اور سرگوشی کے لہجہ میں کہا "رگھو نندن —"

ہمت رائے پر بجلی گر پڑی، اس نے چونک کر مہارانا کو دیکھا۔

لیکن مہارانا کا چہرہ اس وقت تاثرات سے خالی تھا۔ انھوں نے اسی اپنائیت، خلوص اور دوستی کے لہجہ میں سرگوشی کرتے ہوئے ایک نام اور ہمت رائے کے کان میں امرت کی طرح ٹپکا دیا — !

"آنند"

ہمت رائے کا سارا سکون ختم ہوگیا۔

مہاراجہ کی روش میں جو تبدیلی اس نے دیکھی تھی اس نے اسے مطمئن کردیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یہاں صحیح سلامت آیا ہے اور صحیح سلامت یہاں سے واپس جائے گا!

لیکن اب یہ یقین متزلزل ہونے لگا۔
زمین اس کے پاؤں تلے سے سرکنے لگی۔
ایسا معلوم ہوا جیسے موت سامنے کھڑی ناچ رہی ہے!
اس کے تن بدن پر رعشہ طاری ہو گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زمین اوپر جا رہی ہے اور آسمان نیچے آ رہا ہے۔
بڑی مشکل سے اس نے اپنے حواس مجتمع کئے اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا:
"مگر ہمارے فوجی راز وہ کیا جانیں؟"
مہاراجہ دفعتہً پھر بدل گئے، ان کے چہرے کا رنگ پھر تبدیل ہو گیا۔ تبسم رخصت ہو گیا۔ خشونت نے اس کی جگہ لے لی، جن آنکھوں سے ابھی محبت کے فوارے چھوٹ رہے تھے انہی سے اب نفرت، برہمی اور انتقام کے شعلے برسنے لگے۔ انھوں نے فرمایا:
"کیا رگھو نندن سرکاری ملازم نہ تھا؟ — جواب دو!"
"تھا، ضرور تھا!"
"کیا وہ ہماری حکومت کے حکام سے، افسروں سے، وزیروں سے برابر سے ملتا نہیں رہتا تھا — جواب دو!"
"(کانپ کر) ملتا رہتا تھا سرکار!"
"کیا وہ خود بھی فوج کا ایک عہدے دار نہیں تھا؟ — خاموش کیوں ہو؟ ہم تمہارا جواب سننا چاہتے ہیں۔"
"تھا مہاراج ادھیراج!"
"اور آنند؟"
"وہ بھی آقائے ولی نعمت۔"

"اور رامو؟"
"وہ بھی سرکار دولت مدار۔"
"تو کیا یہ لوگ احمد خاں کے ساتھ صرف اس لیے گئے ہیں کہ دعوت کھا کر واپس چلے آئیں؟"
ہمت رائے سے کوئی جواب نہ بن پڑا، مہاراجا نے فرمایا:
"یہ لوگ دشمن کے آلۂ کار بن کر گئے ہیں۔ یہ ایک دشمن کی حیثیت سے گئے ہیں یہاں سے گئے ہیں کہ ہمیں اور ہماری حکومت کو ختم کر دیں مٹا دیں تباہ کر دیں۔"
"مہاراجا نے —"
"اور اگر کوئی اور مقصد ہے ان کے جانے کا تو بتاؤ!"
پھر مہاراجا نے ہیم چند کی طرف دیکھا، جو اب تک خاموش کھڑا یہ باتیں سن رہا تھا، کچھ دیر تک اسے تکتے رہے پھر فرمایا۔
"تم ہمارے وفادار ہو یا اس ہمارے دشمن کے دوست؟"
ہیم چند کی جان پر بن گئی، اس نے اپنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو زمین پر جمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"میری وفاداری زندگی کی آخری سانس تک صرف آپ کے ساتھ ہے، جو آپ کا دوست ہے وہ میرا دوست، جو آپ کا دشمن ہے وہ میرا دشمن!"
مہاراجا نے مسکراتے ہوئے کہا "شاباش — لیکن ہم ثبوت چاہتے ہیں۔ میان سے تلوار نکالو۔ اگر وہ زنگ خوردہ نہیں ہے تو ہمارے اس دشمن کی گردن مار دو فوراً"
ہیم چند نے حکم کی تعمیل کی، ہمت رائے کا سر تلوار کی ایک ہی ضرب میں مہاراجا کے قدموں پر آ گرا۔

قافلۂ سخت جاں

○

جنھیں آنا تھا آ پہنچے جنھیں جانا تھا جاتے ہیں
رضا اٹھو، سحر ہوتی ہے، تارے جھلملاتے ہیں

(۱)

سادھومہاراج

خفیہ اور علانیہ راستوں سے رگھو اور آنند اچھی طرح واقف تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہاں رات گزارنی چاہیے اور کدھر دن کے وقت رہروی کرنا چاہیے؟ کہاں پانی ملے گا؟ اور کس جگہ خوراک اور رسد دستیاب ہو سکے گی؟ کس مقام لوگ شک و شبہ میں مبتلا ہو کر تعاقب پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اور کس بستی کے لوگ دیدہ و دل فرش راہ کر دیں گے؟ کہاں آؤ بھگت ہو گی اور کہاں دور ہی سے مدارات کی جائے گی؟

چنانچہ راستہ بڑے آرام اور اطمینان سے کٹتا رہا۔ یہ مختصر سا قافلہ جس کے افراد ایک دوسرے کے جاں نثار اور فداکار تھے، بغیر کسی خوف و خطر کے انتہائی آرام اور عافیت کے ساتھ سرگرم سفر رہے۔

رگھو، آنند، رامو اور راجو، سب اپنی اصل وضع قطع میں تھے۔ ایک احمد خاں ساتھ تھا جو اپنی شکل و صورت، چال ڈھال اور وضع قطع کے اعتبار سے سب سے جدا اور منفرد تھا۔

لیکن رگھو کی دانشمندی، آنند کی چابک دستی اور رامو کی فنکاری نے یہ مشکل

بھی آسان کر دی، بڑی آسانی سے احمد خاں نے مراری پرشاد کا روپ دھار لیا۔ یہ بہروپ اس خوبی سے اس نے بھرا کہ اگر ایک مرتبہ ہمت رائے بھی اسے دیکھ لیتا تو ہرگز نہ پہچان سکتا۔ یہی سمجھتا کوئی بہت بڑے پنڈت اور سادھو ہیں، جو اپنے چیلے چانٹوں کے ساتھ کسی یاترا پر تشریف لیے جا رہے ہیں۔ چونکہ اس نے سادھو کی وضع اختیار کی تھی اور یہ لوگ اس کے چیلے بنے ہوئے تھے اس لیے اس کی سب سے بڑی کمزوری چھپ گئی۔ اگر وہ بات کرتا تو زبان اور لب و لہجے سے چوری فوراً پکڑی جاتی، مگر اب اسے بولنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، بلکہ اجازت ہی نہیں تھی کہ اپنی زبان کو زحمتِ تکلم دے، اپنی بھاری بھرکم اور مقدس شخصیت کے لحاظ سے اسے خاموش ہی رہنا چاہیے تھا، اور یہ چیلے اکیلے میں تو خوب اس سے باتیں کرتے مگر لوگوں کے سامنے مؤدب ہو جاتے، اور اس کے اشارے سمجھ کر اس کی ضرورتیں پوری کر دیتے۔

یہ چھوٹا سا قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں چلا جا رہا تھا جس بستی میں یا قصبے میں پہنچتا وہاں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ لوگ درشن کے لیے ٹوٹ پڑتے اور سادھو مہاراج کو عقیدت کی نظروں سے پہروں دیکھا کرتے۔

ایک روز شام ہو چلی تھی اور اب تک کسی بستی کا نشان نظر نہیں آیا تھا۔ چلتے چلتے یہ لوگ تھک چکے تھے۔ دن کا بڑا حصہ چلتے چلتے گزرا تھا۔ پیاس بھی لگ رہی تھی اور بھوک بھی ستا رہی تھی، راجو نے کہا:

"اب نہیں چلا جاتا، تھک گئے ہم!"

آنند نے اپنے گرد سے اٹے ہوئے پاؤں پر ایک نظر ڈالی اور گویا ہوا:

"من من بھر کے ہو گئے ہیں یہ پاؤں — واقعی اب تو ایک قدم بھی چلا نہیں جا رہا ہے۔"

رگھونندن نے مشورۃً پوچھا:

"پھر کیا کیا جائے؟ — یہ سامنے باغ ہے کیا یہیں ڈیرہ ڈال دیں؟"

احمد خاں نے جو اب تک خاموش تھا کہا "لیکن یہاں مرغی کہاں ملے گی؟"

راجو نے حیرت کی نظروں سے اسے دیکھا اور سوال کیا۔

"مرغی؟ — وہ کیا ہوگی؟"

احمد خاں نے جواب دیا، "کھائیں گے اور کیا ہوگا؟"

وہ سینہ پر ہاتھ مارتی ہوئی متحیر کے انداز میں بولی:

"ہائے دیّا رے! — یہ پاپ"

آنند اور رگھو اس ادائے ترکانہ پر ہنسنے لگے۔ آنند نے کہا:

"چند روز میں ہم لوگ آگرے پہنچے جاتے ہیں۔ وہاں جتنی چاہیے گا مرغیاں کھائیے گا مگر یہاں رہتے ہیں اوّل تو ملے گی کہاں؟ اور اگر مل بھی گئی تو بھلا سادھو مہاراج کو کون عقیدت مند مرغی کھلانے پر آمادہ ہوگا؟"

رگھونندن نے آنند کی تائید کرتے ہوئے کہا:

"بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ کہیں مرغی کے بجائے ہم سب کو لاٹھیاں اور بلّم نہ کھانے پڑ جائیں —"

احمد خاں نے مچلتے ہوئے کہا "کچھ ہو بھئی، چلتے چلتے تین چار دن ہو گئے اور اس ساری مدت میں، سوا پوری کچوری اور حلوے کے کچھ کھانے کو نہیں ملا، فوری نظر بندی اور قید کے زمانے میں بھی گوشت نہیں ملتا تھا، لیکن کھانا تو بہرحال مزے دار ہوتا تھا۔ اب تو ایک لقمہ بھی یہ خاکسار کھانے پر تیار نہیں، جب تک دسترخوان پر مرغِ مسلم نہ ہو؟"

راجو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"لیکن پکائے گا کون؟ ـــــ میں تو اس میں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی اور آپ کی خاطر سے یہ ہتیا اور پاپ گوارا بھی کروں تو بھی میں کیا جانوں کہ مرغ مسلم کس طرح پکتا ہے؟"

احمد خاں نے ہنستے ہوئے جواب دیا:

"یہ کونسا ٹیڑھا سوال ہے؟ ـــــ ہم خود پکا لیں گے!"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔

"آپ پکا لیں گے؟"

احمد خاں نے جواب دیا "تو کیا ہوا؟ کیا سمجھتی ہو ہمیں؟ ہم ہر فن مولا ہیں تلوار چلانا بھی جانتے ہیں اور ہانڈی پکانا بھی۔ دشمن کا سر بھی کاٹ سکتے ہیں اور مرغ کی کھال بھی اتار سکتے ہیں!"

ایک مرتبہ پھر سب نے مل کر قہقہہ لگایا، راجو بولی:

"بس تو پھر مرغی کا بندوبست کر دوں گی؟"

رگھو نے پوچھا "کیا چرا لائے گی کہیں سے؟"

وہ بولی "چرا لاؤں یا ڈاکہ مار لاؤں، یہ میرا کام ہے، اسے مجھ پر چھوڑ دو"

آنند واقعی بہت تھک گیا تھا۔ اس نے اضطراب سے ساتھ کہا:

"یہ سب کچھ تو ہوتا رہے گا، لیکن کوئی بستی تو نظر نہیں آ رہی، شام ہو چلی ہے، کیا رات بھر ہم یونہی چلتے رہیں گے؟"

رگھو نے سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا:

"وہ دیکھو ـــــ ہلکی سی روشنی نظر آ رہی ہے، شاید کوئی گاؤں ہے"

آنند نے بے بسی کے ساتھ کہا، وہ تو میلوں دور ہے"

رگھو نے تسلی دیتے ہوئے کہا "زیادہ سے زیادہ دو میل ہوگا، بس ابھی پہنچے

(۲)

"تج شنکر!"

یہ بسنت پور تھا!

ایک چھوٹا سا گاؤں، زیادہ سے زیادہ چالیس پچاس گھر ہوں گے۔

رات شروع ہو چکی تھی کہ یہ قافلہ گاؤں میں داخل ہوا۔ سادھو مہاراج اور ان کے چیلوں کو دیکھ کر لوگ دیوانہ وار ٹوٹ پڑے۔

ایک تو ویسے ہی ادھر سادھوؤں کا گزر کم ہوا کرتا تھا مگر کوئی سادھو اپنی ٹولی لے کر اب تک ادھر سے نہیں گزرا تھا۔

فوراً مہمان داری کا اہتمام شروع ہو گیا، گاؤں کے مکھیا جگدیش نے چند لمحوں کے اندر، اپنا مکان خالی کر دیا اور خود اپنے بھائی کے ہاں بال بچوں سمیت چلا گیا۔

سادھو مہاراج کے لیے مرگ چھالا بچھا دی گئی اور وہ اس پر آنکھیں بند کیے وقار اور جلال کی تصویر بن کر بیٹھ گئے۔

عقیدت مندوں اور دیدار کرنے والوں کا آن کی آن میں تانتا لگ گیا۔ یہ بھیڑ تو حاجت مندوں اور پریشان حالوں نے آ کر جمگھٹ قائم کر دیا۔

کوئی سادھو مہاراج سے التجا کر رہا ہے کہ اس پر جو قرضہ ہو گیا ہے وہ اتر جائے۔ کسی کی تمنا ہے کہ زمیندار بڑا ظالم ہے وہ مر جائے۔ ایک عورت کو شکایت تھی کہ اس کا شوہر اسے بے طرح مارتا ہے، وہ آدمی بن جائے۔ ایک مرد کی فریاد تھی کہ اس کی بیوی میکہ جا کر بیٹھ رہی ہے کسی طرح نہیں آتی، وہ خود بخود چلی آئے۔

سادھو مہاراج خاموشی کے ساتھ یہ سب باتیں سن رہے تھے کبھی کبھی۔

"جے شنکر!" کا نعرہ لگا دیتے تھے۔

راجو سادھو مہاراج کی ترجمان بنی ہوئی تھی، وہ ان کے نعروں اور اشاروں کا مطلب ہر حاجت مند کو سمجھا کر رخصت کر دیتی تھی۔ جو نذرانہ نقد و جنس کی صورت میں برس رہا تھا اسے بھی سینت سینت کر رکھتی جاتی تھی۔

آخر رفتہ رفتہ مجمع چھٹنا شروع ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد سب چلے گئے لیکن ایک نوجوان شخص پتھر کی طرح اپنی جگہ جما بیٹھا رہا۔

رگھو نندن نے اس سے کہا:

"اب جاؤ بھائی، سادھو مہاراج کی تپسیا (عبادت) کا یہ وقت ہے۔ اس وقت کوئی بھی ان کے پاس نہیں بیٹھ سکتا۔ ہم لوگ بھی الگ جا کر سو رہیں گے، اور وہ رات بھر تپسیا کرتے رہیں گے، ان کا وقت نہ ضائع کرو۔"

نوجوان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اٹھا اور سادھو مہاراج کے پاؤں پکڑ لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا:

آنند نے ہمدردی کے ساتھ کہا "کوئی دکھی معلوم ہوتا ہے؟"

رگھو نندن نے تائید کی، اور کہنے لگا:

"ہاں بھئی اس سنسار میں کون دکھی نہیں ہے؟"

راجو اس نوجوان کے قریب آ گئی، اور دل سوزی و ہمدردی کے لہجہ میں کہنے لگی:

"بتاؤ تو سہی بھیا کیا بات ہے؟"

نوجوان نے راجو پر ایک نظر ڈالی پھر شرماتے ہوئے کہا:

"میں لاجونتی سے محبت کرتا ہوں، مگر وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے!"

راجو نے پوچھا "پھر ہم کیا کریں؟"

نوجوان ضد کرتا ہوا بولا، "نہ تم کچھ کر سکتی ہو نہ میں۔ بس سادھو مہاراج میری بگڑی بنا سکتے ہیں۔"

دفعتہً سادھو مہاراج نے ایک فلک شگاف نعرہ لگایا۔

"جے شنکر!"

راجو نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا "جاؤ بھیا تمہارا کام بن گیا۔ سادھو مہاراج کی کرپا سے لاجونتی تم سے محبت کرنے لگے گی!"

نوجوان خوش ہو گیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سادھو مہاراج کے چرن چھوئے اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

راجو نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "لیکن یہ کام یوں نہیں ہو گا!"

نوجوان جاتے جاتے رک گیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

راجو نے کہا "ایسا کرو، سیر بھر گھی، ایک بالکل سفید مرغا، ایک کالی بلی ایک چتکبرے کبوتر، دو سیر دودھ، ایک اشرفی، یہ ساری چیزیں لے کر ابھی آ جاؤ۔"

نوجوان نے پوچھا "ان ساری چیزوں کا کیا ہو گا؟"

وہ بولی "سادھو مہاراج رات بھر تپسیا کریں گے، ہم ان چیزوں کا ہوں کریں گے — اور لاجونتی کا تصور کر کے اسے تمہاری محبت پر مجبور کر دیں گے،

دیکھ لینا، چند دن کے اندر اگر وہ تم سے محبت نہ کرنے لگے تب کی بات!"

نوجوان اس خوش خبری سے نہال ہو گیا، اس نے کہا:

"ابھی لاتا ہوں جا کر یہ ساری چیزیں۔"!

اس کے جانے کے بعد رگھو نے پوچھا، "بلی کا کیا کرو گی؟"

وہ بولی رات کو چھوڑ دیں گے۔

آنند نے سوال کیا "اور چتکبرے کبوتر کیا ہوں گے؟"

راجو نے جواب دیا "انھیں تھوڑی دیر کے بعد اڑا دیں گے!"

اس بے ساختہ جواب پر رامو، آنند اور رگھو کے علاوہ سادھو مہاراج بھی ہنس پڑے لیکن اس طرح نہیں کہ قہقہے کی آواز گھر سے باہر جائے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ نوجوان چوروں کی طرح آیا اور یہ ساری چیزیں لے گیا۔

راجو نے انھیں اپنی تحویل میں لیتے ہوئے کہا:

"اب جاؤ، صبح آ کر سادھو مہاراج کی آشیرواد ایک مرتبہ پھر لے لینا۔ بس چٹکی بجاتے میں کام بن جائے گا!"

نوجوان نے گوش عقیدت سے یہ باتیں سنیں، اور چپ چاپ سر جھکا کر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد راجو نے گھر کی تلاشی لی، ضرورت کی ہر چیز موجود تھی نمک، مرچ اور ہر قسم کا مسالہ، اس نے ایک پتیلی دھو مانج کر سادھو مہاراج کے سامنے لا کر رکھ دی، اور بولی۔

"لیجئے سادھو مہاراج مرغ مسلم پکائیے اطمینان سے!"

سادھو مہاراج نے نہایت اطمینان سے اسے ذبح کیا، کھال اتاری، مسالہ ان کے حسب ہدایت راجو نے پیس دیا تھا، چولھا بھی سلگ گیا تھا، سادھو مہاراج نے اللہ اللہ کہہ کر دیگچی چڑھا دی اور پھر زور سے

"جے شنکر"

کا نعرہ لگایا، جس کی آواز دور دور تک گئی۔

گاؤں کے جو لوگ درشن کے لیے آئے تھے، نذرانے کے طور پر بہت سی چیزیں دے گئے تھے۔ پوری، پکوڑی اور حلوے کا تو ڈھیر لگ گیا تھا، اتنا تھا کہ کئی دن کھاتے تب بھی بچ رہتا۔

کوئی ایک گھنٹہ کے اندر مرغ بھی تیار ہو گیا۔ سادھو مہاراج نے ایک پلیٹ میں سارا اپنے سامنے انڈیل لیا۔ اس لیے کہ دوسرا کوئی حریف موجود نہ تھا، جو حصہ لیتا۔ کچھ تھوڑی سی پوریاں اور کچوریاں اور حلوا بھی اپنے سامنے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے رکھ لیا اور نہایت اطمینان کے ساتھ ساری پلیٹ صاف کر دی پھر راجو سے پوچھا:

"لیکن یہ پر، یہ کھال، یہ ہڈیاں ان سب کا کیا ہو گا؟ ان میں سے اگر کوئی چیز بھی صبح کسی کو نظر آ گئی تو ہم میں سے کسی کی خیریت نہیں ہے۔"

راجو نے رامو کی طرف دیکھا اور کہنے لگی، "میں تو برتن دھوتی ہوں، تم جھاڑی سے ایک گڑھا کھود دو، اور یہ ساری چیزیں دفن کر کے مٹی برابر کر دو، خبردار کوئی نشان باقی نہ رہنے پائے!"

تھوڑی دیر میں یہ کام بھی انجام پا گیا۔ سادھو مہاراج نے ایک مرتبہ پھر زور دار آواز میں "جے شنکر" کا نعرہ لگایا، اور اپنے مرگ چھالے پر استراحت کرنے کے لیے، فارغ ہو کر لیٹ گئے۔

---

(۳)

مجلسِ شبینہ

بسنت پور میں سادھو مہاراج کی ضرورت سے بہت زیادہ آؤبھگت ہوئی صبح کوچ کا ارادہ تھا ، لیکن گاؤں والے کسی طرح اس قدر جلد رخصت کرنے پر آمادہ نہ ہوئے ۔ ادھر یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہیں راناسانگا کی فوج ظفر موج ہمت رائے کی سربراہی میں ، ـــــ انھیں کیا معلوم کہ وہ جہنم رسید ہوچکا ہے ـــــ پکڑ نہ لے کہ سارا کھیل بگڑ جائے ، لیکن اتنے شدید اصرار کا جواب صاف انکار سے بھی نہیں دیا جاسکتا تھا ۔ سادھو مہاراج نے تو کوئی جواب نہیں دیا ، لیکن رگھو نندن نے کہا :

" اچھا تم لوگوں کے اصرار سے آج تو ہم لوگ رکے جاتے ہیں اور جس طرح بنے گا سادھو مہاراج کو بھی راضی کرلیں گے ، لیکن کل صبح تڑکے یاترا پر روانہ ہوجانا ہے ، ورنہ سارا پاپ تم ہی پر پڑے گا ۔"

یہ دھمکی کام کرگئی ، گاؤں والوں نے بات مان لی ،

آج کا دن بھر عقیدت مندوں کی قدم بوسی میں گزرا ، نذرانوں کی وہ کثرت تھی کہ راجو سنبھالتے سنبھالتے تھکی جارہی تھی ۔

خدا خدا کرکے دن ختم ہوا ، رات نے لبیرا لیا ۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ چلے گئے ، جنھوں نے شوق دیدار میں نہ جانا چاہا انھیں اصرار کرکے آنند اور رامو نے رخصت کیا ۔

جب سب لوگ چلے گئے تو مجلس مشاورت بیٹھی ۔

احمد خاں نے کہا " میرا جی چاہتا ہے خوب چیخوں ۔"

آنند نے سوال کیا ـــــ " یہ جی کیوں چاہ رہا ہے ؟"

وہ بولا " دو دن ہوگئے ، چپ روزہ رکھے ہوئے ، اگر ایک آدھ روز یہاں رہنا پڑا تو میں تو گونگا ہوجاؤں گا ! "

سب لوگ ہنسنے لگے ، رگھو نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا ۔

" ہم لوگ ہر چہار طرف سے خطرے میں گھرے ہوئے ہیں ـــــ "

راجو سہم گئی ، اس نے پوچھا :

" کیوں ؟ ـــــ خطرہ کیسا ؟"

رگھو نے جواب دیا " تو ہے اچھی خاصی پگلی ـــــ ہماری تلاش میں کنویں کھنگالے جارہے ہوں گے ، زمین آسمان ایک کردیئے گئے ہوں گے ۔ خود مہارانا کا خواب و خور حرام ہوگیا ہوگا ـــــ "

" اور ہمت رائے تو انگاروں پر لوٹ رہا ہوگا ! " راجو ہنستی ہوئی بولی ،

" ہاں ـــــ مجھے تو ہنسی کی سوجھ رہی ہے یہاں جان پر بنی ہوئی ہے ـــــ اپنے لیے نہیں ، خاں صاحب کے لیے ! "

احمد خاں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا :

" میرے بھائی گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ۔ اگر خدا کو ہمیں زندہ رکھنا ہے تو کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا ۔ اگر اس کی مرضی اپنے پاس

بلا لینے کی ہے تو کوئی روک نہیں سکتا ـــــ باقی اتنا بتا دوں کہ احمد خاں اکیلا نہیں مرے گا!"

رگھو نے ایک عزم کے ساتھ کہا "ہم سب آپ کے ساتھ جان دیں گے!"

آنند نے بھی تائید کی، کہنے لگا:

"پہلے ہم مریں گے، پھر آپ کی باری آئے گی!"

راجو نے رامو کو ٹھوکا دیا "تم کب سے منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھے ہو، کچھ تم بھی تو بولو!"

وہ کہنے لگا "میں زبان سے کچھ نہیں کہتا، لیکن وقت آیا تو دیکھ لینا رامو کیا کرتا ہے!"

"راجو بھائی کی یہ باتیں سن کر خوش ہوگئی، کہنے لگی۔

"جانتی ہوں تو کتنا جیالا اور بہادر ہے۔"

آنند نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا "کیا رگھو سے بھی؟"

رگھو نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا:

"یہ کل کا لونڈا مجھ سے کیا بازی لے جائے گا ـــ"

رامو نے کہا "کل کا لونڈا ہوں اسی لیے تو چپ ہوں ورنہ ـــ"

آنند نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا۔

"ورنہ ابھی مزا چکھا دیتے تم رگھو کو کیوں؟"

یہ سن کر رگھو کا چہرہ تمتما اٹھا۔ راجو نے بیچ بچاؤ کرتے ہوئے کہا:

"واہ یہ مذاق بھی اچھا رہا، سالے بہنوئی میں لڑائی کرائے دے رہے ہو ـــ کہاں وہ کہاں یہ!"

آنند ہنسنے لگا، اچھا اب شوہر کی خوشامد کی جا رہی ہے!"

رگھو بھی مسکرانے لگا، اس نے کہا "یہ ہنسی دل لگی کا موقع نہیں ہے!"

آنند نے ان باتوں سے عاجز اور پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"تو آخر کیا کریں؟ ـــ کہو تو ابھی چل دیں یہاں سے؟"

احمد خاں نے مداخلت کی "واہ ابھی کیسے چل سکتے ہیں۔ بھوک لگ رہی ہے، ابھی کھانا تک تو کھایا نہیں ـــ لاؤ بھئی راجو، کیا کیا ہے آج؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی "سب کچھ ہے مگر افسوس آج کسی طرح بھی مرغی کا بندوبست نہ ہو سکا۔"

احمد خاں ہنسنے لگا "نہ سہی، جو کچھ بھی ہے لاؤ۔ اب جان پر بنی ہوئی ہے۔"

راجو نے جواب دیا "ابھی لائی!"

اور پھر وہ جا کر بہت ساری مزے مزے کی چیزیں لے آئی جو گاؤں کے لوگوں نے ازراہِ عقیدت لا کر ڈھیر کر دی تھیں۔

(۴)

رات کے اندھیرے میں

کھانے کے بعد بھی بڑی دیر تک مجلس قائم رہی اور طرح طرح کی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ کافی رات تک جاگنے کے بعد یہ لوگ ایک ایک کرکے اٹھ گئے۔ رانی بھی اس گروہ میں موجود تھی،

لیکن بالکل خاموش، احمد خاں نے، رگھو نے، آنندنے، راجو اور راکو نے سبھی نے اسے شریک بزم بے تکلف کرنے کی کوشش کی، مگر وہ نہ منہ بولی، نہ سر سے کھیلی۔

جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ سونے چلے گئے اور احمد خاں بھی سونے کی تیاریاں کرنے لگا، تو اس نے دیکھا رانی سامنے کھڑی ہے۔ رانی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو اس کے دل میں ہلچل مچ گئی۔ اس نے بڑے نرم اور محبت بھرے لہجہ میں کہا:

"کیا بات ہے رانی؟"

اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا:

"اچھا ہوا تم آگئیں، میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں!"

وہ اسی طرح دہلیز میں کھڑے کھڑے بولی۔

"زہے قسمت کہ میں آپ کو یاد آئی آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے؟ فرمایئے!"

احمد خاں نے کہا "خفا ہو کچھ؟"

وہ بولی "اتنی مجال کہاں کہ آپ سے خفا ہو سکوں؟"

وہ گویا ہوا "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی اگر تم خفا ہونا چاہتی ہو تو جی بھر کر خفا ہو لو۔ میں منا لوں گا!"

ایک آہ سرد کے ساتھ وہ بولی "ہمیں سفر کرتے تین چار دن ہو گئے ہیں، اس عرصہ میں آپ کو ایک مرتبہ بھی مجھ سے باتیں کرنے کا، مجھے اپنے پاس بلانے کا — مجھے یاد کرنے کا خیال نہیں آیا؟"

وہ کہنے لگا "ایسا نہ کہو رانی۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے محبت ہے تم سے، میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میری محبت میں کھوٹ نہیں ہے۔ لیکن مجھے محبت کی باتیں کرنا نہیں آتیں۔ میں ایک سپاہی ہوں، اب تک تلوار میری محبوبہ تھی، تیر و خنجر، اور شمشیر و سناں سے کھیلا کرتا تھا۔ میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی، ارادہ بھی نہیں تھا اس جنجال میں پھنسنے کا، لیکن نہ جانے کیوں تمہیں دیکھا تو دل دھڑکنے لگا، تمہارے پاس بیٹھا تو جی چاہا، اسی طرح زندگی ختم ہو جائے، تمہاری باتیں سنیں تو دل میں آرزو مچلی کہ تم اسی طرح میرے کانوں میں امرت رس ٹپکاتی رہو، اور میں سنتا رہوں، یہاں تک کہ زندگی ختم ہو جائے" — بے ساختہ رانی کے منہ سے نکلا:

"خدا نہ کرے — ایسی باتیں نہ کیا کیجئے!"

لیکن، احمد خاں نے جیسے یہ بات سنی ہی نہیں۔ سنی تو سنی کی ان سنی کر دی۔ کہنے لگا:

"تمہیں دیکھ کر، تمہیں پاکر کس طرح کہوں کہ میرے دل کی کیا حالت ہے؟ لیکن جیسا کہ میں نے تم سے ابھی کہا، سپاہی آدمی ہوں، زندگی کا بڑا حصہ جنگ کے میدان میں گزرا ہے۔ جانتا ہی نہیں محبت کی زبان کیا ہوتی ہے، محبت کی بولی کس طرح بولی جاتی ہے ـــــ مجھے سکھا دو رانی!"

یہ باتیں کچھ اتنی سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ احمد خاں نے کہیں کہ رانی ہنس پڑی۔ اسے یقین آگیا یہ پٹھان جو کچھ کہہ رہا ہے سچ ہے، یہ سچا ہے واقعی، محبت کی زبان نہیں جانتا، لیکن محبت ضرور کرتا ہے وہ۔

"کیا آپ کا جی نہیں چاہا کہ مجھے بلائیں اور مجھ سے باتیں کریں؟"

اس نے جواب دیا "بہت چاہا لیکن دل کی بات زبان پر نہ لا سکا۔"

رانی نے سوال کیا۔

"کیوں؟"

اس نے جواب دیا "میں نے سوچا راجہ مذاق اڑائے گی، رگھو نہ جانے کیا سمجھے گا، آنند اور رامو نہ جانے کیا سوچیں؟"

قطع کلام کرتے ہوئے وہ بولی۔

"راجہ کو مذاق اڑانے کا کیا حق ہے؟ رگھو، یا آنند اور رامو کو ہمارے معاملات سے کیا سروکار ہو سکتا ہے؟"

"کچھ نہیں ـــــ پھر بھی یہ جھجک زبان تک دل کی بات نہ لا سکی!" ـــــ اور ایک بات اور بھی!"

رانی نے اشتیاق کے ساتھ دریافت کیا "وہ کیا بات تھی؟"

احمد خاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "بے شک ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں، ہزار جانوں سے

ایک دوسرے کو چاہتے ہیں ـــــ"

"ہاں ہاں، ـــــ پھر، بات تو کیجیے!"

"مگر ابھی تک ہم غیر ہیں، اجنبی ہیں، ـــــ"

رانی کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ کہنے لگی،

"ابھی تک ہم غیر ہیں؟ اجنبی ہیں؟"

یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ احمد خاں نے کہا:

"میرا مطلب غلط نہ سمجھو رانی ـــــ جب تک شرع ہمیں ایک نہ کر دے ایک دوسرے کے فدائی ہونے کے باوجود ہم غیر ہی رہیں گے!"

بات پوری طرح رانی کی سمجھ میں نہیں آئی، کہنے لگی:

"شرع؟ ـــــ شرع کیا ہوتی ہے؟ وہ کس طرح ہمیں ایک کر سکتی ہے؟"

احمد خاں نے زیر لب تبسم کے ساتھ جواب دیا۔

"جب تک مذہب ہمارے اتحاد کو قبول نہ کرے ہم غیر ہی رہیں گے!"

"اور وہ کس طرح ہمارے اتحاد کو قبول کرے گا؟ ـــــ کیا میں آپ کے سامنے مسلمان نہیں ہو چکی ہوں؟ کیا اب بھی ہمارا مذہب الگ الگ ہے؟"

احمد خاں نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا:

"نہیں، میرا مطلب نکاح سے ہے ـــــ جب تک ہماری شادی نہیں ہو جاتی اس وقت تک ہم غیر ہیں۔ اور غیر ہی رہیں گے۔ اس وقت تک ہمارا اس طرح تنہائی میں ملنا خواہ دن ہو یا رات برا ہے، گناہ ہے۔"

"گناہ کیوں ہے؟ کیا ہمارے دل پاک صاف نہیں ہیں؟"

"ضرور ہیں، لیکن ہمارے ساتھ شیطان بھی تو لگا ہوا ہے ـــــ تم اتنی دیر سے یہاں دہلیز پر کھڑی ہو میں نے تم سے نہیں کہا کہ اندر آجاؤ ـــــ کیوں نہیں کہا؟"

"آپ ہی بتایئے میں کیا جانوں ؟"

"اس لیے نہیں کہا کہ میں مرد ہوں، تم عورت ہو۔ ہر طرح کے اعتبار و اعتماد اور عزم و ارادہ کے باوجود شیطان مجھے بھی بہکا سکتا ہے اور تمہیں بھی۔"

وہ مسکراتی ہوئی بولی " شاید آپ کو بہکا سکتا ہو، مجھے نہیں بہکا سکتا، مجھے اپنے اوپر پورا اعتماد ہے ؟"

احمد خاں کچھ جھینپ سا گیا، اس نے کہا :

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن احتیاط کا تقاضا یہی ہے ــــ دعا کرو ہم جلد از جلد آگرے پہنچیں اور پھر وہاں پہنچ کر پہلی فرصت میں وہ رشتہ قائم کر لیں، جو زندگی کی آخری سانس تک منقطع نہیں ہو سکے گا۔ پھر ہماری زندگی ایک ہو جائے گی۔"

رانی نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا، لیکن دل ہی دل میں اس کا سر احمد خاں کے قدموں پر جھک گیا۔

وہ محسوس کر رہی تھی۔ یہ شخص کتنے مضبوط کردار، کتنی اونچی شخصیت اور کتنی مضبوط سیرت کا آدمی ہے۔

احمد خاں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا "کیا تم اب بھی خفا ہو مجھ سے ؟"

وہ ایک ادا سے اسے دیکھتی ہوئی گویا ہوئی۔

"میں آپ سے کبھی خفا نہیں تھی۔ میں آپ سے کبھی خفا نہیں ہو سکتی ــــ"

اور پھر ہوئے گل کی طرح جدھر سے آئی تھی اسی طرف چلی گئی۔ احمد خاں اس وقت تک ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا جب تک وہ نظر سے اوجھل نہ ہو گئی۔

---

(۵)

قافلۂ سخت جاں

آخر دو روز بسنت پور میں قیام کر کے یہ قافلۂ سخت جاں آگرے کی طرف روانہ ہوا، راستہ اطمینان سے کٹ رہا تھا۔ راستے میں جس دیہات میں گزرتا لوگوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ درشن کے لیے لگ جاتا، شہروں اور قصبات کی طرف سے عمداً یہ لوگ نہیں گزر رہے تھے کہ مبادا رانا کی سپاہ مل جائے اور گرفتار کر کے سارا کھیل بگاڑ دے۔

احمد خاں کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ کہیں اس کے آگرے پہنچنے سے پہلے بابر ہندوستان میں وارد نہ ہو جائے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے اسے بابر سے ہمدردی تھی، دلچسپی تھی۔ وہ اس کی صلاح و فلاح کا خواہاں تھا لیکن کسی قیمت پر بھی وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ ایک فاتح اور کشور کشا کی حیثیت سے ہندوستان میں وارد ہو، اور اس حکومت کو اکھاڑ دے جس کا فرماں روا، اگرچہ نالائق اور نااہل ہے لیکن جس کے خاندان نے بڑی شان و شکوہ اور جاہ و جلال کے ساتھ اس ملک پر حکومت کی ہے۔

اسے اندیشہ تھا کہیں دولت خاں بھی بابر کے ساتھ نہ مل گیا ہو، اسے یہ

فکر بھی دامنگیر تھی کہ کہیں ابراہیم لودھی نے اپنی حماقتوں سے دشمنوں کی تعداد اور زیادہ نہ بڑھالی ہو۔

وہ محسوس کرتا تھا، بابر طوفان کی طرح آئے گا اور آندھی کی طرح چلا جائے گا اس کے آنے کے بعد لودھی خاندان مٹ جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد کوئی مضبوط مسلم حکومت قائم نہیں رہ سکے گی نتیجہ یہ ہوگا کہ رانا سانگا اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائے گا۔

اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آگرے پہنچتے ہی اپنی خدمات ابراہیم کے سپرد کر دے گا۔ یہ سوچتے سوچتے دولت خاں کی تصویر اس کی چشم تصور میں ابھری اور وہ مذبذب ہونے لگا، لیکن دفعتہً دل نے صلاح دی کہ بڑے مفاد پر چھوٹے مفاد کو قربان کیا جا سکتا ہے، قوم کی خاطر، ذاتی تاثرات کی پروا نہیں کی جا سکتی۔ میرا اور دولت خاں کا سوال جو کچھ بھی ہو، اس وقت تو جو مرحلہ سامنے ہے وہ کفر اور اسلام کا ہے۔ اگر اپنے تعلقات کے پیش نظر میں دولت خاں کا ساتھ دیتا ہوں تو اپنی قوم سے غداری کرتا ہوں۔ اگر دولت خاں سے غداری کرتا ہوں تو قوم کی بگڑی ہوئی قسمت سنور جاتی ہے۔ قوم اگر مٹ گئی تو دولت خاں بھی زندہ رہ کر کیا کرے گا؟ اور اگر قوم زندہ رہی تو دولت خاں مر کر بھی زندہ رہے گا۔

اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ میں دولت خاں سے ترک تعلق کس طرح کروں گا؟ میری زبان کس طرح اس کے سامنے کھلے گی؟ کیونکر میں اس سے آنکھیں چار کر سکوں گا؟ لیکن دل نے پھر ہمت بڑھائی، اس میں ایک نیا حوصلہ پیدا ہو گیا! اس نے فیصلہ کر لیا کچھ بھی ہو مجھے ابراہیم کا ساتھ دینا ہے۔

یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے نہیں جا رہا ہوں۔ آگرہ پہنچتے ہی مجھے میدان جنگ کا رخ کرنا ہوگا۔ بابر

پوری تیاریوں کے ساتھ آیا ہوگا۔ رانا سانگا بھی اپنی فوج گراں لے کر اس کی تائید اور پشت پناہی میں وہاں موجود ہوگا، اور عین ممکن ہے کہ دولت خاں بھی اپنے ساتھیوں اور دوستوں کو لے کر بابر کا ہمرکاب ہو کر میدان میں اتر آئے۔ یہ بہت بڑی اور بہت زیادہ ہولناک جنگ ہوگی۔ یہ جنگ اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کرے گی۔ یہ جنگ مسلمانوں کی قسمت کا بھی فیصلہ کر دے گی، آیا انھیں زندہ رہنا ہے یا فنا کے گھاٹ اتر جانا ہے۔ فاتح اور کشور کشا کی حیثیت سے اپنا وجود قائم رکھنا ہے یا مفتوح کی ذلت بخش زندگی بسر کرنی ہے۔

اس جنگ میں خون کی ندیاں بہیں گی، اس جنگ میں انسانوں کے سر کٹیں گے یہ جنگ بہت سی عورتوں کو بیٹوں سے، بہت سے باپوں کو اولاد سے، بہت سی سہاگنوں کو سہاگ سے محروم کر دے گی۔

اور پھر دفعتہً اس کے دل میں خیال آیا، میرا اس جنگ میں کیا حشر ہوگا؟
کیا میں نہیں شہید ہو سکتا؟
کیا میرے جسم و جاں کا رشتہ منقطع نہیں ہو سکتا؟
کیوں نہیں ہو سکتا؟

پھر ایک سادہ لوح اور بھولی بھالی لڑکی کو میں فریب کیوں دے رہا ہوں؟ اس کے دل میں اپنی محبت پیدا کر کے اور اپنے دل میں اس کی چاہت کا قصر بلند تعمیر کر کے کیا میں اس کے ساتھ ظلم نہیں کر رہا ہوں؟

اگر میں اس جنگ میں کام آ گیا تو وہ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی؟ اس کی قوم اسے قبول نہیں کر سکتی۔ اس کے خاندان میں بھی اب اس کی جگہ نہیں ہے، اس دنیا میں اب میرے سوا کوئی اس کا نہیں ہے۔ کیا میں اسے گوارا کر لوں کہ اسے زمانے کے ستم سہنے کے لیے چھوڑ جاؤں؟ کیا میرے بعد، ایک مرتبہ پھر بہت رائے کا

دست ستم اس کے جسم نازنین تک نہیں پہنچ جائے گا ؟

پھر ؟

پھر مجھے کیا کرنا چاہیے ؟

ابھی موقع ہے، کیا راستہ بدل دوں ؟

کیا آگرے کے علاوہ کسی اور شہر میں جہاں ابراہیم لودھی کا سکہ چل رہا ہو، جاکر خانہ نشین ہو جاؤں ؟ اور رانی کے ساتھ سکون، راحت اور آسائش کی زندگی بسر کروں ؟

دولت خاں مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ابراہیم کو مجھ سے کوئی پرخاش نہیں۔ بابر مجھے جانتا بھی نہیں، رانا سانگا اور مہت رائے وہاں پہنچنے کے بعد میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے، کیا میں ٹھاٹھ اور آرام کی زندگی بسر کر سکتا ہوں ؟

کیا ایسا کروں ؟

ایک لمحہ کے لیے اس کے دل میں خیال آیا کہ واقعی یہی کرنا چاہیے۔

لیکن دفعتہً پھر اس کی قومی غیرت اور ملی حمیت ابھری، اور اس نے سوچا اگر ملت اسلامیہ کے عروج و فروغ، مسلم قوم کی زندگی اور وقار، حکومت اسلامیہ کے قیام و استحکام کے لیے، میں دولت خاں جیسی ہستی کو چھوڑ سکتا ہوں، تو کیا اپنے آپ کو، اپنے جذبات کو، اپنی محبت کو قربان نہیں کر سکتا ؟

پھر ؟ —— پھر مجھے کیا کرنا چاہیے ؟

کیا رانی سے کہہ دوں کہ وہ مجھے بھول جائے، فراموش کر دے یہ ایک بات تو ہے شک یہ کٹھن کام ہے لیکن اسے کرنا ہی پڑے گا۔

---

(۶)

درخت کی چھاؤں میں

ساری رات اسی بے کلی اور اضطراب میں کروٹیں بدلتے گزری، ایک پل کے لیے بھی آنکھ نہیں جھپکی، ایک لمحہ کے لیے بھی نیند نہیں آئی۔

اس نے اپنی زندگی کا سب سے اہم اور عظیم فیصلہ کر لیا تھا۔

یہ ایسا فیصلہ اس نے کیا تھا جس کی خود اسے اپنے آپ سے توقع نہیں تھی۔

صبح ہوئی، رگھو، آنند، رامو اور راجو، اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے تو وہاں سادھو کے روپ میں چپ چاپ، خاموش، سب سے الگ تھلگ ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔

کسی کام سے رانی ادھر سے گزری۔ اس نے احمد خاں کی صورت دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا، معاملہ کچھ دگرگوں ہے!

بے شک احمد خاں جس طرح خوش خوش، ہشاش بشاش اور سراپا سرور و نشاط نظر آ رہا تھا، آج کی کیفیت بالکل بدلی ہوئی ہے۔ اس کے چہرے پر افسردگی، ملال اور پریشانی کے آثار طاری ہیں ؟ —— کیا بات ہے ؟ — جاؤں پوچھوں ؟ لیکن وہ خفا نہ ہو جائیں !

برا نہ مانیں ؟

کچھ بھی ہو مجھے جاننا چاہیے۔ اگر وہ غمگین ہیں، تو میں ان کی شریکِ غم بن جاؤں گی۔

یہ سوچ کر وہ آئی اور خاموشی کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

احمد خاں نے نظر اٹھا کر رانی کو دیکھا، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

رات کو جو فیصلہ اس نے کیا تھا وہ اب کمزور ہوتا نظر آنے لگا۔

اس نے چاہا کہ رانی کو اپنے پاس بٹھا کر اپنے اضطراب کی ساری داستان بیان کردے، اپنا فیصلہ بھی سنا دے، لیکن ایسا کرنے کی ہمت غائب ہوچکی تھی۔

مگر رانی نے خود ہی یہ مشکل آسان کردی۔ اس نے پوچھا۔

"آپ چپ چاپ کیوں ہیں؟"

احمد خاں نے ہمت کرکے حوصلہ پیدا کرتے ہوئے کہا:

"رانی میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ کیا تم اسے قبول کرلوگی؟"

رانی پریشان ہوگئی!

وہ سوچنے لگی ایسا کونسا فیصلہ ہوسکتا ہے جس کے لیے التجا کا رنگ اختیار کیا جارہا ہے جسے سناتے وقت روح نکل جارہی ہے؟

ضرور کوئی خاص بات ہے؟

لیکن جو کچھ بھی ہو مجھے سننا چاہیے۔

اس نے انتہائی متانت کے ساتھ جواب دیا۔

"آپ کا جو فیصلہ ہوگا مجھے منظور ہے ـــــ کہیے۔"

احمد خاں سے کچھ نہ کہا گیا۔ وہ خاموش ہوگیا اس نے سر جھکا لیا۔ اس کی قوتِ گویائی سلب ہوگئی۔ وہ دوبارہ رانی سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔

رانی نے اس کیفیت کو محسوس کرلیا۔ اس کی پریشانی کچھ اور بڑھ گئی، لیکن حوصلے سے کام لیتے ہوئے اس نے کہا:

"آپ خاموش کیوں ہوگئے؟"

احمد خاں نے سوال کیا "خفا تو نہیں ہوجاؤگی رانی؟"

وہ بولی "آپ سے بھی خفا ہوسکتی ہوں، یہ بات آج تک تو سوچ نہیں سکی۔"

احمد خاں پر گھڑوں پانی پڑگیا۔ وہ پتھر کا دل کہاں سے لائے جو اس کے سامنے اس خوفناک فیصلہ کو بیان کرسکے۔

اسے خاموش دیکھ کر رانی نے پھر پہل کی، کہنے لگی:

"کچھ کہیے تو سہی ـــ یقین کیجیے کوئی فیصلہ بھی ہو مجھے دل و جان سے منظور ہے۔"

احمد خاں نے رکتے رکتے اپنا فیصلہ سنا دیا، اپنے اضطراب اور کشمکش کی ساری داستان سنا دی!

رانی بڑے غور اور توجہ سے اس کی داستان سنتی رہی، کبھی اس کا رنگ بدل جاتا کبھی اس پر یاس کی کیفیت طاری ہوجاتی، کبھی نشاط و مسرت کی۔

احمد خاں جب اپنی داستان ختم کرچکا تو وہ مسکراتی ہوئی بولی:

"بس یہی بات تھی جس نے آپ کو پریشان کر رکھا تھا؟"

احمد خاں کے دل کو ایک جھٹکا سا لگا، وہ جس طرح دیوانہ وار اسے چاہتا تھا اور خود رانی جس مجنونانہ طریقہ پر اس سے محبت کرتی تھی اس کی بنا پر اسے یقین تھا کہ فیصلہ سن کر وہ رونے لگے گی، بے ہوش ہوجائے گی، ہوش و حواس کھو بیٹھے گی اسے سنبھالنا مشکل ہوجائے گا، لیکن جب استقلال، اطمینان اور کسی حد تک مسرت سے اس نے یہ فیصلہ سنا اس سے وہ سخت متحیر ہوا، آخر نہ رہا گیا، کہنے لگا:

"کیا میرے اس فیصلہ سے تم خوش ہو رانی؟"

وہ بولی "شاید آپ میری مسکراہٹ پر طنز کر رہے ہیں؟"

اور قبل اس کے کہ احمد خاں کوئی جواب دے، وہ خود ہی بول اٹھی:

"آپ میرے ہو چکے، میں آپ کی ہو چکی، پھر اب زندگی بھر جدائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کسی طرح۔"

احمد خاں کو وہ ساری عمارت ڈولتی ہوئی نظر آئی جو اس نے عالم خیال میں تعمیر کی تھی۔ رانی نے کہا:

"ہم دونوں ایک ساتھ جئیں گے، ایک ساتھ مریں گے۔"

احمد خاں نے سراپا حیرت بن کر پوچھا:

"اس کا کیا مطلب؟ جینے کی حد تک تو خیر ٹھیک ہے۔ لیکن مرنا کیسے ساتھ ہو سکتا ہے؟"

اس نے ایک جاں نواز تبسم کے ساتھ جواب دیا،

"تھوڑے بہت فنون سپہ گری مجھے بھی آتے ہیں، یقین نہ ہو تو میدان جنگ میں دیکھ لیجئے گا۔ میں وہاں بھی سایہ کی طرح آپ کے ساتھ رہوں گی اور جو سر آپ کا ہوگا، وہی میرا ہوگا۔"

احمد خاں حیرت سے اسے دیکھنے لگا وہ بولی:

"لیکن اب ایک فیصلہ آپ کو میرا ماننا پڑے گا۔"

احمد خاں نے پوچھا "کون سا فیصلہ منوانا چاہتی ہو؟"

وہ بولی "اب یہ سادھو مہاراج کا ڈھونگ ختم کیجئے۔ رگھو کہہ رہا تھا کہ شام تک ہم آگرہ پہنچ جائیں گے، وہاں جا کر سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہئے، کہ آپ میرے ساتھ بسے، میری رفاقت سے، میرے پاس بیٹھنے سے، مجھے اپنے پاس بٹھانے سے جھجکنا چھوڑ دیں، تاکہ میں مذہبی نقطۂ نظر سے بھی آپ کی رفیقہ حیات

صحیح معنی میں بن جاؤں ——

اتنے میں رگھو گھبرایا ہوا آیا،

"ہٹ جائیے کچھ سپاہی ادھر آ رہے ہیں۔"

(۷)

دشمن کے سپاہی

احمد خاں نے بغیر کسی ہراس اور تشویش کے رگھو نندن کو جواب دیا۔
"ڈرنے کی کیا بات ہے ؟ اگر کچھ سوار اس طرف آرہے ہیں تو آنے دو، ہمارا کیا کرلیں گے ؟"
رانی بول پڑی" اگر انھوں نے پہچان لیا تو ؟"
احمد خاں نے جواب دیا" نہیں پہچانیں گے ـــــ اور اگر پہچان بھی لیا تو تلوار کا جواب تلوار سے دیا جائے گا !"
یہ باتیں ہورہی تھیں کہ ۲۴ سواروں کا ایک جتھا، جسے رگھو نندن نے آتے ہوئے دیکھا تھا بالکل قریب آگیا، یہ سوار رانا سانگا کی فوج کے سپاہی تھے۔ ان میں کئی ایسے لوگ تھے جنھیں رگھو اور آنند ذاتی طور پر جانتے تھے لیکن ان لوگوں نے اس کمال اور خوبی کے ساتھ بہروپ بھرا تھا کہ کوئی کسی کو نہیں پہچان سکا۔
ایک سوار آگے بڑھا اس نے رگھو نندن سے کہا :
"کیوں سادھو مہاراج کیا آپ نے کسی مسلمان کو چند مرد عورت ساتھیوں کے ساتھ ادھر سے جاتے دیکھا ؟"

رگھو نندن نے جواب دیا :
"نہیں ـــ ہم کسی کو نہیں دیکھتے۔ ہم دھیان گیان میں معروف رہنے والے لوگ کیا جانیں کون کدھر جارہا ہے ـــ"
اس سپاہی نے احمد خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،
"یہ سادھو مہاراج کون ہیں ؟"
رگھو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،
"ارے تم انھیں نہیں جانتے ؟ ان کا نام سادھو مرادی داس ہے ، یہ تپیا کرتے ہوئے متھرا جی جارہے ہیں "
آنند نے سپاہی کو مخاطب کرکے کہا :
"بھائی ہماری مانو تو یہ سپاہی کا پیشہ چھوڑو، سنیاس لو اور ہمارے ساتھ متھرا جی چلو !"
رامو نے بھی خاموش رہنا مناسب نہ سمجھا، کہنے لگا :
"سوچو تو کبھی یہ زندگی کے دن کی ہے ؟ چند دن کی زندگی کے لیے دنیا کے پیچھے پڑنا اپنے جیسے آدمیوں کو قتل کرنا، غریبوں، بے بسوں اور بے کسوں پر ظلم کرنا کہاں کی دانائی ہے ؟"
سپاہی پر ان باتوں کا اثر ہوا۔ اس نے کچھ ندامت، کچھ حسرت کے ساتھ کہا :
"جی تو یہی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سنیاس لے لوں ، واقعی کیا دھرا ہے اس زندگی میں ، اس میں پاپ، ظلم ، ناانصافی اور قتل و غارت کے سوا کچھ نہیں ـــ"
آنند نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے پوچھا ،
"لیکن کیا میرے بھائی ؟"

"وہ بولا" لیکن سوچتا ہوں پھر میرے بال بچے کیا کریں گے؟ کہاں سے کھائیں گے؟"
بڑے سادھو یعنی احمد خاں نے پرجلال نظروں سے اسے دیکھا اور گرج کر کہا
"جب تو مر جائے گا تب کہاں سے کھائیں گے؟ اگر تو ابھی مر جائے تب
انھیں کون دے گا کھانے کو؟ —— تو بھگوان پر بھروسہ نہیں کرتا۔ اپنے آپ پر
کرتا ہے؟ اپنے مہارانا پر کرتا ہے۔ اپنے امیروں اور سرداروں پر کرتا ہے؟
—— تو نہیں جانتا یہ سب فانی ہیں، ان کا دبدبہ، ان کا وقار، ان کا اقتدار
ان کا اختیار کوئی چیز بھی باقی رہنے والی نہیں!"
بڑے سادھو کی یہ تقریر سپاہی عقیدت کے کانوں سے سن رہا تھا یکایک
اس کے کان میں آواز آئی:
"کیا تو نے امیروں کو فقیر ہوتے نہیں دیکھا؟ کیا بادشاہوں کے تاج چھنتے
نہیں دیکھے؟ کیا تیری نظر سے راجاؤں کے تخت چھننے نہیں گزرے؟ کیا تو نے
نہیں دیکھا کہ جو اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ جسے چاہیں تباہ و برباد کر دیں، جن کے
ایک اشارہ پر لوگوں کی گردنیں کٹ جاتی ہیں۔ ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ ان
کی گردن بھی کاٹ لی جاتی ہے ——"
سپاہی سہم گیا، اس نے عقیدت اور دہشت کی نظر سے بڑے سادھو کو
دیکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا:
"دیکھا ہے سادھو مہاراج دیکھا ہے —— ابھی چند دن ہوئے دیکھا ہے۔"
رگھو نندن کا جذبۂ تجسس اس جواب سے بڑھ گیا۔ اس نے محسوس کیا ضرور یہ
کوئی تازہ حادثہ رونما ہوا ہے جس کی طرف یہ اشارہ کر رہا ہے، اس سے سوال کیا:
"کیا دیکھا ہے تم نے؟"
وہ بولا "بھلا ہمت رائے سے بڑا کون آدمی تھا جس کی چاہے عزت لے لے،

جس کا چاہے گھر لوٹ لے، جسے چاہے تباہ و برباد کر دے، جس سے خفا ہو اسے
آن کی آن میں قتل کر دے، خود مہارانا تک اس سے ڈرتے تھے مگر ——"
بے ساختہ آنند نے سوال کیا:
"مگر کیا ہوا ہمت رائے کو؟ کچھ بتاؤ تو سہی؟"
وہ کہنے لگا "قتل کر دیا گیا۔"
ہمت رائے کے قتل کی خبر سن کر احمد خاں، راجو، رامو، رانی، آنند، اور رگھو
سب پر سناٹا چھا گیا۔
ایسی ان ہونی بات بھی ہو سکتی ہے؟ یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔
لیکن ساتھ ہی ساتھ کرید بھی پیدا ہوئی کہ اتنا بڑا، اور با اثر شخص آن کی آن
میں کس طرح قتل کر دیا گیا؟ رگھو نے پوچھا:
"لیکن کس نے قتل کیا اسے؟ —— کیا کسی دشمن نے؟"
وہ بولا "نہیں —— اس کے سب سے بڑے دوست رانا سانگا نے!"
یہ سن کر ایک مرتبہ پھر سب پر سناٹا سا طاری ہو گیا۔ آنند نے دریافت کیا:
"لیکن اس کا جرم؟ —— کیا خطا تھی اس کی؟"
سپاہی نے بتایا "یوں تو بڑا پاپی تھا لیکن قتل بے خطا کیا گیا، کوئی غلطی نہیں تھی
اس کی!"
رگھو نے پوچھا "تو کیا مہارانا نے مذاق مذاق میں اس کی جان لے لی؟"
سپاہی نے جواب دیا "یہ بات بھی نہیں ہے۔"
اس طرح چبا چبا کر اس کا باتیں کرنا رگھو نندن کو ناگوار گزرا اس نے ذرا ڈپٹتے
ہوئے کہا:
"تو آخر کیا بات ہوئی تھی؟ کچھ منہ سے پھوٹو تو سہی!"

وہ کہنے لگا "بات صرف یہ تھی کہ مہارانا نے ایک مسلمان کو قلعہ میں قید کر دیا تھا
وہ سازش کر کے اور اپنے ساتھ راج کے چند آدمیوں کو لے کر بھاگ گیا۔ یہ قلعہ
اور یہاں کے قیدی اور یہاں سرکاری ڈیوٹی دینے والے سپاہی سب ... کی نگرانی میں تھے۔ مہارانا نے کہا یہ حادثہ تمہاری غفلت سے ہوا ہے، لہٰذا قتل
کر دیا بیچارے کو!"

آنند نے طنز کیا "ابھی پاپی کہہ رہے تھے ابھی بے چارہ کہنے لگے!"

وہ بولا "تھا تو بے شک وہ بہت بڑا پاپی لیکن قیدی کو اس نے تو نہیں بھگایا تھا!"

رگھو نے عارفانہ انداز میں آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"بھگوان کے کام بھگوان ہی جانیں کیا جانے کس پاپ کا پھل اسے اس طرح ملا"

آنند نے دریافت کیا "تو وہ مسلمان پکڑا نہیں گیا؟"

سپاہی نے کہا "نہیں کئی دن سے ہم اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔"

آنند نے جنوب کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا،

"ناک کی سیدھ پر چلے جاؤ، بھگوان کی کرپا ہوگی تو مل جائیں گے وہ بھگوڑے"

سپاہی نے بڑے خوشامدانہ لہجہ میں پوچھا۔

"کیا وہ مل جائیں گے؟ — مل جائیں تو بیڑا پار ہو جائے گا ہمارا۔ مہارانا نے
بہت بڑا انعام دینے کا وعدہ کیا ہے — ذرا بڑے سادھو مہاراج سے پوچھئے
ہمیں کس طرف جانا چاہیے؟"

بڑے سادھو نے سوال کا انتظار کئے بغیر انگلی شمال کی طرف اٹھا دی

پھر سپاہی نے کوئی سوال نہیں کیا، اپنے ساتھیوں سے کہا:

"دوستو، قسمت زوروں پر ہے چلو۔ جدھر بڑے سادھو جی مہاراج نے اشارہ
کیا اسی طرف گھوڑوں کو سرپٹ بھگاتے چلے چلو ضرور دشمن ہمارے ہاتھ آ جائے گا۔ مہاراج

مہاراج کا اشارہ بے معنی نہیں ہو سکتا —"

ساتھیوں نے کچھ کہے بغیر شمال کی طرف باگیں موڑ دیں اپنے صبا رفتار گھوڑوں کی،
... کے جانے کے بعد، رگھو، آنند اور رامو وغیرہ پر تو جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا
... تھے ہنستے ہنستے!

(۸)

نہ ٹوٹنے والا رشتہ

یہ قافلہ اسی طرح خطروں سے بچتا، اپنی حفاظت کرتا منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا رہا۔ راستے میں کئی مرتبہ خطرے پیش آئے۔ اندیشہ پیدا ہوا کہ اب بس پکڑے گئے اور شامت آگئی، لیکن ہر مرتبہ بگڑی ہوئی بات بن گئی۔

اب چلتے چلتے کئی دن ہو چکے تھے۔ ایک روز ایک جنگل کے قریب اس قافلے نے پڑاؤ ڈالا۔ سب لوگ بہت خوش تھے۔ اب آگرہ کی مسافت بس ایک منزل رہ گئی تھی۔ خیال تھا رات یہاں گزاریں گے اور صبح ہوتے ہی کوچ کر دیں گے، اور دوسرے دن غروبِ آفتاب کے وقت آگرے میں ہوں گے۔

راجو کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ رگھو آنند اور راموپھل پھلواری کی تلاش میں جنگل کے اندر گھسے ہوئے تھے۔ رانی آئی، اور احمد خاں کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے کہا:

"کل ہم آگرے پہنچ جائیں گے؟ —"

وہ بولا "ہاں رانی پہنچ جائیں گے۔ کل سے ہماری زندگی کا نیا دور شروع ہوگا۔ احمد خاں، اور رانی دو جدا وجود ہیں، کل سے ایک ہو جائیں گے!"

یہ الفاظ سن کر رانی پر سرور و نشاط کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے کہا:

"لیکن دیکھنا چاہیے۔ کل کب آتا ہے؟"

احمد خاں ہنسنے لگا، اس نے کہا "کیا تمہیں شبہ ہے کہ کل نہیں آئے گا؟ — نہیں رانی اس طرح نہ سوچو۔ کل ضرور آئے گا، اور ہم دونوں ضرور نہ ٹوٹنے والے رشتہ میں منسلک ہو جائیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ موت ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دے، لیکن اس کے علاوہ کوئی اور طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی!"

رانی نے عزم اور استقلال کے ساتھ کہا:

"یہی میرا عقیدہ بھی ہے! — لیکن سوچتی ہوں کہ آپ، لڑائی کے لیے پر تول رہے ہیں۔"

احمد خاں نے نظر اٹھا کر رانی کی طرف دیکھا اور پوچھا:

"پھر —؟"

وہ بولی "میں اس سے نہیں ڈرتی کہ آپ جنگ کے میدان میں کودنے والے ہیں، یہ تو سپاہی کا جوہر ہے۔ آپ اتنے بہادر نہ ہوتے تو شاید مجھے اتنی محبت بھی نہ ہوتی۔ آپ سے سب سے پہلے آپ کی جو چیز میرے دل پر نقش ہوئی تھی وہ آپ کی بہادری ہی تو تھی۔ لیکن —"

رانی چپ ہو گئی، احمد خاں نے سوال کیا "لیکن آگے؟"

وہ ذرا رکتی رکتی گویا ہوئی،

"لیکن یہ کہ آپ ضرورت سے زیادہ بہادر ہیں، آپ خطروں کو دعوت دیتے ہیں۔ آپ موت کو کھیل سمجھتے ہیں — اتنا زیادہ بہادر ہونا بھی تو خطرناک ہے!"

احمد خاں نے محبت بھری نظروں سے رانی کو دیکھا اور کہا

"اتنی زیادہ بدگمان بھی نہ بنو، — مجھے مرنے کا شوق نہیں ہے لیکن موت سامنے آ جائے تو بھاگ بھی نہیں سکتا!"

رانی نے فخر کی نظروں سے اسے دیکھا اور ایک ادائے جاں نثاں کے ساتھ بولی:

" تو میں کب کہتی ہوں کہ آپ کسی موقعہ پر کمزوری دکھائیں ، میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ ہاتھ پاؤں بچا کر لڑیئے ۔"

وہ بولا " لڑنے والے اسی طرح لڑتے ہیں ، اگر ہاتھ پاؤں بچا کر لڑیں ... تو دشمن کو ہرا نہیں سکتے ۔ بڑی آسانی سے مغلوب ہو جائیں گے اور مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں کبھی کسی دشمن سے مغلوب ہوا ہوں ، کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ہاتھ پاؤں بچا کر لڑتا ہوں ۔ — بتاؤ اب مطمئن ہوئیں ؟ "

وہ تبسم کی بجلیاں گراتی ہوئی بولی " نہیں — !

احمد خاں نے متحیر ہو کر اسے دیکھا اور پوچھا :

" کیوں ؟ کیا کسر رہ گئی ہے اب تمہارے مطمئن ہونے میں ؟ "

" وہ گویا ہوئی " میری شرط مان لیجئے ، تو بے شک مطمئن ہو جاؤں گی ! "

احمد خاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا " شرط ؟ مجھے تو تمہاری کوئی شرط یاد نہیں آتی ، گو مجھے اس کے ماننے سے انکار بھی نہیں ہو سکتا ! "

رانی خوش ہو گئی اس نے نازو انداز کے ساتھ کہا :

" دیکھیئے پھر نہ جائیے گا اس قول سے ! "

احمد خاں نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے جواب دیا ،

" ایسا کبھی نہیں ہو سکتا — قول مرداں جان دارد "

رانی نے کہا " میری شرط یہ ہے کہ جنگ کے ہر مرحلہ پر میں آپکے ساتھ رہوں گی — مردانہ لباس میں ۔ دیکھیے وعدہ کر چکے ہیں پھر نہ جائیے گا اپنے قول سے ورنہ روٹھ جاؤں گی ۔"

احمد خاں نے سپر ڈال دی " اچھا بھئی یہی سہی ہر حال میں تمہیں خوش رکھنا ہے ! "

رانی نے چاہا کہ شکریہ ادا کرے اتنے میں رامو ، آنند اور رگھوبہت سے جنگل پھل اور میوے جھولی میں بھرے ہوئے آگئے ، اور لا کر سامنے ڈھیر کر دیئے ، کھانا بھی تیار ہو چکا تھا ، راجو نے سب کے سامنے الگ الگ بھوجن بھی کیلے کے پتوں پر پروس دیا ۔

ابراہیم لودھی کا دربار

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

(۱)

گلستاں

آگرہ آگیا!

احمد خاں سب سے پہلے اپنے گھر پہنچا جس کا نام اس نے گلستاں رکھا تھا۔ یہ ایک وسیع اور فراخ مکان تھا، سنگ سرخ کا بنا ہوا، حد درجہ مضبوط اور خوشنما۔

احمد خاں کا شمار شہر کے امرا اور معززین میں ہوتا تھا، اس کی جاگیر کی آمدنی کسی طرح ایک لاکھ روپے سالانہ سے کم نہ تھی، ماں باپ مرچکے تھے، بھائی بہن کوئی زندہ نہ تھا وہی تن تنہا اس جائداد اور جاگیر کا مالک تھا۔ آباؤ اجداد کے وقت سے جو قیمتی اور گراں چیزیں اس گھر میں جمع ہوتی چلی آرہی تھیں انھوں نے اسے اچھا خاصا میوزیم بنا دیا تھا۔ حکومت کی طرف سے اسے جو جاگیر ملی تھی اس کی شرط یہ تھی کہ ایک ہزار سوار ہر وقت اس کی فہرست میں درج رہیں گے، جن کے مصارف کا وہ کفیل ہوگا اور جب کبھی حکومت کو ضرورت ہوگی ان ایک ہزار سواروں کے ساتھ وہ میدان جنگ میں حکومت کی امداد اور پشت پناہی کے لیے پہنچے گا۔

یہ سپاہی اپنے اپنے مقامات پر رہتے تھے۔ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ انھیں ماہانہ وظیفہ احمد خاں کی طرف سے ملتا رہتا تھا۔ ان کا فرض تھا کہ جب طلب کیے جائیں، سارے کام چھوڑ کر فوراً کیل کانٹے سے لیس ہو کر ساز و سامانِ جنگ کے ساتھ اپنے آقا کی خدمت میں آموجود ہوں اور اس کی رفاقت میں جان کی بازی لگا دیں۔ ایسے موقعوں پر ان کی تنخواہ بڑھ جاتی تھی اور انعام و اکرام سے یہ نوازے جاتے تھے۔

احمد خاں والدین اور بھائی بہن کی نعمت سے محروم تھا لیکن اس کی ایک خالہ تھیں، یہ اسے بہت زیادہ چاہتی تھیں۔ بیوہ تھیں اور لاولد بھی، لہٰذا اس کا سارا انتظام اور کاروبار انھی کے ہاتھ میں تھا۔ شوہر نے جو جائداد چھوڑی تھی وہ بھی اب احمد خاں ہی کے لیے خالہ نے وقف کر دی تھی۔

لہٰذا جہاں تک مال و دولت اور عزت و وقعت کا تعلق تھا وہ ہر طرح سے مطمئن تھا۔

یہ خالہ صاحبہ اکثر اس سے کہا کرتی تھیں،

"بیٹا شادی کر لے جب تک چاند سی بہو اس گھر میں نہیں آجاتی، یہ ویران رہے گا۔"

اور احمد خاں مسکرا کر جواب دیتا "خالہ جان ایسی کیا جلدی ہے شادی کی، ہو جائے گی کبھی، ابھی تو میں جوان ہوں، کچھ بوڑھا تو نہیں ہوا جاتا۔"

وہ کہتیں "لیکن میں تو بوڑھی ہو گئی ہوں۔ آج مری، کل دوسرا دن، کیا میری یہ آخری خواہش تو پوری نہیں کرے گا؟"

احمد خاں لاجواب ہو جاتا اور کہتا "اچھا چند دن ٹھہر جاؤ!"

خالہ جان اس وعدے سے مطمئن ہو جاتیں اور مختلف اشراف گھرانوں میں

چاند سی بہو کی تلاش جاری رکھتیں۔ انھوں نے کئی مرتبہ چاند سی بہو تلاش کی، مگر بیٹوں نے کوئی نہ کوئی اڑنگا لگا دیا اور بات آگے نہ بڑھ سکی۔

آج جب وہ اتنے دنوں کی پراسرار غیر حاضری کے بعد آیا تو اس کے ساتھ کچھ اجنبی لوگ بھی تھے۔

اور — اور ایک اجنبی عورت بھی!

یہ اجنبی عورت اپنی وضع قطع کے لحاظ سے غیر مسلم تھی، خالہ جان اسے دیکھ کر اس اعتبار سے خوش ہوئیں کہ خوبصورت اور حسین عورت ہے، لیکن اس بات پر کچھ بھی تھیں کہ یہ کہاں سے ٹپک پڑی؟

بہر حال جہاں تک اخلاق اور جذبۂ مہمان داری کا تعلق تھا انھوں نے رانی کی خاطر داری میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اچھے سے اچھا کھلایا، اچھے سے اچھا پہنایا۔ دل جوئی کی باتیں کیں، بہت کچھ پوچھا۔ اور رانی نے ہر سوال کا جواب دیا، لیکن اس سے وہ حقیقت اگلوانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

دو تین دن اسی طرح گزر گئے۔

احمد خاں اس عرصہ میں اتنا مصروف تھا کہ ایک پل کے لیے بھی اطمینان سے گھر پہ بیٹھ سکا۔ کبھی وقت ذرا دیر کے لیے اندر آتا، کھڑے کھڑے کچھ دیر رانی سے باتیں کرتا، کچھ دیر خالہ جان کی باتیں سنتا اور واپس چلا جاتا۔

خالہ جان اس ٹوہ میں تھیں کہ رانی کے راز کو حل کریں۔ اب انھیں دال میں کالا کالا نظر آنے لگا تھا، لیکن کوشش بسیار کے باوجود موقعہ نہ نکال سکیں کہ کچھ دریافت کر سکتیں۔

ایک روز احمد خاں نے خالہ جان سے کہا:

"آج کھانا میں آپ کے ساتھ کھاؤں گا رات کو۔"

خالہ جان کی باچھیں کھل گئیں، انھوں نے چٹ چٹ بلائیں لیں اپنے نورِ نظر اور لختِ جگر کی پھر کہا:

"بیٹے میں تو تیری صورت دیکھنے کو ترس گئی ہوں ـــــ اتنے دن تک نہ جانے تو کہاں غائب رہا، اب آیا ہے، تو بھی گھر میں چین نہیں لگتا۔ نہ جانے کہاں کہاں گھوما پھرا کرتا ہے، مجھے تجھ سے کچھ ضروری باتیں بھی کرنا ہیں۔

---

(۲)

انتخاب اور فیصلہ

حسب وعدہ احمد خاں شام کو جلدی سے گھر میں آگیا۔ یوں تو ویسے بھی ہر روز گھر میں طرح طرح کے کھانے پکا کرتے تھے، مگر آج خالہ جان نے خاص طور پر توجہ کی تھی۔ اور کئی چیزیں اپنے ہاتھ سے بنائی تھیں۔

احمد خاں جب دسترخوان پر بیٹھا تو بغیر کسی تمہید کے خالہ جان نے کہا:

"کب تک تو مجھے بے وقوف بناتا رہے گا؟"

احمد خاں نے ہنستے ہوئے کہا

"خالہ جان آپ کیوں میرا دل دکھاتی ہیں ـــــ بھلا میں آپ کے ساتھ کی گستاخی کرسکتا ہوں کہ آپ کو بے وقوف بنانے کی جرأت کروں؟"

خالہ جان نے اس کے وعدے یاد دلاتے ہوئے کہا:

"کتنے دنوں سے تو شادی کا وعدہ کر رہا ہے، مگر اب تک تیرا کل آج سے نہیں ـــــ دیکھ لینا اسی حسرت میں یہی آرزو لے کر میں قبر کے گوشہ میں پہنچ جاؤں گی"

احمد خاں نے سوال کیا "آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟"

وہ بولیں "میں چاہتی ہوں تو شادی کرلے، چاند سی بہو آجائے اس گھر میں

بوڑھی ہوگئی اب مجھ میں نہ دم ہے نہ سکت ماشاءاللہ اتنا بڑا گھر چلانا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ بہو آجائے گی تو میں چین کروں گی، آرام کروں گی، خدا کی یاد میں وقت صرف کروں گی۔ خدا نے توفیق دی تو حج کو بھی چلی جاؤں گی اور جو وہ ذمہ داریاں جو اس وقت میں انجام دے رہی ہوں سنبھال لے گی — کیا تجھے مجھ پر رحم نہیں آتا ؟"

یہ کہتے کہتے خالاجان کی آواز بھرا گئی۔ احمد خاں نے کہا :

" مجھے تمہارا ہر حکم منظور ہے ؟"

وہ خوش ہوگئیں، وفورِ نشاط و مسرت سے بے خود ہوکر سوال کیا :

" کیا تو شادی پر تیار ہے ؟

احمد خاں نے بہت مختصر سا جواب دیا، ہاں تیار ہوں، جب چاہو !"

قریب تھا کہ خالاجان شادیٔ مرگ میں مبتلا ہو جاتیں۔ انھیں اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ انھوں نے ایک مرتبہ پھر پوچھا :

" کیا تو سچ کہتا ہے ؟ مجھے ٹال تو نہیں رہا ہے ؟ پھر تو نہ جائے گا اپنے قول سے ؟"

احمد خاں نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا :

" ہرگز نہیں — قول مرداں جان دارد، خالاجان سچ مچ میں نے جلد از جلد شادی کا فیصلہ کرلیا ہے، تم تاریخ مقرر کردو۔"

خالہ جان نے مسکراتے ہوئے پوچھا " تو پھر نواب اشرف الدولہ سے ہاں کروں ؟"

احمد خاں نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا " ان سے کس بات میں ہاں کرنا ہے ؟"

وہ بولیں " میں نے ان کی لڑکی پسند کی ہے، سچ کہتی ہوں، چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ ایسی خوب سیرت اور خوب صورت لڑکی آج تک میری نظر سے نہیں گزری وہ آجائے گی تو اس ویرانے میں بہار آجائے گی۔ یہ کاشانہ منور ہو جائے گا !"

احمد خاں ہنسنے لگا، اس نے کہا " خالہ جان ایسے کیوں بھولتی ہو کہ نواب اشرف الدولہ نواب تو ضرور ہیں لیکن طبیعت کے نہایت پست، حد درجہ کنجوس، انتہا درجے کے ظالم، بھلا ایسے شخص کی لڑکی مجھے خوش رکھ سکتی ہے ؟"

خالاجان کی ساری خوشی کافور ہوگئی، انھوں نے سوچا لڑکا پھر ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے، کہنے لگیں۔

" تیری نظر میں تو ہر شخص عیبی ہے، نہ نواب اشرف الدولہ اچھے ہیں، نہ ان کی لڑکی، تو پھر کہاں ارادہ ہے شادی کا ؟ — کہہ دے، کہیں نہیں —"

احمد خاں پھر ہنسنے لگا، اس نے کہا :

" خالاجان مجھے جھوٹ بولنے کا مشورہ کیوں دے رہی ہو ؟ — یہ کیسے کہہ دوں جب کہ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ کل میری شادی ہو جانی چاہیے !"

کل ؟ — بے ساختہ خالاجان کے منہ سے نکلا،

" جی ہاں — انشاء اللہ، کل، مابین عصر و مغرب "

خالاجان کو یقین ہو چکا تھا کہ احمد خاں شادی نہیں کرے گا۔ کئی سال سے وہ اس کوشش میں لگی ہوئی تھیں، مگر ہر مرتبہ بات ٹل جاتی تھی، اور بنا ہوا کھیل بگڑ جاتا تھا۔ کتنی لڑکیاں انھوں نے منتخب کیں، لیکن ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی نقص اس نالائق نے نکال کر بات ختم کردی۔ انھوں نے سوچا، آج سے بہتر موقعہ نہیں مل سکتا۔ مجھے اس کو ضرور اس کے گھر تک پہنچانا چاہیے۔ بے یقینی کے لہجے میں پوچھا :

" سچ کہتا ہے ؟"

وہ سینہ ٹھونک کر بولا " بالکل سچ — کل کے آنے میں دیر ہی کتنی ہے دیکھ لینا۔"

خالاجان سوچنے لگیں یہ کہاں شادی کر رہا ہے ؟ اتنا عرصہ یہاں سے باہر رہا کسی گھرانے میں بات چیت نہیں چل رہی ہے۔ پھر یہ کیسے شادی کر سکتا ہے

لیکن جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کے لیے انھوں نے کہا:

"دیکھ اگر اس مرتبہ بھی تو جھوٹ بولا، اور مجھے دھوکا دیا تو مرتے مرتے مر جاؤں گی مگر تیرا چہرہ نہیں دیکھوں گی، وصیت کر جاؤں گی کہ احمد میرے جنازہ پر بھی نہ آئے!"

احمد خاں نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا:

"ایسا نہیں ہوگا، آپ کو یہ وصیت کرنے کی نوبت نہیں آئے گی، کیونکہ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں ——"

خالہ جان کا جذبۂ تجسس ابھرا، انھوں نے پوچھا:

"لیکن چپکے چپکے کہاں معاملات طے ہو گئے؟ کس گھرانے میں شادی ہو رہی ہے؟ کس کی لڑکی ہے؟"

احمد خاں نے جواب دیا "جب وقت آجاتا ہے تو خود بخود بات بھی طے ہو جاتی ہے اور لڑکی بھی مل جاتی ہے اور ساری مشکلیں بھی دور ہو جاتی ہیں۔"

ان عارفانہ اور حکیمانہ باتوں سے خالہ جان ذرا بھی متاثر نہیں ہوئیں۔ انھوں نے کہا:

"لیکن اس کا نام تو بتا دے لڑکے!"

احمد خاں نے ایک لمحہ توقف کیا، پھر جواب دیا:

"اس کا نام ہے رانی!"

یہ نام سن کر خالہ جان اچھل پڑیں۔ انھوں نے چاہا کہ اس انتخاب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں لیکن سوچا، کہیں ایسا نہ ہو لڑکا پھر ہاتھ سے نکل جائے۔ خاموش ہو گئیں۔

"الخاموشی نیم رضا"

---

(۳)

خالہ جان

احمد خاں اور رانی کی شادی ہو گئی۔

رانی اب عائشہ کے نام سے گھر میں یاد کی جاتی تھی!

خالہ جان نے جو کچھ کہا تھا وہ پورا کیا، گھر کا سارا انتظام اس کے سپرد کر دیا، شروع میں تو وہ اس سے کھٹکتی رہیں، سوچتی تھیں، غیر عورت ہے نہ جانے اس کی ذات کیا ہے؟ خاندان کیا ہے؟ طبیعت کیسی ہے؟ فطرت کا کیا حال ہے؟ لیکن چند ہی روز میں اس کے سبھاؤ، سیرت اور کردار نے ان کا دل موہ لیا، اور وہ صدق دل سے اس کا کلمہ پڑھنے لگیں وہ اب اس سے اتنی ہی محبت کرتی تھیں، جتنی کوئی ماں اپنی اکلوتی لڑکی سے کر سکتی ہے اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ خوش ہوتی تھیں۔ اس کے گن گایا کرتی تھیں اور وہ تھی بھی ایسی!

چند ہی دن کے اندر اس نے سارے گھر کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اخلاق، اخلاص اور بھلائی میں بڑی قوت ہوتی ہے یہ چیز پتھر کو بھی پانی بنا دیتی ہے۔

جو لوگ رانی کو ایک غیر اور اجنبی عورت کی حیثیت سے گھر کی مالکہ دیکھ کر جلتے تھے اور اس کے بارے میں ذلیل قسم کی قیاس آرائیوں سے بھی گریز نہیں کرتے تھے اب وہی اس کے حسن سلوک اور شرافت کے برتاؤ سے متاثر ہو کر اس کی تعریف و توصیف میں مصروف رہتے تھے۔ پہلے وہ اسے ایک آفت سمجھتے تھے جو نہ جانے

کہاں سے آ کر مسلط ہو گئی تھی ان پر اور اب وہ اسے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھنے لگے تھے۔

ہر گھر کے گوشہ گوشہ میں اور خاندان کے گھر گھر میں عائشہ کا ذکر ہو رہا تھا۔ گھر کے نوکر، خادمائیں اور متعلقین تو خوش تھے ہی خاندان کے افراد جنہوں نے اس شادی کو ان مل بے جوڑ قرار دیا تھا، اب وہ بھی اعتراف کرنے لگے تھے کہ ہاں عورت ہو تو ایسی۔ کس خوبی سے سارا انتظام اس نے سنبھال لیا ہے اور کس محبت کے ساتھ سب سے مل رہی ہے۔

احمد خاں کی ایک رشتہ کی ممانی تھیں۔ ایک روز وہ آ نکلیں ان کے ساتھ ان کی لڑکی سمیہ بھی تھی۔ یہ ممانی دل ہی دل میں اس خیال کی پرورش کر رہی تھیں کہ ایک دن احمد ان کا داماد بنے گا۔ لیکن جب یہ سنا کہ اس نے ایک غیر قوم کی عورت سے شادی کر لی ہے تو بہت جلیں۔ لیکن بے بس تھیں کر کیا سکتی تھیں، کچھ دن تو خاموش بیٹھی رہیں ایک روز نہ جانے کیا خیال آیا، سوچا لاؤ ذرا دیکھ تو آؤں جا کر اس نئی نویلی دلہن کو،

سمیہ کو ساتھ لے جانے کا ارادہ نہ تھا لیکن ضد کر کے وہ بھی ساتھ ہو لی۔ نہ اس شادی سے کوئی خوشی تھی نہ غم، وہ اپنے چچازاد بھائی گل خاں کو چاہتی تھی۔ گل خاں بھی جان و دل سے اس پر فدا تھا لیکن کچھ خاندانی مخالفتیں ان کے راستے میں حائل تھیں، مگر جب احمد خاں کی شادی ہو گئی تو خود بخود، یا دونوں کی کوششوں کے باعث یہ مخالفتیں بھی ختم ہو گئیں اور گل خاں کے ساتھ سمیہ کی نسبت نہایت دھوم دھام کے ساتھ انجام پا گئی۔

جب ممانی احمد خاں کے ہاں جانے کے لیے تیاریاں کرنے لگیں تو سمیہ نے ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ وہ کہنے لگیں۔

"تو کیا کرے گی جا کر وہاں خواہ مخواہ کو۔"

وہ کہنے لگی" آپ بھی تو خواہ مخواہ جا رہی ہیں"

اس برجستہ جواب کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ بے بسی کی انتہا یہ تھی ہنس پڑیں اور کہنے لگیں:

"اچھا چل۔"

دونوں ماں بیٹی احمد خاں کی شاندار حویلی میں جا کر اپنے محافہ سے اتریں، خالہ جان کا مزاج کئی دن سے ناساز تھا اس لیے وہ پیشوائی کو دروازے تک تشریف نہ لا سکیں مگر عائشہ پہنچی۔ اس نے انتہائی گرم جوشی اور تپاک سے ہاتھوں ہاتھ یاں مہمانوں کو، اپنے ساتھ لے کر بارہ دری میں آئی اور خاطر مدارات میں لگ گئی ایک صورت، اس کی سیرت، اس کے اخلاق اس کی ملنساہت، اس کی گرم جوشی، پاک خلوص، ان چیزوں نے ذرا ہی دیر میں ممانی کا اور ان سے زیادہ سمیہ کا دل موہ لیا۔ اب خالہ جان بھی ماتھے پر درد سر کی وجہ سے ایک ریشمی رومال باندھے تشریف لے آئی تھیں اور مجلس کی رونق بڑھا رہی تھیں۔ سمیہ نے خالہ جان سے کہا،

"بھائی جان (احمد خاں) کہاں ہیں؟"

وہ منہ بناتی ہوئی بولیں:

"بھائی جان — ایک تو اتنے دن نہ جانے کہاں غائب رہے۔ آئے تو شامت نکلی پڑ بیاہ کیا اور اب حالت یہ ہے کہ دو دو دن تین تین دن نہ جانے کہاں غائب رہتے ہیں۔ پوچھو تو جواب دیتے ہیں:

خالہ جان آپ کیا جانیں کیا ہو رہا ہے، کیا ہونے والا ہے اور میں کیا کر رہا ہوں، مجھے کیا کرنا ہے کوئی پوچھے میں بھلا گھر میں بیٹھنے والی عورت کیا جانوں، کیا ہو رہا ہے، کیا ہونے والا ہے اور یہ صاحبزادے کیا کر رہے ہیں اور کون سا

تیر مارنے والے ہیں۔ ابھی گئے ہوئے دو روز تو ہو چکے ہیں — کیوں دلہن ؟

عائشہ نے ادب اور شرم کے ساتھ جواب دیا :

"جی ہاں دو دن تو ہو گئے ہیں لیکن شاید اس مرتبہ زیادہ دیر سے آئیں گے"

وہ چڑ کر بولیں ، اے یہ کیوں ؟

عائشہ نے بتایا "یہ تو میں نہیں جانتی لیکن کہہ رہے تھے ، ایک ہفتہ لگ جائے گا —

جل کر بولیں "بھاڑ میں جائے ان کا ایک ہفتہ —— میں کہتی ہوں ، ایسا ہی سیلانی پن سوار تھا تو شادی رچانے کی کیا ضرورت تھی ۔ نئی نویلی دلہن غریب کیا ٹکرے گھسنے کے لیے لا بٹھائی تھی یہاں ، نہ جانے کیا ہو گیا ہے آج کل کے لڑکوں کو اور مجھے تو آج کی لڑکیوں پر حیرت ہے "

سمیہ بڑی دلچسپی سے یہ باتیں سن رہی تھی ، اس نے پوچھا :

"کیوں حیرت ہے خالہ جان ؟"

بولیں "دیکھ لو دلہن (عائشہ) کو ، کیا مجال ہے ، جو شوہر سے کہیں یہ کیا مذاق بنا رکھا ہے ۔ گھر میں رہنا ہے تو رہو ورنہ مجھے بھی پہنچا دو میرے گھر ، کیا میں اپنے گھر سے دو بھر ہو کر یہاں پڑی رہوں "

سمیہ نے عائشہ سے پوچھا ،

"آپ کیوں نہیں کہتیں بھائی جان سے یہی ۔ جو خالہ جان فرما رہی ہیں "

عائشہ نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ مسکرانے لگی ، سمیہ کو وہ اچھی تو لگ رہی تھی لیکن یہ تبسم بھی اسے بہت بھایا !

---

(۴)

اندرون خانہ

تھوڑی دیر میں مجلس منقسم ہو گئی ، یعنی خالہ جان ، اور ممانی ایک طرف بیٹھ کر اپنے اگلے پچھلے دکھڑے رونے لگیں ۔ سمیہ ، اور عائشہ ایک طرف بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں ۔

سمیہ نے آغاز سخن کرتے ہوئے کہا :

"کتنی اچھی ہیں آپ ؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی " اور تم ؟"

وہ کہنے لگی میرا آپ کا کیا مقابلہ ؟ کہاں آپ کہاں میں ؟ کہاں چاند کہاں ذرہ؟

عائشہ ہنسنے لگی ، باتیں کرنا تو بہت سیکھ لی ہیں تم نے ؟"

"لیکن کچھ غلط ہیں "

"بالکل غلط ہیں ! —— آئینہ دیکھو خود ہی جھوٹ کھل جائے گا !

سمیہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا :

"اچھا یہ باتیں تو چھوڑیئے ، اس طرح تو سارا وقت اس ہی گزر جائے گا کہ میں آپ کی تعریف میں قصیدے پڑھوں گی ، آپ میری تعریف میں زمین آسمان کے

"تلا لیے ملائیں گی، یہ بتائیے کیا بھائی جان آپ کو بہت چاہتے ہیں؟ بہت زیادہ؟"
عائشہ نے شرماتے کچھ لجاتے ہوئے لیکن بے تکلفانہ لہجہ میں جواب دیا۔
"جب تمہاری شادی ہولے گی، تب ہم دونوں اس سوال کا جواب دیں گے"
سمیہ ہنسنے لگی، بولی:
"بڑی شریر ہیں آپ؟"
اور پھر اس نے سوال کیا، ذرا چھیڑنے کے انداز میں۔
اچھا یہ تو بتائیے، کیا آپ بھی بہت محبت کرتی ہیں بھائی جان سے؟"
وہ بولی، اس سوال کا جواب بھی ہم دونوں ساتھ ساتھ دیں گے لیکن جب تمہاری شادی ہولے گی"
سمیہ چپ ہوگئی پھر کہنے لگی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا مبارکباد کسے دوں؟
عائشہ نے متحیر ہوکر کہا "مبارک باد کیسی؟ کسے دینا چاہتی ہو مبارک باد؟"
" وہ بولی" آپ کو بھی اور بھائی جان کو بھی۔ حیرت ہے کہ اتنا اچھا انتخاب
—— انھوں نے جو بیوی نائی دنیا میں اس کا جواب نہیں اور آپ نے جو شوہر پسند کیا وہ انتخاب اور لاجواب!
عائشہ تے ہنستے ہوئے کہا "یہ نہ کہو کہیں بات گل خاں تک پہنچ گئی تو ملنے نہیں منگیں گے؟"
گل خاں کا نام سن کر سمیہ بھی ذرا شرماسی گئی، پھر کہنے لگی:۔
آپ انھیں کیا جانیں؟"
وہ بولی "جب اس گھر کی ایک فرد بن چکی ہوں تو اب کسے نہیں جانتی!"
سمیہ پھر اپنے موضوع پر آگئی۔ کہنے لگی:
" آپ پر نظر پڑتی ہے تو جی چاہتا ہے بس دیکھا ہی کروں!"

عائشہ نے شوخ نظروں سے اسے دیکھا اور کہا "شکریہ بہت بہت شکریہ اس بندہ نوازی اور کرم گستری کا"
سمیہ نے جیسے یہ سنا ہی نہیں کہنے لگی:
" نہ جانے بھائی جان کس دل سے آپ کی جدائی گوارا کر لیتے ہیں۔ میں ان کی جگہ ہوتی تو ایک پل کو آپ سے جدا نہ ہوتی۔ ہروقت پہلو سے پہلو ملائے بیٹھی رہتی، دنیا و مافیہا سے ترک تعلق کر لیتی اور وہ ہیں کہ ہفتہ ہفتہ بھر غائب رہتے ہیں، خبر بھی نہیں لیتے"
عائشہ نے کہا
" مرد گھر میں بیٹھنے کے لیے نہیں ہوتے۔ سپاہی اگر گھر میں بیٹھے رہیں تو میدان جنگ میں کیا عورتیں جایا کریں گی؟"
سمیہ نے چونک کر سوال کیا:
"میدان جنگ؟ —— کیا لڑائی ہونے والی ہے کہیں؟ سچ سچ بتانا!"
وہ کہنے لگی "یہ تو میں نہیں جانتی، وہ کھل کر بات نہیں کرتے البتہ اتنا جانتی ہوں کہ جانے سے پہلے کہہ رہے تھے ایک بہت سخت معرکہ درپیش ہے"
میں نے پوچھا کس طرح کا معرکہ؟ کیا لڑائی کی تیاریاں ہو رہی ہیں؟"
کہنے لگے "ہاں —— ممکن ہے لڑائی ہو۔ اگر ہوئی تو بڑی خوفناک ہوگی۔ خدا خیر کرے۔"
میں نے سہم کر پوچھا "کیا آپ اس میں شریک ہوں گے؟"
کہنے لگے "ہاں، کیوں نہیں ہوں گے؟ کیا میں مسلمان نہیں ہوں، سپاہی نہیں ہوں؟ معرکے سر نہیں کیے ہیں میں نے؟"
پھر کہنے لگے، میرا ایک دوست ہے گل خاں، دوست بھی، عزیز بھی،

جاں نثار بھی، ہمدم بھی، ساتھی بھی، رفیق بھی! میں اور وہ مل کر اس معرکہ میں حصہ لیں گے اور انشاء اللہ فتح ہماری ہوگی۔

سمیہ سوچنے لگی اسے یاد آیا، جناب گل خاں صاحب بھی کئی روز سے شکار کا بہانہ کر کے تشریف لے گئے ہیں کہیں۔ غالباً احمد اور گل، دونوں ساتھ ساتھ گئے ہیں کہیں، شاید کوئی منصوبہ تیار کر رہے ہیں، کسی پرسکون جگہ پر بیٹھ کر۔

اسے خاموش دیکھ کر عائشہ نے پوچھا "کیا سوچنے لگیں؟"

" وہ بولی "واقعی دال میں کچھ کالا معلوم ہوتا ہے ـــ بھائی جان کب سے باہر گئے ہیں؟"

عائشہ نے بتایا "دو دن ہوئے!"

سمیہ نے کہا "وہ بھی دو دن سے شکار کو نکل گئے ہیں اور اب مجھے یاد آیا، وہ بھی کہہ گئے ہیں کہ ایک ہفتہ کے بعد آئیں گے ـــ معلوم ہوتا ہے دونوں ساتھ ساتھ گئے ہیں، ساتھ ساتھ آئیں گے!"

عائشہ نے تائید کی "ہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے!"

پھر اس نے سوال کیا "کیا واقعی دونوں بہت گہرے دوست ہیں؟ میں تو کچھ زیادہ جانتی نہیں۔"

سمیہ نے کہا "ہاں بچپن کے دوست ہیں اور عزیز بھی ہیں ـــ آؤ آج ایک عہد کریں ہم تم!"

عائشہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا:

"کیسا عہد؟ کیا چاہتی ہو تم؟"

وہ بولی "یہ عہد کریں کہ ان دونوں (گل خاں اور احمد خاں) کی طرح ہم دونوں بھی سچے دوست رہیں گے اور زندگی کے ہر معرکہ میں ہر دور میں ایک دوسرے کے

ساتھ رہیں گے ـــ کرتی ہو یہ عہد؟"

عائشہ نے استقلال و عزیمت کے لہجہ میں جواب دیا،

"ہاں سچے دل سے!"

سمیہ نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا "تو بس پھر پکی ہو گئی"

اتنے میں ممانی آئیں اور کہنے لگیں کیا پکی ہو گئی کچھ دیوانی ہو گئی ہے لڑکی!

(۵)

آگیا......

ایک ہفتہ گزر گیا، مگر احمد خاں نہیں آیا۔ گل خاں بھی شکار سے واپس نہیں لوٹا۔ گھر والوں کو بڑی تشویش دامنگیر تھی کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ معاملہ کیا ہے؟

گل خاں کے بوڑھے باپ اور بیمار ماں، اور محبت کرنے والی بہن کو خاص طور پر بہت تشویش تھی، کیونکہ انھوں نے شادی کی تاریخ گل خاں سے پوچھے بغیر مقرر کر دی تھی، اور اب اس تاریخ میں صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔

سمیہ کے گھر والے بھی حد درجہ منتظر اور پریشان تھے، وہ اسے بدشگونی خیال کرتے تھے کہ شادی کی تاریخ ٹل جائے۔ وہ بار بار گل خاں کے والد سے سوال کرتے تھے،

"گل خاں کب آئے گا؟"

اور وہ بیچارے شرمندہ ہو کر جواب دے دیتے تھے۔

"بس آیا ہی چاہتا ہے"

سوال کیا جاتا "شادی کی تاریخ گذر نہ جائے کہیں، آج کل ہی میں؟"

وہ دھڑکتے ہوئے دل سے لیکن بظاہر پورے ٹھاٹھ سے سینہ ٹھونک کر کہتے

"کہیں ایسا ہو سکتا ہے — شادی تاریخ مقررہ پر ہوگی، اور ہو کر رہے گی۔"

یہ جواب کافی اطمینان بخش تھا، لیکن پھر بھی دبدبا باقی رہ جاتا اس لیے کہ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ اتنے دنوں اور یوں وہ غائب رہا ہو۔

جہاں تک سمیہ کا تعلق تھا وہ بھی بہت فکرمند تھی، کبھی کبھی اس کے دل میں خیال آتا،

"کہیں گل خاں کی نظر کہیں اور تو نہیں لڑ گئی؟ کسی اور کو تو نہیں چاہنے لگا وہ؟ — مردوں کا اعتبار بھی کیا۔"

اور پھر خود ہی اپنے دل کو ملامت کرتی کہ ایسے محبت کرنے والے شخص کے بارے میں ایسا ناپاک خیال آیا اس کے دل میں!

شادی کی تیاریاں دونوں طرف سے جاری تھیں۔

انتظامات انتہائی تیزی اور سرعت کے ساتھ عمل میں لائے جا رہے تھے، عزیزوں، قریبوں، رشتہ داروں، برادری والوں اور دوستوں کو دعوت نامے بھیجے جا چکے تھے اور ان کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔

لیکن "برات موجود دولہا غائب" والا معاملہ پیش آتا نظر آ رہا تھا۔

اب شادی کی تاریخ میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ دونوں جگہ، یعنی سمیہ اور گل خاں کے ہاں انتظامات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے تھے — مگر گل خاں کا ابھی تک پتہ نہیں تھا۔

گل خاں کے والد نے، بات ظاہر تو نہیں ہونے دی، لیکن ایسے چند معتمد عزیزوں کو اس کی تلاش میں کئی دن سے دوڑا رہے تھے۔ انھوں نے حکم دے رکھا تھا کہ چاہے وہ ہاتھی کا شکار کر رہا ہو یا مچھر کا اسے فوراً اپنے ساتھ لے کر آؤ۔ یہ بات ... ہو جاتی تھی، اور بے نیل مرام واپس آ جاتی تھی۔

آج واقعی بیچارے بہت شرمندہ، افسردہ اور پریشان تھے۔ انھوں نے اپنی بیوی سے جو بستر علالت پر کچھ عادتاً کچھ سچ مچ دراز تھیں جاکر رازدارانہ لیکن مشتعل لہجہ میں کہا:

"بی بی میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہارے لڑکے کو عاق کردوں۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں۔

"صرف میرا ہی ہے تمہارا لڑکا نہیں ہے!"

وہ بگڑ کر بولے "میرا لڑکا ہوتا تو ایسا نالائق ہوتا — نہ جانے کس کا ہے؟"

وہ اس طنز سے بپھر گئیں اس بڑھاپے میں بھی انھیں اپنی آبرو کا بڑا پاس تھا کہنے لگیں۔

"خود تو جیسے جوانی میں بڑے نیک اور پارسا تھے!"

غصہ کے باوجود بڑے میاں کے جھریوں پڑے چہرے پر رونق آگئی، کہنے لگے:

"تم تو میری جاسوس بن گئی تھیں شادی سے پہلے ہی نہ جانے دشمنوں نے تم سے کیا کہا تھا اور تم نے یقین بھی کر لیا۔ ہمیشہ کی بے وقوف ہو۔"

کہنے لگیں مجھے کیا پڑی تھی کسی کی جاسوسی کرنے کی سارے شہر میں ڈنکا بج رہا تھا تمہاری نیکی اور پارسائی کا کچھ آوازیں کبھی کبھی میرے کانوں میں بھی پڑجاتی تھیں کہنے لگے "گزرے ہوئے زمانے کو یاد کرنے سے حاصل؟ اب تو نیک اور پارسا ہوں، کس وقت کی نماز قضا ہوتی ہے؟"

بولیں "ہاں — ستر چوہے کھاکر بلی حج کو چلی، — تب بھی کرآؤ جاکر"

غصہ بالکل کافور ہوچکا تھا، مزے ہی آگئے گویا ہوئے۔

"کیوں پرانا زمانہ یاد دلاتی ہو؟ چوٹ لگتی ہے دل پر۔"

پوچھنے لگیں "کیا خدانخواستہ سب مرگئیں؟"

چونک کر دریافت کیا:

"کون مرگیا؟"

زہر خند کرتے ہوئے جواب دیا:

"وہی جن سے پیار کرتے تھے، جن کے ہاں رات رات بھر نشستیں رہتی تھیں جن سے چاہت کے دعوے تھے، جن کے عشق میں گھر سے نکلے جارہے تھے۔ اور شادی سے انکار کر دیا تھا!

کچھ خفیف ہوکر کچھ جوش میں آکر فرمایا

"لاحول ولا قوۃ کیسی باتیں کرتی ہو؟ کچھ دماغ چل گیا ہے؟ یہ سب گپ ہے۔"

"ہاں گپ ہے! — جب چاہو سچ کو جھوٹ کہہ لو۔ کوئی زبان تو نہیں پکڑ سکتا کسی کی۔"

"اچھا ایمان سے بتاؤ جس روز سے اس گھر میں بیوی بن کر آئی ہو کیا تم نے مجھے محبت کرنے والا نہیں پایا۔"

"تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے!"

بڑے میاں پر سرور اور وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔ جھوم اٹھے، نشاط و کیف کے عالم میں ارشاد فرمایا:

"بھئی لطف آگیا اس جواب پر!"

بڑی بی نے پوچھا "لطف کس بات پر آیا؟"

کہنے لگے "آج تمہاری چوری پکڑ لی۔"

یہ سن کر ذرا چونک کر ایک مرتبہ شوہر کو دیکھا پھر دریافت کیا:

"چوری کیسی؟"

شوہر نے جواب دیا "گویا تم نے اپنی محبت کا بھی اقرار کر لیا، ساتھ سال کی اس شادی شدہ زندگی میں آج پہلی مرتبہ تم نے اقرار کیا ہے!"

خوش ہو گئیں، کہنے لگیں "چھوڑو ان باتوں کو ـــ یہ بات نہ ہوتی تو زندگی کیسے بسر ہوتی اس شان سے!

"راز دارانہ اور دوستانہ انداز میں بیوی سے پوچھا:

"لیکن وہ نالائق وہ الوکا پٹھا، وہ شیطان رجیم، آخر کہاں غائب ہے؟

وہ بے پروائی سے بولیں "میں کیا جانوں؟ ـــ شکار کو کہہ گیا تھا!"

"لیکن یہاں تو ناک کٹی جا رہی ہے۔ کل شادی کی تاریخ ہے اور وہ حضرت شکار سے شوق فرما رہے ہیں، آخر میں دلہن والوں کو کیا منہ دکھاؤں گا مجبوراً سنکھیا کھا کر سو جاؤں گا ـــ"

یہ سن کر وہ تڑپ گئیں اور جو راز اب تک سینہ میں دبائے ہوئے تھیں اسے اگل دیا،

"خدا نہ کرے ـــ کچھ دیوانے ہوئے ہو"

"عزت کے لیے جان بھی دے دینی پڑتی ہے"

"لیکن عزت نہیں جائے گی میں اطمینان دلاتی ہوں"

"کیونکر؟ کچھ کہو بھی تو!"

"وہ شکار کو نہیں گیا، احمد خاں کے ساتھ کسی ضروری کام سے گیا ہے۔ آٹھ دس دن میں آنے کو کہہ گیا تھا بس آج ہی ورنہ کل ضرور آ جائے گا!"

"اگر نہ آیا؟"

"کیسے نہ آئے گا؟ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ تم شادی کی تاریخ مقرر کر چکے ہو اور یہ ٹل نہیں سکتی!"

"واقعی بتا دیا تھا؟"

"ہاں سچ ـــ بتا دیا تھا، وہ تو خود یہ کہتا تھا کہ تاریخ جلد مقرر ہونی چاہیے یہ سے محبت بھی تو ہے اسے!"

"محبت ـــ وہ کیا جانے محبت کو؟"

"جل گئے ـــ کیا تمہارے سوا دنیا میں کسی نے محبت نہیں کی؟ کوئی نہیں کر سکتا!"

"(خوش ہو کر) اور کیا ـــ ہمارا مقابلہ کون کر سکتا ہے اور پھر وہ کل کا لونڈا"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مرجانہ جو اس گھر کی قدیم خادمہ تھی دوڑی دوڑی آئی اور کہنے لگی:

"بی بی مبارک، میاں مبارک ـــ وہ آ گئے بھیا! ـــ دولھا میاں!"

میاں بیوی دونوں یہ خبر سن کر نہال ہو گئے اور دونوں نے بیک آواز پوچھا:

"کیا گل خاں آ گیا؟"

مرجانہ نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ گل خاں خود ہی پہنچ گیا۔ ماں نے باپ نے خوشی ظاہر نہ ہونے دی، بظاہر خفگی کے لہجہ میں پوچھا:

"کہاں رہتے اب تک؟"

گل خاں نے ادب سے سر جھکا کر عرض کیا،

"شکار کو گیا تھا، ابھی حضور سے عرض کر گیا تھا کیا انھوں نے آپ سے نہیں

باپ نے کچھ شفقت، کچھ محبت کے ساتھ لخت جگر کو دیکھا اور اس کے

بیٹے کل تمہاری شادی ہے، اگر آج تم نہ آئے ہوتے تو ابھی میں نے تمہاری ماں

کر سنکھیا کھا کر سو رہوں گا!"

گل خاں نے محبت اور عقیدت کی نظروں سے باپ کو دیکھا اور کہنے لگا:

"غلام اتنا نالائق نہیں ہے کہ آپ کو شرمندگی کا موقعہ دیتا، میرا جی ابھی آنے کو نہیں چاہ رہا تھا، شاید چند روز اور نہ آتا مگر اس وجہ سے حاضر ہو گیا کہ آپ جو قول دے چکے ہیں وہ پورا ہو!"

"ورنہ تمہیں شادی کی نہ کچھ ایسی جلدی تھی نہ فکر؟"

اس بے ساختہ سوال پر گل خاں کچھ سٹ پٹا سا گیا۔ ابھی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ کیا جواب دے کہ قہقہے کے شور میں باپ نے کہا:

"کیا واقعی تم شکار پر گئے تھے؟"

جواب دینے کے بجائے گل خاں نے شکایت آمیز نظروں سے ماں کی طرف دیکھا وہ مسکراتی ہوئی بولیں:

"اونھ تو احمد خاں کوئی غیر ہے؟ وہ ہمارا خون اور گوشت ہے۔ اس کے ساتھ چلے گئے تھے تو کیا ہوا؟"

اس جواب سے گل خان مطمئن ہو گیا۔ باپ نے پوچھا:

"لیکن احمد خاں کے ساتھ کیوں گئے تھے؟"

اس سوال پر پھر وہ سٹ پٹا گیا، لیکن ماں نے مشکل آسان کر دی کہنے لگیں:

"اتنے دنوں کے بعد احمد خاں آیا ہے، دونوں بچپن کے دوست ہیں دل بہلانا تھا اپنے ساتھ سیر سپاٹے کو ——— کیوں خواہ مخواہ کے سوالات کر کے لڑکے کو پریشان کر رہے ہو۔ ابھی تو وہ سفر سے آیا ہے، نہ کپڑے بدلے ہیں نہ غسل کیا ہے نہ آدمی بنا ہے، بھوک بھی لگ رہی ہوگی کھانا تو کھا لینے دو اسے پھر جتنے چاہے سوال جواب کر لینا ——— جا بیٹے، نہا دھو کر آ، اتنی دیر میں کھانا نکلواتی ہوں ———"

گل خاں کی جان میں جان آگئی وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد والد محترم بھی تشریف لے گئے، لیکن حسن اتفاق یا بدقسمتی مردانے میں پہنچے تو گل خاں پر نظر پڑ گئی۔ اس نے سامنے سے ہٹ جانا چاہا۔ مگر موقعہ نہ تھا، فرمایا،

"بیٹے تم آگئے مجھے بڑی خوشی ہوئی ——— تمہاری عدم موجودگی میں سارے انتظامات جو مجھ سے ہو سکے کیے تم بھی ایک نظر ڈال لو۔ اگر کوئی کسر رہ گئی ہو تو بتا دو۔ ابھی سب کچھ ممکن ہے!"

گل خاں نے ادب اور شائستگی کے ساتھ جواب میں کہا۔

"جو کچھ آپ نے کیا ہے اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے؟"

باپ سے رخصت ہو کر گل خاں اپنے کمرے میں گیا تو وہاں مرجانہ مل گئی جو اس کی منتظر تھی۔

گل خاں نے پوچھا،

"کچھ مجھ سے کہنا ہے؟"

وہ بولی "ہاں ——— خوش تو سب ہو رہے تھے کہ کل دھوم دھام سے شادی ہے؟" وہ مسکراتا ہوا بولا "اس سے بڑھ کر بھی خوشی کی بات کوئی اور ہو سکتی ہے؟ ——— دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے؟"

مرجانہ نے کہا، لیکن منہ دھو رکھو بھیا۔

گل خاں نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا،

"کوئی بات کیا ہے کوئی رکاوٹ پیش آگئی ہے؟"

وہ بولی "ہاں ——— بڑی رکاوٹ!"

گل خاں اور زیادہ پریشان ہو گیا، اس نے سوال کیا۔

"کس طرح کی رکاوٹ ہے، کچھ بتاؤ تو سہی!"

وہ کہنے لگی "بہت خفا ہیں، بہت خفا!"

گل خاں نے سوال کیا، "کون خفا ہے؟ ابا جان تو خوش ہو گئے، اماں فراہی خفا نہیں ہیں!

مرجانہ نے چھیڑتے ہوئے کہا "دلہن خفا ہیں اور اتنی خفا ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے!

بے کلی اور اضطراب کے ساتھ گل خاں نے پوچھا "کیوں؟ کیا خطا سرزد ہوئی ہے مجھ سے؟

مرجانہ نے بتایا "اتنے دن سے آپ کہاں تھے؟ —— جانتے ہو وہ کیا سوچ رہی ہیں تمہارے بارے میں؟

"کیا سوچ رہی ہیں؟"

"ان کا خیال ہے کہیں اور دل لگ گیا ہے تم نے —— اب تو تمہاری صورت سے بیزار ہیں ——

گل خاں ہنسنے لگا۔

"میں انھیں رضامند کروں گا مرجانہ!"

"ہو چکیں رضامند ——

"اچھا تو تم خوش کر دو —— کیا یہ کام بھی نہیں کر سکو گی میرے لیے؟

مرجانہ نے منہ بناتے ہوئے کہا "میں نے بہت کوشش کی لیکن وہ اس وقت تک خوش نہیں ہوں گی جب تک یقین نہ ہو جائے کہ تمہاری اس غیر حاضری کا سبب وہ نہیں تھا جس کا انھیں یقین ہے!

"لیکن یہ غلط فہمی کس طرح رفع ہو سکتی ہے؟ —— کیا تم میرا خط پہنچا دو گی سمیرہ کو؟"

"ہاں پہنچا دوں گی اگر انھوں نے لینے سے انکار نہ کر دیا۔"

"نہیں ایسا نہیں ہوگا، ابھی ذرا دیر میں آ کر لے جاؤ خط، کہنا —— کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے!

مرجانہ ہنستی ہوئی چلی گئی!

---

(۶)

لطیفہ

گل خاں اور سمیعہ کی شادی ہو گئی!

کتنے خوش تھے یہ دونوں اس نہ ٹوٹنے والے رشتہ سے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دولت دوجہاں مل گئی ہے دونوں کو!

سمیعہ کی کیفیت یہ تھی کہ ـــ تم جسے چاہو بھلا پھر اسے کیا یاد رہے؟ وہ سب کچھ بھول چکی تھی، فراموش کر چکی تھی۔ اس عاشق خونیں جگر کے سوا کچھ بھی یاد نہ تھا اسے!

اور گل خاں کا حال یہ تھا کہ:

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں۔
جس کے شانے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

سمیعہ اس کے پاس تھی، تو گویا دنیا کی ہر نعمت اسے حاصل تھی اس کے بعد کیا چاہیئے تھا اسے؟

مگر ایک دلچسپ واقعہ شادی کے دو دن کے بعد کا جب یاد آتا تھا سمیعہ خود بخود ہنسنے لگتی تھی۔

اس شادی میں دور اور نزدیک کے تمام عزیز اور رشتے دار شریک ہوئے تھے ان میں احمد خاں کی خالہ جان، اور ان کی روح رواں اور عصائے پیری، نور چشم اور لخت جگر۔ کلیجہ کی ٹھنڈک، اور دل کا ارمان عائشہ بھی تھی، اور بڑھ چڑھ کر اس تقریب سعید میں حصہ لے رہی تھی بلکہ کہنا چاہیئے زنان خانے کا سارا انتظام اسی نے سنبھال لیا تھا اور وہ ممانی (سمیعہ کی ماں) تک جو اس سے کچھ زیادہ خوش نہ تھیں اور اب تک دل ہی دل میں اس کی خوش بختی پر جلا کرتی تھیں۔ اس کا دم بھرنے لگیں۔ وہ بار بار کہتی تھیں:

"میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اگر میری اس بچی نے میرا ہاتھ نہ بٹایا ہوتا تو سارا کیا دھرا برباد ہو جاتا۔"

ایک طرف تو وہ گھر کے کام کاج میں دل و جان سے مصروف تھی دوسری طرف موقع موقع سے سمیعہ کے پاس بھی جانے کا وقت نکال لیتی تھی جو دلہن بنی اپنے حجلۂ عروسی کے اندر سہیلیوں کے جھرمٹ میں اس طرح سمٹی سمٹائی، دبکی، لجائی، گٹھڑی بنی بیٹھی تھی، جیسے اس تقریب سے اسے کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔

ایک مرتبہ ہجوم کار سے ایک منٹ کے لیے فراغت کر کے لپ جھپ کرتی ادھر آئی۔ اور وہیں دروازے سے پکاری۔

"کیا میں آسکتی ہوں؟

سمیعہ پہلو بدل کر رہ گئی، اس کا جی چاہا کہ کہے آجاؤ، تم سے ملنے کا تو کتنی دیر سے جی چاہ رہا تھا، مگر کہہ نہ سکی۔ اتنی ساری سہیلیوں کے سامنے گو یہ سب بے تکلف تھیں پھر بھی وہ ان کے سامنے لب کشائی کرتے جھجکتی تھی۔

عائشہ اندر آگئی۔ اس نے سمیعہ کے پاس بیٹھ کر اسے گدگدانا شروع کر دیا اور یہ اس کی بڑی پرانی، بچپن سے کمزوری تھی۔ اس حملہ کی مدافعت نہ کر سکی بنبط

کی بہت کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ اور دست نازک سے اسے پرے ہٹاتے ہوئی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اور ٹھیک اسی وقت ممانی اماں، اپنی بعض ہم عمر اور ہم مذاق بیبیوں کے ساتھ دلہن کی زیارت کرنے کے لیے کمرے میں وارد ہوئیں۔ انھوں نے جو بیوی کو اور ان کی ہم عمر خواتین نے جو دلہن کو اس طرح دیوانہ وار ہنستے دیکھا تو سب پر سناٹا سا چھا گیا۔ ہق دق ہو کر ایک سیکنڈ تک دیکھتی رہیں، بے چاری ممانی پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا، بے غیرتی کا یہ منظر دیکھ کر جی چاہتا تھا پھوٹ پھوٹ کر رو دیں مگر آنکھیں خشک تھیں کر ان کے ساتھ آنے والی ایک بی بی نے ہاتھ پکڑ کر باہر جاتے ہوئے کہا:

"واہ بھئی کیا زمانہ آ لگا ہے، نہ غیرت نہ شرم توبہ ہے، کبھی ہم بھی تو جوان تھے۔"

---

(۷)

عجیب سی باتیں

شادی کے تیسرے دن کی بات ہے۔ رات کا وقت تھا، دونوں میاں بیوی پیار اور محبت کی باتیں کر رہے تھے کہ نہ جانے کیا سوچ کر سمیعہ نے شوہر سے کہا:

"کیا اس شادی میں تمہارے وہ دوست شریک نہیں تھے جو تم پر جان دیتے اور جن پر تم فدا ہو ہزار جان سے؟"

[illegible] خاں مسکرانے لگا "ہزار جان سے تو صرف ایک ہی دوست پر فدا ہوں اس دوست کا نام نامی اور اسم گرامی ہے سمیعہ بیگم اور میرا خیال ہے میری شادی میں وہ دوست شریک تھے ——— کیا غلط ہے؟"

وہ مسکراتی ہوئی اور شوخ نگاہوں سے اداؤں کے تیر برساتی ہوئی بولی:

"میں بھی بھائی جان کو پوچھ رہی ہوں ——— کیا وہ تمہارے جگری دوست نہیں ہیں؟"

[illegible] خاں نے جواب میں کہا:

"[illegible] خاں کو پوچھ رہی ہو شاید؟ ——— ہاں بے شک وہ میرا دنیا میں سب سے [illegible] عزیز اور محبوب دوست ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ شادی میں شریک نہیں

"تو آپ خفا نہیں ہو گئے ان سے ؟"

"نہیں سمیہ اس جیسے یار وفادار سے خفا ہونے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے !"

"لیکن کیوں نہیں شریک ہوئے وہ ؟"

"وہ یہاں تھا نہیں — ورنہ ممکن تھا کہ آتا ؟"

"آخر کہاں گئے ہیں وہ ؟"

"اس سوال کا صحیح ترین جواب عائشہ سے مل سکتا ہے اس سے پوچھ لینا !"

"وہ کچھ نہیں بتاتی، پوچھ چکی ہوں اس سے بھی !"

"کیا کہتی ہے ؟"

"کہتی ہے ، دیوار ہم گوش دارد ، بتانے والی بات نہیں ہے لیکن قوم کے کام پر گئے ہیں !"

"ٹھیک کہتی ہے اور یہی جواب میرا بھی ہے !"

سمیہ اس جواب سے الجھتی ہوئی بولی :

"چوری چھپے قوم کی خدمت کرتے آپ ہی دونوں کو دیکھا !"

گل خاں زور سے ہنس پڑا "چوری چھپے !"

وہ بولی "اور کیا ، کبھی دو دو دن کو غائب ، کبھی تین دن کو لاپتہ ، کبھی ہفتہ ہفتہ روپوش ، کبھی اس سے بھی زیادہ مدت کے لیے گم ، سوال کرو تو معلوم ہوگا ، قوم کا بڑا ضروری کام ہے اسے سرانجام دینے گئے ہیں — میں پوچھتی ہوں کیا جنگلوں ، صحراؤں اور بیابانوں میں قوم کا کام چھپ چھپ کر انجام دیا جاتا ہے ؟"

گل خاں کچھ سوچنے لگا پھر سنجیدہ لہجہ میں گویا ہوا۔

"ہاں سمیہ کبھی ایسا بھی کرنا پڑتا ہے ان باتوں کا انحصار تو حالات اور مصالح پر ہوتا ہے ۔"

اور یہ کہہ کر وہ پھر غوطہ میں چلا گیا ، اس کی یہ کیفیت دیکھ کر سمیہ پریشان ہوگئی اس نے کہا :

"کیا سوچنے لگے آپ ؟ — ہیں کہاں اس وقت ؟"

---

(۸)

قوم کے لیے

گل خاں نے اسی سنجیدہ لہجہ میں جواب دیا :
" سمیہ تم نہیں جانتیں کتنا نازک زمانہ ہے یہ !"
وہ کچھ سہمے ہوئے انداز میں بولی ۔
" آپ بتائیں تو جانوں ، ورنہ مجھ جیسی گھر میں بیٹھنے والی کیا جان سکتی ہے ؟
گل خاں نے گویا اس کی بات نہیں سنی اپنی رو میں کہتا چلا گیا ۔
" یہ بڑا نازک وقت ہے ۔ یا تو مسلمان اس دیس میں زندہ رہیں گے یا مٹ جائیں گے ۔ یا تو فاتح کی حیثیت سے حکومت کرتے رہیں گے ، جیسے ایک مدت سے کرتے چلے آرہے ہیں ۔ ورنہ انھیں غلاموں کی طرح رہنا پڑے گا ـــــ یا تخت یا تختہ ، یا آزادی یا موت ، یا عزّت کی زندگی ، یا بہادروں کی سی مرگِ خوش انجام !
گل خاں کے منہ سے سمیہ نے محبت عشق اور چاہت کے سوا کوئی اور بول کبھی نہیں سنے تھے ۔
لیکن اس وقت جو گل خاں اس کے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا تھا یہ تو کوئی اور گل خاں تھا ، اس کے تیور ، اس کے انداز ، اس کے چشم و ابرو اس کے الفاظ ، اس کے لب و لہجہ

کسی چیز میں بھی تو وہ گل خاں نظر نہیں آرہا تھا ، جو اسے چاہا کرتا تھا ، جو اس پر سچ مچ ہزار جان سے فریفتہ تھا ۔
اس نے گل خاں کو دیکھ کر وہ سہم گئی ، گھبرا گئی ، حیران اور پریشان نظروں سے دیکھنے لگی ۔ کچھ پوچھنا چاہا ، مگر زبان نے یاری نہ دی ، کچھ کہنا چاہا مگر ایسا محسوس ہوا جیسے گونگی ہو گئی ہے ۔
اور اس کی اس کیفیت سے بے پروا ، گل خاں بدستور اپنے حال میں مست ، مصروف تکلم تھا :
" ہر طرف سے دشمنوں کی یلغار ہے "
سمیہ چپ نہ رہ سکی ـــ " دشمن ؟ "
گل خاں نے جواب دیا " ہاں دشمن ـــــ اور یہ دشمن دوست بھی ہیں ، ساتھی بھی ہیں ، اپنے بھی ہیں ، عزیز اور وفادار بھی ہیں ـــ حد یہ ہے کہ اگر ہندو ہیں تو مسلمان بھی ہیں ! "
اتنے خوفناک دشمنوں کی یہ طویل فہرست سن کر سمیہ اور زیادہ حواس باختہ ہو گئی کہنے لگی :
" یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟ ـــ اتنے سارے دشمن کہاں سے ابل پڑے ؟ اور مجھ کو یہ دشمن اپنے گرد کہیں نظر نہیں آتے !
گل خاں نے کسی قدر جوش و خروش کے ساتھ کہا ،
" ان دشمنوں کو پہچاننے کے لیے آنکھوں کی ضرورت ہے ! "
" اور وہ آنکھ صرف آپ کے پاس ہے ؟ "
" نہیں ـــ احمد خاں کے پاس بھی ہے "
" گویا صرف آپ ہی دونوں کے پاس ؟

"کچھ ہمارے اور دوست بھی اس آنکھ کی دولت سے مالامال ہیں!"

"خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے، مجھے ہول ہو رہا ہے غش آجائے گا مجھے۔"

— کہہ دیجیے آپ مذاق کر رہے تھے۔

---

(۹)

حمیّتِ قومی

گل خاں پر اس وقت ایک عجیب سا جذبہ طاری تھا، کوئی اور وقت ہوتا تو ان الفاظ کے جواب میں وہ اُسے کوئی پھڑکتا ہوا جواب دیتا، لیکن اس وقت، اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے، چہرہ سرخ ہو رہا تھا، بدن پر کپکپی طاری تھی اس نے کہا:

"سمیہ یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا ہوں — میں تمہیں ایک امتحان میں بھی ڈالنا چاہتا ہوں۔"

امتحان کا لفظ سن کر پہلے تو سمیہ کے بدن پر جھرجھری سی طاری ہوئی پھر ایک ادا کے ساتھ اس نے کہا:

"آپ میرا امتحان لینا چاہتے ہیں؟ کیا آپ کا خیال ہے، میں جھجک کر پیچھے ہٹ جاؤں گی؟ — بتائیے کس امتحان میں آپ ڈالنا چاہتے ہیں مجھے؟"

گل خاں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"سچ کہتی ہو؟ — تیار ہو گیا؟"

عزم استقامت کا پیکر بن کر بولی "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، بتاتے کیوں نہیں

کیا بات ہے؟"

گل خاں نے ذرا سے تامل کے بعد کہا:

"لودھی خاندان کی حکومت ختم ہونے والی ہے۔ ابراہیم ظالم ہے، عیاش ہے، مردم ناشناس ہے، بے وفا ہے۔ دوستوں کو پہچاننے کی تمیز نہیں رکھتا۔ دوستوں کو دشمن بنا لیتا ہے!"

"لیکن ہمارا بادشاہ ہے!"

"ہاں ــــ اور اس خاندان کو مٹانے کے لیے رانا سانگا ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔"

"وہ تو کئی دفعہ منہ کی بھی کھا چکا ہے!"

"لیکن اس مرتبہ اس نے بڑا زبردست کھیل کھیلا ہے!"

"وہ کیا داؤں ہے؟"

"اس نے بابر کو کابل سے بلایا ہے۔ وہ اپنا لشکر عنقریب لایا چاہتا ہے!"

"بابر ــــ کوئی بہت بڑا اور طاقتور بادشاہ ہے؟"

"بہت بڑا تو نہیں لیکن باہمت، باحوصلہ اور طاقتور ضرور ہے۔ وہ اگر آیا اور کامیاب ہو گیا تو یہاں ٹھہرے گا نہیں۔ مالِ غنیمت سے لدا پھندا واپس چلا جائے گا اور اس کے جانے کے بعد رانا سانگا اس ملک کا مالک بن جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ــــ"

"مسلمان غلام بن جائیں گے!"

"ہاں ــــ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟"

"میں اکیلی کیا کر سکتی ہوں؟"

"یہ نہ کہو بارش کا ایک قطرہ، کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن بہت سے قطرے جل تھل کر دیتے ہیں ــــ تم ایک ہو، میں اکیلا ہوں، احمد خاں ایک ہے، عائشہ ایک ہے

کچھ ہمارے دوست ہیں، لیکن ہم سب مل کر، اگر کوشش کریں گے تو اس طوفان کا رخ پلٹ دیں گے!"

"بس اتنے سے مٹھی بھر آدمی؟"

"ہاں ــ ہم رانا سانگا سے لڑیں گے، دولت خاں سے لڑیں گے جو بابر سے مل گیا ہے اور بابر سے لڑیں گے جو ہمارا ناخواندہ مہمان بن کر آ رہا ہے، ان سب سے لڑیں گے اور ان سب کو شکست دیں گے!"

"اور اگر نہ دے سکے؟"

"تو مر جائیں گے، بہادری کی موت، کیا یہ موت قابلِ فخر نہیں؟"

حمیرہ کا دل ڈوبنے لگا، لیکن اس نے حوصلہ قائم رکھا، وہ شوہر کا حوصلہ بھی قائم رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا:

"بے شک ــ بہادری کی موت بزدل کی موت سے بہتر ہے!"

"تو کیا تم تیار ہو کہ میں اس معرکہ میں حصہ لوں؟"

"ہاں میں تیار ہوں ــــ اور خود بھی جو کچھ ہو سکے کرنے کو تیار ہوں، کیا کچھ میں کر سکتی ہوں؟"

گل خاں نے آگے بڑھ کر حمیرہ کو سینہ سے لگا لیا اس کی پیشانی کو بوسہ دیا، اور جذباتی انداز میں کہا:

"حمیرہ، تم کتنی قابلِ فخر ہو، مجھ جیسے نکمے اور بدقسمت شخص کے لیے ــــ لیکن تم نے ایک نئی زندگی، نیا حوصلہ، نیا ولولہ دیا ہے۔ یہ آسانی سے مجھے نہیں مرنے دے گا۔

---

(۱۰)

دولت خاں کی شرط

عائشہ اور سمیہ میں اب وہی تعلقات قائم ہو چکے تھے، جو گل خاں اور احمد خاں میں تھے۔ شادی کی تاریخ اگر قطعی طور پر طے نہ ہو چکی ہوتی تو گل خاں ہرگز اس وقت تک دولھا بننا منظور نہ کرتا جب تک احمد خاں بھی شریک نہ ہوتا۔ لیکن خود احمد خاں نے مجبور کر کے اسے بھیجا تھا، اس لیے مجبوراً اسے آنا پڑا۔

صورت حال یہ تھی کہ دولت خاں اپنے بعض رفیقوں اور دوستوں کے منع کرنے کے باوجود بعض دوستوں اور رفیقوں کے ورغلانے میں آکر ابراہیم سے علی الاعلان بھڑ گیا تھا، دارالحکومت میں رہ کر اس سے مقابلہ کرنا آسان نہ تھا اور وہ خود اپنی جمعیت کے ساتھ اس کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا تھا، لہٰذا اس نے وہی کیا، جس کا اندیشہ تھا، یعنی وہ بابر سے مل گیا۔

بابر، اس سے پہلے ایک آدھ بار ہندوستان کے بعض سرحدی مقامات تک آکر لوٹ گیا تھا لیکن اس مرتبہ ایک طرف رانا سانگا کا دعوت نامہ پہنچا دوسری طرف، بہ نفس نفیس دولت خاں، ہندوستان کے ایک سرحدی مقام دیپالپور میں اس کے پاس نذرانۂ عقیدت لے کر پہنچ گیا، تو اس نے اپنے ساتھیوں سے

مشورے کے بعد قطعی فیصلہ کر لیا کہ ہندوستان پر حملہ کرنا ہے۔

رہی یہ بات کہ فتح ہند کے بعد واپس جانا ہے، یا رہنا ہے اس کا فیصلہ وقت پر ہوگا۔

احمد خاں جب وطن پہنچا تو، گل خاں نے اسے ساری صورت احوال سے مطلع کر دیا، یہ دونوں بہت گہرے دوست تھے۔ انھوں نے عام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ دولت خاں کو بابر سے کاٹا جائے اور اسے ترغیب دی جائے کہ اس نازک مرحلہ پر وہ مسلمان کے مستقبل سے نہ کھیلے۔

گل خاں نے کہا، دولت خاں ابراہیم کی روش سے بہت بد دل ہو چکا ہے اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ابراہیم نے بھی اس کے ساتھ بغیر کسی معقول وجہ کے... بدسلوکی کی، اور احسان فراموشی کی حد کر دی، لیکن، صرف تم ایک ہو جو اسے سمجھا سکتے ہو۔

احمد خاں نے گل خاں کی باتیں سن کر کہا:

میں اس کے لیے تیار ہوں، لیکن ہمیں دولت خاں کے پاس دیپال پور جانا پڑے گا،

گل خاں تیار ہو گیا، لیکن اس نے کہا:

ایک مشکل ہے؟

احمد خاں نے وہ مشکل دریافت کی تو گل خاں نے اپنا اور سمیہ کا سارا افسانۂ محبت بیان کرنے کے بعد کہا:

امی حضور نے تاریخ بھی مقرر کر دی ہے۔ اگر میں تاریخ مقررہ تک واپس نہ پہنچا تو غضب ہو جائے گا پھر سمیہ کے گھر والے روٹھ جائیں گے اور ممکن ہے کہ اپنی توہین قرار دے کر شادی ہی نہ کریں، والد بھی بہت برہم ہوں گے اجازت

لے کر جاؤں، تو جانے نہیں دیں گے۔ شکار کا بہانہ کر کے چلتا ہوں لیکن اگر تاریخ مقررہ تک نہ آیا تو سوچ لو کیا ہوگا؟ ـــــ ویسے تمہاری خاطر میں ہر بات کرنے کو تیار ہوں،

احمد خاں نے اسے اعتماد اور محبت کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، لیکن کیوں نہیں پہنچ سکو گے تاریخ مقررہ تک؟ ـــــ یہ شبہ کیوں ہے؟"

وہ بولا، بھئی مشہور ہے رفتن بہ ارادت، آمدن بہ اجازت، ہم کہیں جائیں تو اپنی مرضی سے جاتے ہیں، وہاں سے واپس آئیں تو ان کی مرضی کا تابع رہنا پڑتا ہے۔ ممکن ہے دولت خاں روک لے یا اس سے ملاقات نہ ہو۔ یا کوئی اور صورت پیدا ہو جائے!

احمد خاں نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا:

فکر نہ کرو ـــــ اگر ایسی صورت ہوئی، تو میں رک جاؤں گا۔ تم شادی کر کے دو چار دن رہ کر اور اپنے دل کی مرادیں پوری کر کے ہفتہ عشرے میں پھر واپس آجاؤ میں انتظار کروں گا ـــــ ویسے مجھے یقین ہے، ہم ایک ہفتہ میں واپس آجائیں گے۔

دونوں دوست دیپال پور پہنچے، لیکن وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، دولت خاں کے کیمپ میں ان کا پرجوش اور پرخروش استقبال ہوا، خود دولت خاں بھی کچھ بچھ گیا۔ اسے ان دونوں کی فراست و ذہانت اور شجاعت و لیاقت پر ناز تھا، اس کا خیال تھا اگر یہ دونوں میرے ساتھ ہوں، تو میں بہت کچھ کر سکتا ہوں، اسے امید تھی کہ یہ اسی لیے آئے ہیں کہ اس کے ساتھ رہ پڑیں، اس کا ساتھ دیں اور ابراہیم کی حکومت کا تختہ الٹنے میں اس کی رفاقت کریں۔

رات کو کھانے کے بعد، جب یہ گفتگو چھڑی تو احمد خاں نے اسے اپنی ساری رام کہانی سنائی، اور کہا:

آپ کا یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ رانا سانگا کو آپ زیر کر لیں گے، اس کی تیاریاں بے بنیاد نہیں، اور آپ کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ بابر صرف آپ کا دوست ہے۔ وہ رانا سانگا کا دوست بھی ہے، اور آپ کا یہ خیال بھی صحیح نہیں، کہ بابر کی واپسی کے بعد، آپ اس ملک کے فرماں روا بن جائیں گے کیونکہ رانا سانگا آپ کو ایسا نہیں کرنے دے گا۔

دولت خاں بڑی توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا، پھر اس نے پوچھا:

"تو کیا رائے ہے تمہاری؟"

وہ بے تامل گویا ہوا۔

"قوم کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ بڑھے ہوئے قدم پیچھے ہٹا لیجئے۔

"یعنی ـــــ

"یعنی یہ کہ واپس چلئے، ان خطرات سے ـــــ

"کون سے خطرات کی طرف اشارہ کر رہے ہو تم؟"

"رانا سانگا، اور بابر کے خطرات سے ابراہیم کو مطلع کیجئے اور اس کے حضور اپنے خدمات پیش کر دیجئے۔"

دولت خاں ہنسنے لگا۔ اس نے کہا:

"جی میرا بھی ایسا ہی چاہتا ہے تمہاری باتیں سن کر لیکن کیا تمہارا خیال ہے کہ ابراہیم میری سن لے گا؟ مجھے معاف کر دے گا؟ میری خدمات کو قبول کرے گا؟"

"ضرور کرے گا!"

"ہرگز نہیں کرے گا، یہ تمہارا لڑکپن اور نادانی ہے جو تم ایسا خیال کر رہے ہو۔ وہ سب سے پہلا کام جانتے ہو کیا کرے گا؟"

"بتائیے ـــــ

"سب سے پہلے وہ مجھے توپ دم کرے گا۔ اس کے بعد اسے جو کچھ کرنا ہوگا کرے گا اصل معاملہ میں !"

احمد خاں نے کہا " اگر ایسا نہ ہو تو آپ تیار ہیں ؟"

کچھ عرصہ متامل رہنے کے بعد دولت خاں نے جواب دیا ۔

" ہاں —

اور پھر تھوڑے سے تامل کے بعد گویا ہوا :

" اگر تم ضمانت دو تو میں انتہائی قدم اٹھا سکتا ہوں !"

احمد خاں اور گل خاں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے ۔

دولت خاں نے ان کا مفہوم سمجھ لیا، اس نے کہا :

" بابر اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا لشکر لے کر آیا ہے ، ایک چھوٹا سا لشکر اور عنقریب آنے والا ہے ، اس کے بعد وہ ابراہیم لودھی پر چڑھائی کر دے گا ۔

" اور فتح کرے گا اس چھوٹے سے لشکر سے ؟"

" ضرور کرے گا — اس کی فتح لشکر اور فوج کی رہین منت نہیں ہوتی ۔ اس کی قوت ارادی کی ہوتی ہے "

ذرا سے توقف کے بعد دولت خاں نے پھر کہا :

" وہ ضرور فتح کرے گا اور فتح کے بعد کیا کرے گا ، یہ خدا کے سوا کسی کو نہیں معلوم ، مگر میں اس کا ساتھ چھوڑ سکتا ہوں ، حالانکہ میرے ساتھ جانتے ہو وہ کیا کر چکا ہے !"

احمد خاں نے طنز کرتے ہوئے کہا :

" انعام دیا ہوگا ، جاگیر دی ہوگی ، وعدے کیے ہوں گے ، لطف و کرم شاہانہ کیے ہوں گے !"

اس طنز سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر دولت خاں نے کہا :

" ہاں یہ سب کچھ ہوا ہے ، اس نے میرے بیٹوں کو بھی تو نوازا ہے اور دولت و جاگیر کی سندوں دی ہے ، لیکن میں ان سب چیزوں کو ٹھکرا دوں گا اگر —

احمد خاں نے سوال کیا :

" آپ گفتگو کرتے کرتے رک کیوں گئے بتائیے کیا شرط ہے آپ کی ؟

ایک ٹھنڈی سانس لے کر دولت خاں نے کہا :

" بہت معمولی —

احمد خاں نے پھر سوال کیا :

" کہئے تو سہی ممکن ہے وہ پوری ہو جائے !"

دولت خاں نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی اور گویا ہوا ۔

" ناممکن — لیکن کہے دیتا ہوں — شرط یہ ہے کہ ابراہیم رانا سانگا سے قطع تعلق کر کے حلف اٹھائے کہ وہ اس سے کسی طرح کا خفیہ یا علانیہ تعلق نہیں رکھے گا ، جب تک کہ جب تک بابر کو شکست نہیں ہو جاتی ، اس وقت تک وہ محل سے باہر نہیں نکلے گا اور میدان جنگ کی کمان مجھے سونپ دے گا ۔ وہ باہر آ آ کر ... کام بگاڑ رہا ہے ، نخوت اور تکبر سے بگاڑ رہا ہے اور میں اس کے جواب میں خدا کو حاضر ناظر جان کر حلف لوں گا ، اور عہد کروں گا کہ اگر میں اس سے غداری کروں ، بد عہدی کروں اور جنگ دشمن کا ساتھ دوں تو خدا کا غضب مجھ پر ، میری اولاد پر ، میری سات پشت پر نازل ہوگا ، اور اختتام جنگ کے بعد سارا کاروبار اسے سونپ کر گوشہ نشین ہو جاؤں گا ، بلکہ اپنے کنبہ اور خاندان سمیت حج بیت اللہ کو رخصت ہو جاؤں گا ، اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا ، تاکہ اسے مجھ سے کوئی خدشہ اور اندیشہ نہ رہے — کیا میرے خلوص کی انتہا نہیں ہے ؟

دولت خاں کی ان باتوں سے گل خاں اور احمد خاں بہت متاثر ہوئے انھوں نے

متفق اللفظ ہو کر کہا :
"آپ کا یہ جواب ہماری توقع سے کہیں زیادہ ہے ـــــ یہ جواب ایک بہادر ہی کا ہو سکتا ہے۔"
دولت خاں نے کہا "میں تم سے داد نہیں چاہتا ، بتاؤ ، کیا ابراہیم سے یہ فرمان منظور کرا سکتے ہو ؟"
احمد خاں نے کہا "قطعاً ـــــ"
دولت خاں نے کہا "تو جاؤ ، پروانہ منظوری لا کر مجھے دو ، گو مجھے اس کے حلف پر بھی یقین کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے ، لیکن میں بابر سے غداری کروں گا ، اس کی جاگیر ٹھکرا دوں گا ، اس کا غضب مول لوں گا اور تمہارے ساتھ چلا چلوں گا !"
دولت خاں کی ان باتوں سے دونوں دوستوں کو بہت زیادہ اطمینان ہو گیا ، پھر طے یہ پایا کہ گل خاں واپس چلا جائے ۔ بیگ کرشمہ دوکار ، شادی بھی کر آئے اور ابراہیم سے پروانۂ منظوری بھی لیتا آئے اور اس عرصہ میں احمد خاں بدستور دولت خاں کے پاس مقیم رہے ۔
گل خاں کو اس تجویز کی منظوری میں کیا عذر ہو سکتا تھا ، وہ فوراً واپسی پر تیار ہو گیا ، اور ہوا کے گھوڑے پر بیٹھ کر ساحل مقصود تک پہنچ گیا اس کی شادی ہو گئی ، اسے سمیہ مل گئی ، اس نے اپنی مراد پالی ـــــ
جب سے وہ آیا تھا ابراہیم سے ملنے کی کوشش کر رہا تھا وہ اپنی مصروفیتوں کے باعث اب تک اسے شرف باریابی عطا نہیں کر سکا تھا ، لیکن آج اس نے دربار خاص میں اسے مدعو کیا تھا ،
گل خاں کو یقین تھا کہ وہ پروانۂ منظوری لے کر آئے گا اور صبح ہوتے ہوتے دولت خاں کے پاس روانہ ہو جائے گا اس نے سمیہ سے اجازت حاصل کر لی تھی ۔

(۱۱)

دربار لودھی کا کروفر

گل خاں ٹھیک وقت پر قصر شاہی میں پہنچ گیا اور فوراً ہی ابراہیم لودھی کے دربار خاص میں پہنچا دیا گیا ۔
دربار کا کروفر اور شان و شوکت اور جاہ و جلال دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں ، وہ ابھی دولت خاں کے پاس سے آ رہا تھا ، بابر سے ملنے کا تو اسے موقعہ نہیں ملا تھا لیکن اس کا کروفر بھی اس کی نظر میں تھا لیکن جو بات یہاں تھی وہ وہاں کہاں ؟ یہ ایک جمی جمائی سلطنت تھی جسے کسی چیز کی کمی نہ تھی ، نہ فوج و سپاہ کی ، نہ ساز و سامان جنگ کی ، نہ مال و زر کی ، اور نہ وسائل و ذرائع کی ، اور وہ ایک چھوٹی سی سلطنت کا فرماں روا تھا ، جو اب تک زمانے کی ٹھوکریں کھاتا رہا تھا ، جسے اب تک زندگی میں ایک دن بھی چین کا نصیب نہیں ہوا تھا جسے گیند کی طرح قسمت اچھال کبھی ادھر ، کبھی ادھر ، کبھی یہاں ، کبھی وہاں ، کبھی فتح ، کبھی شکست ، کبھی فرار کبھی قیام ، کبھی فاقہ ، کبھی خوان شاہی ، کبھی بے یار و مددگار ، کبھی تاج دار و شہریار ، کبھی پشت ، کسی پہلو قرار نہیں ، شب و روز کی طرح اس کی حالت بھی بدلتی رہتی تھی ، کبھی دن ہے ، کبھی رات ، کبھی سکھ ہے ، کبھی دکھ ۔

گل خاں کو یقین ہو گیا ، دولت خاں کی امداد و اعانت ، رانا سانگا کی رفاقت اور تعاون کے باوجود بابر کامیاب نہیں ہو سکے گا ۔

اس نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا ، بابر کا لشکر ، پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ، دوسرا جو آ رہا ہے وہ بھی کم و بیش اتنا ہی ہو گا ، اور ابراہیم کے پاس مسلح ، ہر طرح کے ساز و سامان سے لیس لشکر کی تعداد فی الحال ایک لاکھ سے زیادہ ہے اور ذرا سی کوشش سے اس میں مزید اور خاصا اضافہ ہو سکتا ہے ۔

دل ہی دل میں یہ سوچ کر وہ بڑی حد تک مطمئن ہو گیا ، اسے اطمینان ہو گیا کہ کچھ بھی ہو دولت خاں اور رانا سانگا کی متحدہ کوشش بھی بابر کو کامیاب نہیں کر سکتی ۔ اسے شکست ہو گی اور شاید ایسی ذلت بخش شکست کہ پھر وہ ادھر کا رخ ہی نہیں کرے گا ——— بشرطیکہ جان سلامت لے جانے میں کامیاب ہو گیا ۔

گل خاں کو اس میں بھی شبہ تھا کہ بابر یا اس کی فوج کا کوئی سپاہی زندہ اور سلامت واپس جا سکتا ہے !

وہ سوچنے لگا ، لیکن اس کے باوجود اگر دولت خاں کا تعاون ، اور اشتراک عمل ابراہیم کو حاصل ہو جائے تو حرج کیا ہے ؟

دولت خاں کی فنون جنگ میں مہارت کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے ، حتیٰ کہ اس کے بدترین دشمن تک !

ابراہیم کے پاس سب کچھ ہے مگر ، دولت خاں جیسا سالار فوج نہیں ، یہ بہت بڑی کمزوری ہے ، یہ اگر رفع ہو جائے ، تو ہم قسمت سے بھی لڑ سکتے ہیں ، بابر کیا چیز ہے ؟

لیکن کیا ابراہیم اس کے لیے تیار ہو جائے گا ؟"

دل سے صدا آئی ، ضرور تیار ہو جانا چاہیے اسے آخر اس میں حرج ہی کیا ہے !

دولت خاں کے آجانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ ابراہیم ان بد اندیش ندیموں اور مصاحبوں سے محفوظ ہو جائے گا ، جنھوں نے اسے عیش و عشرت میں مبتلا کر رکھا ہے اور جو نہیں چاہتے کہ اس کی حکومت مستحکم ہو ، اور وہ شان و شکوہ کے ساتھ حکومت کر سکے ۔ اگر دولت خاں یہاں آجائے تو یہاں کا رنگ ہی بدل جائے گا یہ شاندار حکومت جو سطوت و شوکت اور قوت و طاقت اور وسائل و ذرائع میں اپنا جواب نہیں رکھتی ، اس کے آنے کے بعد اور زیادہ مستحکم ہو جائے گی ۔

پھر بابر کو بھی شکست سے دوچار ہونا پڑے گا اور رانا سانگا بھی اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا ، اور کوئی حریف میدان میں نہیں رہ جائے گا پھر یہ حکومت جسے ہمارے آباد و اجداد نے خون پانی ایک کر کے قائم کیا ہے ایک نامعلوم مدت تک قائم رہ سکے گی ۔

---

(۱۴)

ابراہیم لودھی

ابراہیم لودھی اپنے مصاحبوں، اور ندیموں کے جھرمٹ میں بیٹھا تھا، اور گل خاں آداب اور کورنش بجا لانے کے بعد ادب سے سر جھکائے کھڑا تھا، ابراہیم نے ایک نظر اس کے سراپا پر ڈالی اور کہا:

"گل خاں کیا چاہتے ہو تم؟ —— ہماری نظر میں تمہارے خاندان کی وقعت ہے۔ وہ ہمیشہ ہمارا وفادار رہا ہے۔ تمہارے خاندان میں کبھی کوئی دولت خاں نہیں پیدا ہوا اور ہمیں امید ہے ایسا کبھی ہوگا بھی نہیں ——

گل خاں کا دل لرزنے لگا، اس نے سوچا یہ تو بسم اللہ ہی غلط ہوئی، دولت خاں کے بارے میں اس کی برہمی کا یہ عالم ہے تو آگے بات کیا چل سکے گی؟

لیکن فرض اسے اکسا رہا تھا، اس نے سوچا نتیجہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، دل کی بات زبان پر لے ہی آنی چاہیے۔

اس نے ادب کے ساتھ عرض کیا:

"جہاں پناہ کو علم ہو گیا ہوگا کہ بابر اقلیم ہند پر حملہ آور ہونے کا فیصلہ کر چکا ہے؟"

ابراہیم نے حقارت کے ساتھ کہا۔

"بابر؟ —— ہاں ہم نے سنا ہے، یہ وہی شخص ہے جسے اس کے اہل خاندان نے کان پکڑ کر نکال دیا جسے اس کی قوم نے اگر تاج دیا تو چھین بھی لیا —— اگر قسمت آزمائی کے لیے وہ یہاں آنا چاہتا ہے تو ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ ہماری فوج بھی اس کی فوج کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہے۔

گل خاں نے عرض کیا،

بجا ارشاد ہوا —— بے شک وہ منہ کی کھائے گا اور شاید اپنی جان بھی سلامت نہیں لے جا سکے گا۔

کئی ندیموں اور مصاحبوں نے متفق اللفظ ہو کر کہا:

"بے شک، بے شک —— وہ یہاں مرنے آیا ہے، اسے تخت حکومت نہیں مل سکتا، ہاں گوشہ قبر ضرور مل جائے گا؟"

ابراہیم کو غصہ آ گیا، اس نے بادل کی طرح گرجتے ہوئے کہا:

"نہیں اسے گوشہ قبر بھی نہیں مل سکتا —— اس کی لاش کی تشہیر کی جائے گی چہرہ شارع عام پر لٹکا دی جائے گی۔ پھر اسے گدھ اور چیل کوے مزے لے لے کر کھائیں گے۔

سب لوگ سہم گئے اور ان سب لوگوں میں خود گل خاں بھی تھا، ایک ندیم نے عرض کیا:

"بے شک وہ اس سلوک کا مستحق ہے، لیکن دولت خاں بھی اسی سلوک کا مستحق ہے۔ وہ غدار ہے، نمک حرام ہے، وہ اس کا سزاوار ہے کہ اس کی لاش سرکاری کتوں کے سامنے ڈال دی جائے۔ اس نے ہمارے آقائے ولی نعمت کو دھوکا دیا ہے، وہ جا کر بابر سے مل گیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ بابر کو یہاں بلا لائے گا۔ بابر اسے اپنا وزیر اور ندیم بنا لے گا۔ اسے انعام و اکرام سے

نوازے گا، اسے جاگیر دے گا، اسے مالا مال کر دے گا!"

گل خاں نے کہا "بے شک یہ امر واقعہ ہے۔ بابر ان سب باتوں کا اس سے وعدہ کر چکا ہے بلکہ اسے اور اس کے بیٹوں کو جاگیر کی سند بھی دے چکا ہے۔"

ابراہیم اس سے زیادہ نہ سن سکا اس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

"تم کیا جانو؟ تمہیں کیا علم ہے؟"

گل خاں نے کہا "میں اس کے پاس سے آرہا ہوں۔"

ابراہیم: تم اس کے پاس گئے تھے؟ اس نمک حرام کے پاس گئے تھے؟ — لیکن کیوں؟

گل خاں: جہاں پناہ میں اور احمد خاں مل کر اس کے پاس گئے تھے —

ابراہیم لودھی: احمد خاں بھی تمہارے ساتھ گیا تھا — لیکن مقصد کیا تھا؟ کیا تم دونوں بھی ہمارے خلاف سازباز کر رہے ہو؟ ہمارے دشمن کے شریک اور ہمدم ہو؟

ایک مصاحب نے زہر خند کرتے ہوئے کہا۔

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے — اچھا میاں گل خاں تم بھی اپنی حسرت نکال لو، بے شک یہ ایک وقت ہے، لیکن گزر جائے گا، مگر یہ یاد رہ جائے گا کون غدار تھا کون وفادار، کس نے تخت شاہی کے لیے جان قربان کر دی، اور کون تخت شاہی کا حریف تھا؟ کس نے اپنے بادشاہ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، اور کون دشمن سے انعام و اکرام کے لالچ میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ ابھی وقت ہے، فیصلہ کر لو، کدھر جانا ہے تمہیں؟

---

(۱۳)

گل خاں کے تیور

بڑی مشکل سے گل خاں یہ زہر میں بجھی ہوئی باتیں سن سکا، لیکن جب اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو اس نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا:

"ہاں میں جانتا ہوں کون وفادار ہے اور کون غدار — میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب وقت آئے گا، تو آپ یا بابر کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے ہوں گے یا کسی دور دراز گوشہ میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ داد عیش دے رہے ہوں گے لیکن میں —"

گل خاں نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"لیکن میں یا تو میدان جنگ سے کامیاب اور سرخ رو واپس آؤں گا ورنہ دشمنوں کے ڈھیر میں میری بھی لاش دبی پڑی ہوگی، گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندی ہوئی، زخموں سے چور چور۔

آں نہ من باشم کہ روز جنگ بینی پشت من !

آں منم کندر میان خاک و خوں بینی سرے !

ابراہیم ان باتوں سے متاثر ہوا۔ اسے احمد خاں اور گل خاں کے خاندان

کی خدمات کا احساس تھا، اور وہ ان خدمات کا قدردان بھی تھا۔ یہ خاندان صرف وفادار تھا، امورِ سیاست، درباری سازش، ایچ پیچ سے انھیں کوئی واسطہ اور تعلق نہ تھا، اس لیے ابراہیم خاص طور پر ان کی قدر و منزلت کرتا تھا۔

اس نے کہا:

"گل خاں ہمارے دل میں تمہاری اور تمہارے خاندان کی قدر ہے۔ ہم ایک لمحہ کے لیے بھی تصور نہیں کر سکتے کہ تم ہمارا ساتھ چھوڑ سکتے ہو، ہمیں یقین ہے کہ جنگ کے میدان میں تم بہادری اور شجاعت کے جوہر ضرور دکھاؤ گے، بالکل یہی خیال ہمارا احمد خاں کے بارے میں بھی ہے، لیکن ہم یہ ضرور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ تمہارا دولت خاں سے کیا تعلق ہے؟ احمد خاں اور دولت خاں کے مابین کس طرح کا تعلق ہے؟

گل خاں نے کہا:

"غلام سب کچھ بتانے کو تیار ہے، لیکن، ——

ابراہیم نے تیوری چڑھا کر سوال کیا:

"لیکن کیا؟ کچھ تامل ہے تمہیں بتانے میں؟

گل خاں نے کہا، ہرگز نہیں آقائے ولی نعمت، لیکن میں ان لوگوں کے سامنے وہ راز نہیں افشا کرنا چاہتا، جو حد درجہ اہم ہے اور جس کا افشا کرنا غیر معتمد لوگوں کے سامنے میں مناسب نہیں سمجھتا۔

ابراہیم نے حیرت بھری نظروں سے گل خاں کی طرف دیکھا اور گویا ہوا:

"کس پر شبہ ہے تمہیں؟"

گل خاں نے جواب دیا:

"ان تمام لوگوں پر جو اس وقت یہاں موجود ہیں!

"لیکن یہ ہمارے ہر وقت کے مصاحب اور ندیم ہیں۔

"غلام کو یہ حقیقت معلوم ہے۔"

"پھر بھی تم ان کے سامنے لب کشائی نہیں کرنا چاہتے؟

"آقائے ولی نعمت یہی بات ہے۔"

کچھ دیر تک ابراہیم متامل رہا، پھر دفعتہً اس کے منہ سے نکلا حلوت

اور یہ سنتے ہی یہ سب مصاحب اور ندیم اس طرح غائب ہو گئے جیسے چھتری پر سے کبوتروں کا غول اڑ جاتا ہے۔

ان سب کے چلے جانے کے بعد ابراہیم نے مسکراتے ہوئے کہا:

"اب تو مطمئن ہو گئے تم؟"

گل خاں نے جواب میں عرض کیا۔

"اب غلام وہ سب کچھ عرض کرے گا جسے گوش گزار کرنے کے لیے وہ حاضر ہے۔"

ابراہیم نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ کہا۔

"تو پھر جلد شروع کرو اپنی داستان ہمارا اشتیاق بڑھتا جا رہا ہے۔"

گل خاں نے احمد خاں کے رانا سانگا کے پاس جانے وہاں نظر بند ہونے، پھر وہاں سے واپس آنے، اور افہام و تفہیم کے لیے دولت خاں کے پاس جانے اور وہاں اس سے گفتگو کرنے اور اس بات چیت کے جواب میں اس کی پیش کش کا تفصیل سے تذکرہ کیا۔

ابراہیم غور اور توجہ سے یہ باتیں سنتا رہا، پھر اس نے کہا:

"تو یہ ہے صورت احوال کیوں؟"

گل خاں نے بغیر کسی تامل کے جواب دیا:

"آقائے ولی نعمت یہی بات ہے!"

ابراہیم نے سوال کیا۔

"تمہاری کیا رائے ہے اس سلسلہ میں؟"

گل خاں کو کسی حد تک ابراہیم کا رجحان معلوم ہو چکا تھا۔ مگر اس نے ہمت کر کے جواب دیا:

"جہاں پناہ غلام کی اور احمد خاں کی پختہ رائے ہے کہ اس کی پیش کش قبول کر لینا چاہیے۔"

ابراہیم نے پوچھا "کیوں قبول کر لینی چاہیے؟ — کیا تمہارا خیال ہے بابر ہمیں شکست دے سکتا ہے؟"

گل خاں نے عرض کیا، غلام کا یہ خیال تو نہیں ہے، لیکن یہ خیال ضرور ہے کہ اگر دولت خاں کے ہاتھ میں فوج کی کمان ہو تو آسانی سے پانسا پلٹ سکتا ہے بابر اور رانا سانگا دونوں کو شکست دی جا سکتی ہے۔

ابراہیم نے ہنستے ہوئے کہا:

"رانا سانگا کا ذکر نہ کرو، وہ ایک مچھر ہے، اسے ہم جب چاہیں مسل دیں گے بابر کی بھی ہمیں پروا نہیں ہے، وہ ایک ذرہ ناچیز ہے، جب چاہیں گے اسے پاؤں تلے روند ڈالیں گے۔"

رکتے رکتے گل خاں نے کہا:

"بے شک انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا لیکن —"

ابراہیم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

"لیکن ویکن کے چکر میں نہ پڑو — ایک بات شاید تم نہیں جانتے حالانکہ صرف تمہیں کو نہیں ہر شخص کو جاننی چاہیے۔"

گل خاں اشتیاق و انتظار کے ساتھ ابراہیم کی طرف دیکھنے لگا کہ وہ کونسی نئی بات بتاتا ہے۔

ابراہیم لودھی نے سراپا کبر و نخوت بن کر کہا:

"وہ بات یہ ہے کہ فتح و شکست فوج کی کثرت یا قلت پر اتنی منحصر نہیں ہوتی جتنی خدا کے عطا کیے ہوئے اقبال پر منحصر ہوتی ہے۔"

گل خاں نے تائید کی "بے شک، جہاں پناہ نے درست اور بجا ارشاد فرمایا۔"

ابراہیم نے اور زیادہ رعونت کے ساتھ کہا:

"اور وہ اقبال ہمارے ساتھ ہے بابر کے ساتھ نہیں ہے!"

گل خاں ابراہیم کا منہ تکنے لگا، ابراہیم نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

"ہم آج تک کسی جنگ میں نہیں ہارے، آج تک کوئی دشمن ہم پر غالب نہیں آ سکا حالانکہ ہمارے دشمن کم نہیں ہیں — کیا سمجھ گئے تم؟"

گل خاں کو جواب دینا پڑا،

"بے شک عالیجاہ، بجا ارشاد فرمایا آپ نے، واقعہ یہی ہے۔"

ابراہیم نے گاؤ تکیہ سے ٹیک لگاتے ہوئے اطمینان کے ساتھ اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اور بابر؟"

اور پھر خود ہی گویا ہوا۔

اور بابر کا حال کیا ہے؟ اس کی جتنے سال کی عمر ہے اس سے زیادہ تعداد میں شکستیں کھا چکا ہے وہ ایک طالع آزما شخص ہے وہ یہاں بھی شکست کھائے گا۔ اور ایسی شکست کھائے گا جو آخری ہوگی — یعنی اس کے بعد، وہ کبھی میدان جنگ کا رخ نہیں کرے گا، کیونکہ جہنم میں پہنچ چکا ہوگا۔

گل خاں یہ باتیں سر جھکائے سنتا رہا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ابراہیم نے آمد سخن میں کہا:

"تم اور احمد خاں ابھی نوعمر ہو، ناتجربہ کار ہو۔ یاد رکھو، راناسانگا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، بابر ہرگز ہرگز ہمیں شکست نہیں دے سکتا۔ ہم کسی سے بھی میدان جنگ میں شکست نہیں کھا سکتے لیکن ——"

لیکن کہہ کر ابراہیم رک گیا اور غور سے گل خاں کی طرف دیکھنے لگا کہ اس کی باتوں سے وہ کس طرح کا اثر قبول کر رہا ہے۔ پھر اس نے اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا:

"لیکن دولت خاں، ہمیں ہمارے محل میں شکست دے سکتا ہے۔"

گل خاں کو یہ بات کچھ ٹھیک سی معلوم ہوئی، وہ حیرت سے اپنے آقائے ولی نعمت کی طرف دیکھنے لگا۔

اور آقائے ولی نعمت نے فرمایا،

"اگر ہم اس کی پیش کش قبول کر لیں تو جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟"

اور قبل اس کے کہ گل خاں کوئی جواب دے خود ہی کہا:

"وہ ہم پر غالب آجائے گا۔ فوج اس کے تصرف میں ہوگی، خزانہ اس کے قبضہ میں ہوگا، وسائل و ذرائع اس کے پاس ہوں گے۔ ہم شاہ شطرنج بنے محل کے ایک گوشہ میں بیٹھے گنجفہ کھیل رہے ہوں گے —— کیا بڑی آسانی سے وہ کسی دن بھی ہمیں قتل نہیں کر سکتا؟ ہمیں ختم نہیں کر سکتا، یہ تاج شہریاری جو اس وقت تم ہمارے سر پر دیکھ رہے ہو کیا اس کے سر تک نہیں پہنچ سکتا؟ —— کیا تم اور احمد خاں یہ چاہتے ہو کہ ہم اپنے ہاتھوں اپنے پروانۂ قتل پر دستخط کر دیں؟ —— نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے۔ ہمیں تمہاری نیت پر شک نہیں ہے، لیکن یہ تجویز احمقانہ ہے۔"

---

(۱۴)

رسمِ وفا

گل خاں ابراہیم لودھی کے پاس سے بہت مایوس اور مغموم، دلگیر اور پریشان واپس ہوا، اسے امید تھی وہ اس کی تجویز قبول کرے گا، لیکن وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا اسے اپنی قوت و شوکت پر ضرورت سے زیادہ زعم اور فخر تھا، اس کا دل خود بخود بیٹھا جا رہا تھا کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے؟

لیکن ایک بات میں وہ پہاڑ کی طرح مستقل تھا۔

ابراہیم کی روش کتنی ہی غلط ہو، وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ وہ اس کے ساتھ غداری نہیں کر سکتا۔ وہ رسم وفا سے دست برداری نہیں اختیار کر سکتا اسے یقین تھا احمد خاں کا فیصلہ بھی یہی ہوگا۔

دل گرفتہ اور مایوس وہ دربار سے واپس آیا، اور سفر کی تیاریاں کرنے لگا۔ نیلم اس کے لیے چشم براہ تھی، وہ اپنے کلیجہ پر پتھر کی سل رکھ کر اسے اذن سفر دے چکی تھی، اپنی محبت وہ قوم کی پکار پر بالا نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

گل خاں جب یہاں سے گیا تھا، خوش خوش گیا تھا، آیا تو چہرہ اترا ہوا۔ یہ کیفیت دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی، دل میں طرح طرح کے وہم آنے لگے اس نے کہا

" کیا بات ہے آپ اتنے پریشان، سراسیمہ، اور حواس باختہ کیوں نظر آ رہے ہیں؟
—— جاتے وقت تو بہت خوش تھے، مگر اب اتنی دیر میں کیا ہو گیا؟

گل خاں نے پریشان لب و لہجہ میں کہا:

کوئی بات نہیں ہے سمیہ —— آج رخصت ہو رہا ہوں نہ تم سے؟ بس یہی پریشانی ہے۔ یہی صدمہ، کاش میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا سکتا —— سوچتا ہوں تمہارے بغیر یہ چند روز بھی کس طرح گزریں گے؟ —— جب تک تم دور تھیں، غم فراق کے باوجود ایک سکون سا رہتا تھا، اب ہمیشہ کے لیے میری بن چکی ہو۔ لیکن جب بھی عارضی جدائی کا وقت آتا ہے دل بے قابو سا ہونے لگتا ہے۔

ان باتوں میں محبت بھی تھی، خلوص تھا، سچائی تھی۔

لیکن تصنع بھی تھا بناوٹ بھی تھی۔

سمیہ سمجھ گئی ضرور کوئی خاص بات ہے، اور وہ بات تشویش انگیز بھی ہے لیکن یہ بتانا نہیں چاہتا۔

لیکن میں بھی معلوم کرنے پر اصرار کیوں کروں؟

میں اس کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟ کیا کام کر سکتی ہوں؟

یہی سوچ کر اس نے کہا:

" تمہارا کام یہ تھا کہ مجھے تسلی دیتے، نہ کہ ایسی باتیں کر رہے ہو جس سے میری طبیعت اور زیادہ پریشان ہو جائے۔

دفعتہً گل خاں سنبھل گیا، اس نے کہا:

" دل کی بات زبان پہ آ ہی جاتی ہے لیکن یقین کرو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

سمیہ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا:

" کب تک آ جانے کی امید ہے سچ سچ بتا ہے!"

وہ محبت کی نظروں سے گھورتا ہوا اسے بولا:

زیادہ سے زیادہ دس دن میں —— شاید اس سے بھی کم مدت میں!

سمیہ کہنے لگی، اپنے ساتھ اس مرتبہ بھائی صاحب (احمد خاں) کو ضرور لیتے آنا، پہلے کی طرح چھوڑ نہ آنا۔

گل خاں نے جواب دیا " ضرور لیتا آؤں گا، بلکہ اس کو لینے کے لیے تو جا رہا ہوں، لیکن اس وقت اس کی یاد کیسے آ گئی؟"

وہ بولی، عائشہ بہت پریشان ہے اس کی جدائی سے۔

" کیا وہ ملی تھی تم سے؟ —— یہاں تو آئی نہیں!"

" ہاں وہ نہیں آئی، میں خود چلی گئی تھی، بڑی اچھی اور بڑی پیاری سہیلی ہے میری —— اور بہن بھی! —— وہ بے حد پریشان ہے۔ اتنی دیر میں کتنی مرتبہ روئی۔ میں نے لاکھ لاکھ اطمینان دلایا کہ بس اب چند دن کا معاملہ ہے آتے ہی ہوں گے، لیکن اسے اعتبار نہ آیا —— بہت محبت کرتی ہے ان سے۔"

" کرتی ہوگی، لیکن کیا تم سے بھی زیادہ؟ —— کیا مجھ سے بھی زیادہ؟ کیا ہم دونوں کا بھی محبت میں کوئی حریف ہو سکتا ہے؟

سمیہ مسکرانے لگی وہ گویا ہوئی " ہمارا معاملہ تو دوسرا ہے، لیکن اس پر اس وقت بحث کرنے کا موقعہ کونسا ہے؟ مجھ سے اس کا رونا نہیں دیکھا گیا۔ بھائی صاحب آئیں گے تو اب کی ان سے ایسی لڑائی لڑوں گی کہ:

" دم دبا کر پھر وہیں بھاگ جائیں گے —— کیوں یہی مطلب ہے نا؟"

" بھئی خیر، آپ تو مذاق کرتے ہیں کسی کا درد دل کیا جانیں؟

گل خاں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا:

" سچ فرمایا جناب نے جیسے ہم تو درد دل کی لذت سے بالکل ناواقف ہیں"

——— آخر تم بھی تو ہو۔"

"میں کیا ہوں؟"

"کس بہادری کے ساتھ مجھے رخصت کر رہی ہو!"

"اس نے بھی اسی بہادری کے ساتھ رخصت کیا تھا، لیکن جب انھوں نے واپس آنے میں برسوں لگا دیئے تو بیچاری گھبرا گئی، اگر خدانخواستہ آپ وعدے پر نہ آئے تو میرا بھی وہی حال ہوگا جو اس کا ہے۔

---

(۱۵)

دولت خاں اور احمد خاں

بڑی دیر تک گل خاں اور بمبیہ میں باتیں ہوتی رہیں، پھر وہ اپنے سفر پر روانہ ہو گیا،

منزل مقصود کچھ بہت زیادہ دور نہ تھی، صرف تین دن میں پہنچ گیا۔

یہاں بابر کے لشکر میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ وہ دوسرا لشکر جس کا انتظار کیا جا رہا تھا، اور جو تقریباً دس بارہ ہزار سپاہ پر مشتمل ہے آ گیا ہے اور اب ان کی طرف سے جنگی تیاریاں پورے طور پر مکمل ہو چکی ہیں۔ گل خاں کو یاد آیا کہ ابراہیم کے پاس بابر سے کہیں زیادہ فوج و سپاہ ہے اور ساز و سامان جنگ بھی بکثرت ہے، لیکن وہاں اب تک کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی ہے۔

یہ خیال کر کے اسے ابراہیم کی غفلت اور بدقسمتی پر افسوس ہوا،

رات کو دولت خاں کے خیمہ میں پھر مجلس جمی،

گل خاں نے ساری داستان از اوّل تا آخر سنا دی، دولت خاں سب کچھ سنتا رہا، پھر اس نے کہا:

"ان میں سے کوئی بات بھی میرے لیے خلاف توقع نہیں ہے۔"

احمد خاں نے کہا، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ الفراق بینی و بینک
—— اب آپ کا راستہ اور ہے ہمارا، اور اب تک ہم دوست ہیں، لیکن میدانِ جنگ میں اگر آمنا سامنا ہوا تو دشمن کی حیثیت سے ہوگا۔

دولت خاں نے ایک آہِ سرد کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں میرے لیے اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔ ابراہیم مجھ پر اعتبار نہیں کر سکتا، میں اس پر نہیں کر سکتا!"

گل خاں نے کہا "تو پھر اب کیا ہوگا؟"

دولت خاں نے کہا "میں انتظام کیے دیتا ہوں، تم لوگ اس وقت روانہ ہو جاؤ —— میں نہیں چاہتا کہ بابر کو تم لوگوں کے یہاں موجود ہونے کی اطلاع ہو۔

احمد خاں نے کہا "اب ہمیں واقعی جلد رخصت ہو جانا چاہیے یہاں سے!"

دولت خاں نے افسردہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا:

"جاؤ، لیکن میری ایک بات گوش ہوش سے سنتے جاؤ۔"

احمد خاں سراپا گوش بن گیا۔ گل خاں بھی پوری توجہ سے اس کی بات سننے پر آمادہ ہو گیا۔

دولت خاں نے کہا "بے شک ہم بہترین دوست ہونے کے باوجود اگر میدانِ جنگ میں ملے اور اب اس کا قوی امکان ہے تو دشمن ہی کی حیثیت سے ملیں گے۔ میری اور ابراہیم کی صلح بھی اب نہیں ہو سکتی —— لیکن میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر بابر کو شکست ہو، اور ابراہیم جیت جائے تو مجھے خوشی ہوگی، جنگ کے میدان میں تم یا گل خاں اگر میرے ہاتھ سے مارے گئے، تو مجھے انتہائی صدمہ ہوگا، لیکن اگر میں تم دونوں میں سے کسی کی تلوار سے زخمی یا ہلاک ہوا تو مجھے خوشی ہوگی۔"

یہ کہتے کہتے دولت خاں جذباتی انسان بن گیا۔ وہ بے تابی کے ساتھ اٹھا

اور کہنے لگا، اس نے کہا:

"میں ابراہیم کا دشمن نہیں ہوں۔ وہ میرا دشمن ہے اور ظاہر ہے دشمن سے صلح نہیں ہو سکتی، لیکن یقین رکھو، مجھے اپنے وطن سے محبت ہے۔ مجھے اس خاندانِ شاہی سے محبت ہے جس کا میں نے اور میرے باپ دادا نے نمک کھایا ہے۔ یہ محبت کبھی اور کسی حال میں میرے دل سے نہیں جا سکتی —— لیکن بعض وقت قدرت کچھ ایسا کھیل کھیلتی ہے کہ آدمی وہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو اس کی مرضی نہیں ہوتی، میں بھی اس حالت میں گرفتار ہوں، پھر بھی خدا سے میری دعا ہے کہ پردۂ غیب سے وہ ظاہر ہو، جو ہم سب کے لیے خواہ کتنا ہی تلخ ہو، لیکن ہماری قوم کے لیے بہتر ہو۔
—— کہو آمین!"

سب نے مل کر آمین کہی، پھر دولت خاں نے گل خاں اور احمد خاں کو حفاظت کے ساتھ رخصت کر دیا۔

پانی پت کا میدان

○

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

(۱)

تخت یا تختہ

ابراہیم لودھی کو اطلاع ملی کہ بابر لاہور پر قابض ہو چکا ہے، بھیرہ میں اس نے پڑاؤ کیا ہے، دولت خاں وہیں ہے۔ حسن خاں میواتی جو اس کے مشہور سالاروں میں تھا، وہ بھی اس سے روٹھ کر اس طرف قصد کر رہا ہے۔

ابراہیم کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ بابر کے ساتھ کتنی فوج ہے۔ اس کا گمان تھا، وہ ایک لشکر گراں لے کر آ رہا ہے، اس نے بھی زور شور سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں، اور بہت مختصر سی مدت میں ایک لاکھ سوار اور ایک ہزار ہاتھی فراہم کر لیے اور خود بھی میدان جنگ کی طرف بڑھا۔

اس عرصہ میں ایک بہت ہی عجیب واقعہ پیش آیا۔

بابر کی کل فوج بارہ ہزار[1] سے زیادہ نہ تھی۔ اس لشکر کو لے کر ہندوستان فتح کرنے چلا تھا۔ ایک امید یہ تھی کہ رانا سانگا اپنا عظیم لشکر لے کر بہت جلد اس کی مدد کرے گا۔ اس نے اپنا ایلچی بھیج کر اس سے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی بابر نے

---

[1] یہ بالکل صحیح تعداد ہے، تمام مورخین اس پر متفق ہیں۔
ملاحظہ ہو تاریخ ہند از ذکاء اللہ

سرزمین ہند پر قدم رکھا، اور دہلی کی طرف کوچ کیا اس وقت وہ ہند کی راجدھانی آگرہ پر حملہ کر دے گا۔[1] اس دو طرفہ دباؤ کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ابراہیم لودھی اس طرح پس جائے گا جس طرح چکی کے دو پاٹ میں گیہوں پس جاتا ہے۔ بابر صادق القول شخص تھا جس سے جو وعدہ کر لیتا، ہر قیمت پر اسے نباہتا۔ رانا سانگا کے بارے میں بھی اس کا خیال یہی تھا۔ وہ اب تک بہیرہ میں اس لیے رکا ہوا تھا کہ رانا سانگا کے آگرے کی طرف بڑھنے کی خبر آئے تو وہ بھی اپنا بارہ ہزار کا لشکر لے کر دہلی کی طرف چل پڑے۔

لیکن جب ایسی کوئی اطلاع نہ ملی تو اس نے اپنے صلاح کاروں سے مشورہ لیا، سب نے رائے دی۔

"اتنی مختصر سی فوج لے کر اتنے بڑے بادشاہ پر چڑھ دوڑنا احتیاط اور مصلحت کے خلاف ہے، تقاضائے دانش یہ ہے کہ اپنے وطن واپس چلیے۔ ایک آدھ سال کی سعی و کوشش کے بعد ایک بڑا سا لشکر فراہم کیجیے اور پوری قوت سے ابراہیم پر حملہ کر دیجیے۔"

لیکن بابر ان لوگوں میں نہیں تھا جو قدم پیچھے ہٹانے کے عادی ہوتے ہیں وہ دیر میں فیصلہ کرتا تھا، لیکن جب ایک فیصلہ کر لیتا تھا تو اس پر چٹان کی طرح جم جاتا تھا۔

اس نے اپنے صلاح کاروں سے کہا:

"یہ نہیں ہو سکتا ہم اب ہندوستان فتح کر کے واپس جائیں گے یا پھر اسی سرزمین پر اپنی جان دے دیں گے۔"

بابر کے اس عزم نے اس کے ساتھیوں میں ایک نیا حوصلہ اور ولولہ پیدا کر دیا وہ بھی جام شہادت نوش کرنے پر تیار ہو گئے، کیونکہ بظاہر احوال جنگ جیت کر

---

[1] اپنی تزک میں بابر نے خود یہ واقعہ لکھا ہے۔

مرد بننے کا کوئی امکان نہیں تھا،

حوصلہ شکنی کے تمام سامان فراہم ہو چکے تھے۔ ایک طرف رانا سانگا نے پختہ ترین ں کے باوجود دھوکا دیا اور آگرے پر حملہ نہیں کیا۔ دوسری طرف دولت خاں کا رفیق اور دمساز بن کر آیا تھا، گل خاں اور احمد خاں کے جانے کے بعد کچھ بددل ہوا کہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ گو وہ ابراہیم کا ساتھ نہیں دے گا لیکن ابراہیم نگ بھی نہیں کرے گا۔

اس کے ذہن میں رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ اگر واپس چلا گیا، اور وہ ضرور واپس ئے گا، تو ابراہیم کے بعد، رانا سانگا حقیقتاً اس ملک کا مالک بن جائے گا وں کا وجود اس سرزمین سے مٹ جائے گا۔ اپنی جائز شکایات، اور ی کے باوجود وہ مسلمانوں کے قومی مفاد کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

وہ بابر کے پاس گیا، اور اس نے اپنے دل کی بات صاف الفاظ میں کہہ دی۔

اس کی اس صاف گوئی سے بابر بہت متاثر ہوا، اس نے کہا:

ہم تمہاری اس جرأت، اور حق گوئی کی قدر کرتے ہیں۔ اگر تم ہمارے ساتھ ابراہیم سے نہیں لڑنا چاہتے تو ہم تمہیں مجبور بھی کرنا نہیں چاہتے۔ ہم یہاں نا سانگا کے بھروسے پر آئے ہیں نہ تمہارے، ہمیں صرف خدائے واحد کی بھروسہ ہے، تم شوق سے کنارہ کش ہو جاؤ، ہمارے لیے یہ بہت ہے کہ ہم کے ساتھ مل کر ہم سے مقابلہ نہیں کرو گے۔ گو ہمیں کسی سے بھی مقابلہ کرنے اور ہچکچاہٹ نہیں ہے، لیکن دوستوں سے لڑتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے، دوست کہہ چکے ہیں، بہتر ہو کہ ہم تم آمنے سامنے نہ آئیں۔

دولت خاں نے یقین دلایا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس سے سر مو انحراف نہیں اپنی غیر جانبداری کا ثبوت دینے کے لیے اس نے کہا:

" اگر آپ کہیں تو میں لاہور چلا جاتا ہوں جو آپ کا مقبوضہ ہے وہاں رہ کر نہ میں ابراہیم کے کام آسکتا ہوں، نہ آپ کے خلاف کسی طرح کی دراندازی اور سازش کرسکتا ہوں۔ اگر ایسا کروں گا تو مجھے سزا بھی فوراً مل جائے گی۔"

بابر نے یہ تجویز منظور کرلی، اور اسے لاہور جانے کی اجازت دے دی، اور وہاں کے حاکم کو بھی صورت احوال سے اطلاع دے دی کہ وہ دولت خاں کی نگرانی رکھے۔

ان تمام کاموں سے فارغ ہوکر، اس نے ایک مرتبہ پھر رانا سانگا کو اس کا وعدہ یاد دلایا، لیکن اس نے جواب دینے کی بھی تکلیف نہیں گوارا کی کیونکہ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ بابر کی دوستی بھی اتنی ہی خطرناک ہے جتنی دوستی، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس سے فی الحال دور رہا جائے، اور ان دونوں — ابراہیم اور بابر — کو تن تنہا لڑنے دیا جائے پھر جنگ کے اختتام کے بعد، جب کچھ ہوگا دیکھا جائے گا، اور کوئی نئی پالیسی متعین کرلی جائے گی۔

دولت خاں کو لاہور بھیجنے اور رانا سانگا سے کامل طور پر مایوس ہوجانے کے بعد بابر نے اپنی مختصر سی فوج لے کر دہلی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

گو اس کے ساتھی اور سپاہی مایوس اور بددل، اور دل برداشتہ تھے، لیکن وہ اپنی جگہ پورے طور پر مطمئن تھا، اسے یقین تھا کہ اس جنگ میں اسے فتح ہوگی، اس کی قسمت کا ستارا چمکے گا اور اس کی زندگی کا نیا، اور شاندار دور شروع ہوگا۔

اب تک وہ چھوٹے چھوٹے شہروں، اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے لیے قسمت آزمائی کرتا رہا تھا۔ اب اس کے سامنے ایک نہایت وسیع اور عریض ملک تھا جو قدرتی ذخائر سے مالا مال تھا۔ اسے فتح کرلینے کے بعد وہ اطمینان سے اپنے مستقبل کی تعمیر کرسکتا رانا سانگا کا خیال صحیح تھا کہ بابر واپس نہیں جا سکتا۔ دولت خاں کا خیال غلط تھا کہ وہ واپس چلا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے دل ہی دل میں یہ اٹل اور قطعی

فیصلہ کرلیا تھا کہ اب اسے اس سرزمین میں رہنا ہے، واپس نہیں جانا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ ساتھیوں، اور رفیقوں کی ہر طرح کی مخالفت اور مزاحمت کے باوجود وہ اپنے فیصلہ میں کسی طرح بھی تبدیلی کرنے پر راضی نہیں ہوا، اس فیصلے کو بدل دینے کے معنی یہ تھے کہ وہ پھر چھوٹے چھوٹے ملکوں اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے لیے قسمت آزمائی کرتا پھرے، آج یہاں کل وہاں۔

اب تک وہ اسی طرح کی زندگی بسر کرتا چلا آرہا تھا، اور اب وہ اس زندگی سے سخت بددل ہوچکا تھا۔ اب کسی قیمت پر بھی اس زندگی کو اختیار کرنے پر وہ آمادہ نہیں تھا۔

اس نے اپنے لشکر میں منادی کردی کہ کل ہمارا کوچ دہلی کی طرف ہوگا ——

تخت یا تختہ — ۱

(۲)

جوشِ وفا

ادھر بابر دہلی کی طرف روانہ ہوا، ادھر ابراہیم ادھی کے جاسوسوں اور مخبروں نے اس کی اطلاع اسے پہنچادی۔

خبریں دیسے بھی اس کے کان تک پہنچ چکی تھیں لیکن جب باقاعدہ طور پر یہ اطلاع ملی کہ بابر اپنا لشکر لے کر دہلی کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس کے دل میں ایک اضطراب سا ضرور پیدا ہوا۔

اب تک جو لڑائیاں اس نے لڑی تھیں وہ زیادہ تر اسی سرزمین پر، اسی دیس میں، یہیں کے والیان ریاست، راجوں اور مہاراجوں سے، لیکن یہ لڑائیاں دوسری قسم کی تھیں۔

ہندوستان کے عوام خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ..... جو شخص ان کا بادشاہ بن جاتا اسے وہ عظمت کی نظر سے دیکھتے اور اس کے لیے جان قربان کرنے کو تیار رہتے چاہے خواہ اس کا مذہب کوئی بھی ہو۔

ابراہیم کو اور اس کے بزرگوں کو ان لڑائیوں کا تجربہ تھا لہٰذا ان لڑائیوں سے وہ ہراساں اور پریشان نہیں ہوتے تھے۔

لیکن اس مرتبہ معاملہ دوسرا تھا۔

اس مرتبہ جس شخص سے لڑائی ہونا تھی، وہ ایک بالکل دوسرے ملک کا بادشاہ تھا۔ اس کی فوج، اپنے خصائل، انداز جنگ اور اسلوب پیکار کے لحاظ سے الگ اور منفرد تھی۔

اس قوم سے اس بادشاہ سے جو لڑائی ہوگی وہ کیسی ہوگی؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں بہرحال ایک طرح کا تذبذب تھا۔

اپنی فوج کثیر اور کثیر تر ساز و سامان جنگ کے باوجود وہ پریشان ضرور تھا۔

لیکن یہ پریشانی بہت جلد رفع ہوگئی۔

احمد خاں اور گل خاں اس کے حضور میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے دولت خاں سے جو کچھ گزری تھی وہ ساری داستان سنادی، بابر کی جنگی تیاریوں کا ذکر بھی کردیا۔ رانا سانگا نے اس کے ساتھ جو وعدے کیے تھے۔ ان کی تفصیل بھی بیان کردی اور عرض کیا۔

اب وقت آگیا ہے کہ جہاں پناہ کی فوج ظفر موج آگے بڑھے اور قبل اس کے دشمن حملہ آور ہو اس کا قلع قمع کردیا جائے۔

بے ساختہ ابراہیم نے سوال کیا:

"بابر کی فوج کتنی ہے؟"

احمد خاں نے جواب دیا:

"بارہ ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔"

ابراہیم قہقہہ مار کر ہنس پڑا، اس نے کہا:

"ان مٹھی بھر آدمیوں سے وہ سلطنت ہند فتح کرنے چلا ہے؟"

گل خاں نے دست بستہ عرض کیا۔

"واقعہ تو یہی ہے ظل الٰہی۔"

ابراہیم نے طنز کرتے ہوئے کہا :

" معلوم ہوتا ہے وہ بھی احمق ہے ، اور اس کے صلاح کار اور ندیم بھی ۔

احمد خاں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا ۔

" بجا ارشاد ہوا جہاں پناہ لیکن بزرگوں کا قول ہے" دشمن نتواں بے چارہ وحقیر شمرد ـــــ دشمن بہر حال دشمن ہے ، اسے نظر انداز نہ کرنا چاہیے "

ابراہیم نے ہنستے ہوئے کہا :

" اطمینان رکھو ایسا نہیں ہوگا ۔ ہم اس دشمن کو کچل دیں گے ۔ ہمارے ایک ہزار ہاتھی اس کے بارہ ہزار سپاہیوں کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالیں گے ۔ ہمارے ایک لاکھ سپاہی جو بہترین آلات جنگ کے حامل اور بہترین ساز و سامان جنگ سے آراستہ ہیں اس کے بارہ ہزار سپاہیوں پر گر بھی پڑیں تو وہ کچل جائیں گے اور ان کا خاتمہ ہو جائے گا ـــــ ہم بابر سے نہیں ڈرتے ، لیکن ایک چیز نے ضرور ہمیں پریشان کر رکھا ہے ۔

احمد خاں نے سوال کیا :

" جہاں پناہ وہ کونسی پریشانی لاحق ہے ؟ کیا غلام اور نمک خوار اس کا مداوا نہیں کر سکتے ؟

ابراہیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ۔

" وہ ہے نعلی گھولنہ رانا سانگا ـــــ جو کبھی ہم سے ساز باز کرتا ہے ، کبھی بابر سے ، کبھی ہماری دوستی کا دم بھرتا ہے ، کبھی بابر سے رشتۂ وفا استوار کرتا ہے وہ بابر سے زیادہ سنگین اور خطرناک دشمن ہے ، اسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے "

گل خاں نے سوال کیا :

لیکن اس سے کیا اندیشہ ہے ظل الٰہی کو ؟ ـــــ کیا یہ خیال ہے کہ وہ آگرے پر

حملہ کر دے گا ـــــ ؟

ابراہیم نے پہلو بدلتے ہوئے کہا ،

" تم نے ٹھیک سوچا ، ہمیں یہی اندیشہ ہے ! "

احمد خاں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا

" اور واقعی یہ اندیشہ بے بنیاد نہیں ہے ۔ وہ ایک موقع پرست شخص ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے ۔ وہ حصول مطلب کے لیے ، کسی آئین کسی قانون کا پابند نہیں ہے وہ اپنی غرض حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے ۔ میں تو اسے دیکھ چکا ہوں ، اس کی قید میں رہ چکا ہوں ۔ اس کے طور طریقوں سے واقف ہو چکا ہوں ۔ لیکن ظل الٰہی نے اس خطرہ کے انسداد کے لیے کیا سوچا ہے ؟

گل خاں نے کہا ، " ظل الٰہی نے جو کچھ سوچا ہوگا بہتر ہوگا اور غلام صدق دل سے اس پر عمل کریں گے ۔

ابراہیم نے اعتماد بھری نظروں سے ان دونوں نوجوانوں کو دیکھا اور گویا ہوا

" ہمارے ذہن میں صرف ایک صورت آئی ہے ! "

گل خاں ، اور احمد خاں نے بیک آواز عرض کیا ۔

" ارشاد ہو ظل الٰہی ! "

ابراہیم نے کہا ہماری رائے یہ ہے کہ ایک لاکھ کا لشکر گراں اور ایک ہزار ہاتھی ہم میدان جنگ کا رخ کرتے ہیں اور فوج کی ایک بہت معقول تعداد ، جتنی تم کافی اور مناسب سمجھو ، تم دونوں کے سپرد کر جاتے ہیں ۔

احمد خاں نے سوال کیا ۔

" لیکن اس سے جہاں پناہ کا مطلب ؟ "

ابراہیم نے جواب دیا ۔

" ہمارا مطلب یہ ہے کہ تم دونوں آگرے کی حفاظت اور دفاع کے لیے حسبِ ضرورت فوج لے کر یہاں رہو۔ اگر راناسانگا حملہ کرے تو اسے دندان شکن جواب دو!

گل خاں نے وفاداری کے پورے جذبہ کے ساتھ عرض کیا:

" غلام کو جو فرض بھی سونپا جائے گا اس کے لیے بدل و جان حاضر ہے۔

لیکن احمد خاں خاموش رہا اسے چپ دیکھ کر ابراہیم نے کہا۔

" احمد خاں ہم تمہارا جواب بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

احمد خاں نے جواب دیا:

" آگرے کی حفاظت اور دفاع کے لیے گل خاں بہت کافی ہے۔ غلام تو اپنے آقائے ولی نعمت کے ساتھ میدان جنگ کا رخ کرے گا!"

ابراہیم نے سمجھاتے ہوئے کہا:

" لیکن گل خاں اکیلا کافی نہیں ہے؟

احمد خاں نے کہا:

" یوں تو جہاں پناہ جو حکم بھی دیں گے، غلام تعمیل کرے گا، لیکن اگر اس سے رائے پوچھی جائے گی تو وہی عرض کرے گا، جو دیانت داری کے ساتھ اس کا خیال ہوگا۔

احمد خاں کی باتوں سے ابراہیم متاثر ہوا، اس نے کہا:

" ہم تمہاری رائے کو وقعت دیتے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں تم فن سپہ گری میں یکتا ہو تمہارے جذبۂ اخلاص اور وفاداری کی بھی ہماری نظر میں عزت اور منزلت ہے۔ یہ احساس بھی ہے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ میدان جنگ میں اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کے لیے کہہ رہے ہو کیونکہ تم اپنے بادشاہ کے ساتھ رہنا چاہتے ہو۔ اس کے باڈی گارڈ کی حیثیت سے اپنے زائض انجام دینا چاہتے ہو —

کیوں یہی بات ہے نا؟

احمد خاں نے جواب دیا:

" بے شک ظلِ الٰہی یہی بات ہے۔"

ابراہیم نے اسے قدر کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

" لیکن جنگی مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ تم گل خاں کے ساتھ یہاں رہو۔

احمد خاں مچل گیا اس نے کہا:

" گل خاں غلام سے کم بہادر نہیں ہے۔ اسے اگر انکسار نہ سمجھا جائے تو وہ [...]ں کرے کہ گل خاں غلام سے زیادہ بہادر، زیادہ ماہر فنون، سپہ گری، زیادہ [...]و بینا، اور زیادہ چوکس شخص ہے۔

" مگر اس سے مطلب؟"

" مطلب یہ کہ وہ تن تنہا آگرے کی حفاظت کر سکتا ہے؟

" یہ تمہارا حسن ظن ہے، اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔"

" لیکن بھاڑ پھوڑنے کے لیے اس کے پاس فوج بھی تو ہوگی" — اور اگر رانا [...]کیا تو دہلی آگرے سے کونسی ایسی دور ہے، فوراً ہمیں اطلاع ہو جائے گی اور [...]ملہ کرتا ہے کہ ایک منزل کی تین منزلیں کرتا ہوا وہ آناً فاناً آگرہ پہنچ جائے گا۔

ابراہیم نے مسکراتے ہوئے کہا:

" [...]بڑے ضدی ہو، اپنی بات پر اڑے رہوگے — اچھا خیر اگر تم نہیں [...]تو ہم بھی اصرار نہیں کرتے۔"

احمد خاں خوش ہو گیا، اس نے کہا:

" ظلِ الٰہی کے اس احسان کا کس زبان سے غلام شکریہ ادا کر سکتا ہے۔"

ابراہیم نے کہا " لیکن ایک بات یاد رکھو، اگر راناسانگا نے اس طرف کا رخ کیا

تو پھر ——

"بے شک پھر غلام فوراً یہاں پہنچ جائے گا، اور گل خاں کی سالاری میں ہر وہ فرض ادا کرے گا جو اسے سونپا جائے گا۔"

ابراہیم نے ایک نظر گل خاں پر ڈالی، ایک احمد خاں پر، پھر کہا:

"تم دونوں کا یہ اخلاص ہمیں بہت پسند آیا —— گل خاں کو بھی جب موقع ملا ہے تمہارے بارے میں اس طرح کی محبت سے بھری ہوئی باتیں کرتا ہے۔"

گل خاں نے عرض کیا، لیکن اتنی نہیں جتنی احمد خاں کرتا ہے۔

ابراہیم نے مجلس خاص برخاست کرتے ہوئے کہا۔

"بہرحال اب یہ بات طے پا گئی تم ہمارے ساتھ چلو گے اور گل خاں یہاں رہے گا۔"

دربار برخاست ہونے کے بعد جب دونوں باہر نکلے تو گل خاں نے شکایت آمیز لہجہ میں کہا:

"یہ کیا حرکت تھی تمہاری —— ؟ —— تم میدان جنگ میں داد شجاعت دو گے اور میں عورتوں کی طرح یہاں بیٹھا رہوں گا۔"

---

(۳)

پانی پت

پانی پت!

خوں ریز، خوں آشام اور فیصلہ کن جنگوں کا میدان ——!

جہاں بہت سی لڑائیاں ابھی مستقبل کے پردے میں روپوش تھیں اور یہاں، آج ایک ایسی لڑائی لڑی جانے والی تھی جو ہندوستان کی قسمت پر سو سال تک اثر انداز رہنے والی تھی۔

پانی پت کے میدان میں آج برپا ہونے والی یہ جنگ اپنے اثرات تاریخ کے لحاظ سے بڑی اہم تھی کہ اس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا۔ اس کی قسمت پلٹ دی، اس کے حالات میں ایسا عظیم، غیر متوقع، اور گوناگوں تغیرات و کیفیات سے معمور انقلاب برپا کیا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں مشکل سے مل سکے گی۔

یہ طویل و عریض اور وسیع میدان جہاں یہ لڑائی لڑی جانے والی تھی، اس وقت صرف ایک میدان تھا۔ لیکن بہت جلد یہاں خون کی ندیاں بہنے والی تھیں، کٹے ہوئے انسانی سروں کے انبار لگنے والے تھے۔ ایک دوسرے

تاج شہریاری چھننے والا تھا، دوسرے کے سر پر رکھا جانے والا تھا، ایک پرشکوہ، باعظمت اور فلک مرتبت بادشاہ کی لاش کو خاک و خون میں لتھڑنا تھا، اور ایک دوسرے بادشاہ کو ایک مدت مدید کے بعد، نیا محل نیا خزانہ، نیا تاج، نیا تخت قدرت کی طرف سے عطا ہونے والا تھا

پانی پت!

یہ میدان، نہ جانے کب سے پیاسا تھا۔ لیکن اس کی پیاس پانی نہیں بجھا سکتا۔ یہ انسانی خون کا تشنہ ہے، یہ انسانی خون ہی سے سیراب ہو سکتا تھا۔

اور آج وہ دن آگیا کہ پانی کے بجائے انسانی خون سے یہ لالہ زار ہو، اور اس سے شادابی و رعنائی حاصل کرے۔

آج مدت کے بعد اس ویران و سنسان اور بے آب و گیاہ میدان کی قسمت جاگی ہے۔ آج ایک عرصہ دراز کے بعد ایک نامعلوم مدت کے بعد، اس کی آرزوؤں کے پورا ہونے کا وقت آیا ہے۔

اس میدان میں وہ معرکہ برپا ہونے والا ہے جو ایک بہت بڑے ملک کی اور ایک بہت بڑی قوم کی، قسمت کا فیصلہ صرف اس طرح نہیں کرے گا کہ ایک کا تاج دوسرے کے سر پر پہنچ جائے، ایک تخت سے محروم ہو جائے اور دوسرا پالے۔

یہ انقلاب جو اس جنگ کے نتیجہ میں رونما ہونے والا ہے صرف بادشاہت کی تبدیلی پر ختم نہیں ہوگا۔ اس کے اثرات زندگی کے ہر شعبہ پر پڑیں گے، دین پر، مذہب پر، روایات پر، تاریخ پر، تمدن پر، تہذیب پر، معاشرت پر، زبان، ادب، لٹریچر، رسم الخط، طرز ماند بود...، لباس، وضع قطع، انداز حیات، اصول پابندیٔ دستور، حکومت، نظم مملکت — ہر چیز پر!

اور یہ اثرات وقتی نہیں دیرپا ہوں گے۔ یہ اثرات صدیوں تک کسر و انکسار اور خجل و انفعال کے ساتھ جاری رہیں گے۔

آج اس میدان پر جو سورج چمک رہا ہے، آج اس میدان میں جو سورج غروب ہو رہا ہے، اس کے طلوع و غروب کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا، قیامت تک جاری رہے گا لیکن —

لیکن، اس سورج کی چشم تماشائی نے ایسا دور اس انقلاب کا اب تک کبھی نہیں دیکھا ہوگا — عاقبت کی خبر خدا جانے!

آئندہ بھی اس میدان میں جنگیں ہوں گی، معرکے برپا ہوں گے، تلواریں چمکیں گی۔ ہتھیاروں کی، اسلحہ کی، ساز و سامان جنگ کی نمائش ہوگی فیصلے ہوں گے، انقلاب ہوں گے، سب ہی کچھ ہوگا، لیکن، آج کا انقلاب، آج کا معرکہ، آج کا دن، اپنی نوعیت اور اثرات و نتائج کے اعتبار سے کچھ اور چیز ہے۔

یہ سب کچھ جو ہونے والا ہے، جو عنقریب رونما ہونے والا ہے، کسی کو نہیں معلوم، نہ حریف غالب کو نہ حریف مغلوب کو، نہ فاتح کو، نہ مفتوح کو، نہ ہندو کو نہ مسلمان کو، نہ ابراہیم لودھی کو نہ ظہیر الدین بابر کو نہ سنگرام یعنی رانا سانگا کو، نہ دولت خاں کو، نہ احمد خاں اور گل خاں کو، سب اپنی اپنی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ سب قسمت کے مہرے ہیں اور وہی چال چل رہے ہیں، جو شاطر تقدیر ان سے چلوا رہا ہے۔ یہی چال چلنے پر وہ مجبور ہیں۔

لیکن جب بساط الٹے گی جب کھیل ختم ہوگا، تب جو منظر آنکھوں کے سامنے ہوگا وہ — برتر از قیاس خیال و گمان و وہم ہوگا!

پانی پت کے میدان کی طرف دونوں فوجیں بڑھ رہی ہیں۔ ابراہیم کی بھی اور بابر کی بھی، ایک کے پاس لشکر گراں ہے، دوسرے کے پاس معمولی سی فوج۔ لیکن امید کی دولت دونوں کے پاس ہے، مایوس کوئی بھی نہیں ہے۔

ہر ایک اپنے حریف کو شکست دینے کی آرزو لیے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔ ہر ایک کو یقین کامل ہے کہ فتح اس کے قدم چومے گی، کامیابی کا سہرا اس کے سر بندھے گا۔ دشمن کو نیست و نابود کر کے سیم و زر کا انبار چھکڑوں پر بار کر کے وہ پھر وہیں واپس جائے گا، پورے جاہ و جلال، تزک و احتشام اور شان و شکوہ کے ساتھ جہاں سے آیا تھا۔

اور ان لڑنے والے، ان میں ایک ہارنے والے اور دوسرے جیتنے والے سپاہیوں کا دل بھی، خوشی سے حوصلے سے، امید سے معمور ہے۔ یہ سپاہی بھی، جو مرنے کے لیے آئے ہیں، شاندار زندگی کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ سب سے زیادہ نقصان انہی کو ہوگا۔ سب سے زیادہ یہی کٹیں گے، مریں گے، ہلاک ہوں گے لیکن فتح و کامرانی کے ثمرات میں حصہ لینے کے لیے بھی سب سے زیادہ بیتاب ہو رہے ہیں — مستقبل کے واقعات سے بے خبر، کیا کچھ واقع ہونے والا ہے۔ اس سے بالکل ناواقف — اور غافل بھی۔

---

(۴)

عزمِ صمیم

پانی پت کی طرف جب بابر بڑھا تو اس کی عادات، مزاج اور اخلاق میں عظیم تغیر رونما ہو چکا تھا اور یہ چیز اس حقیقت کو ظاہر کرتی تھی کہ وہ ہندوستان فتح کر لینے کا مستقل عزم کر چکا ہے۔

بابر کوئی مرد خدا رسیدہ نہ تھا، کوئی صوفی صافی نہ تھا، کوئی عبادت گزار اور زاہد شب زندہ دار نہ تھا، کوئی متقی اور پرہیزگار شخص نہ تھا۔

وہ ایک ایسے خاندان کا فرد تھا، جو گو مسلمان تھا، لیکن اسے اسلام سے اور اسلامی تعلیمات سے کوئی خاص عملی لگاؤ نہ تھا، دولت، ثروت، عزت، اختیار، اور اقتدار ہاتھ میں آنے کے بعد آدمی مسجد اور مصلے سے اتنی دلچسپی نہیں رکھتا جتنی نغمہ و سرود سے۔ رقص بے حجاب سے۔ عیش و عشرت سے بادۂ گلرنگ سے۔

بابر کا بھی یہی حال تھا۔ اس میں بھی بادشاہوں اور کج کلاہوں کے یہ تمام "اوصاف" بدرجۂ اتم موجود تھے۔ وہ عیش و عشرت کا حریص تھا، وہ نغمہ و سرود اور راگ رنگ سے غیر معمولی دلچسپی رکھتا تھا، اسے عیاشی سے بچا

پرہیز نہ تھا، وہ شراب بھی پیتا تھا، اور افیم سے بھی شوق رکھتا تھا۔ ارکان مذہب کی تعمیل سے اسے چنداں دلچسپی نہ تھی یہ دوسری بات ہے کبھی کبھار نماز پڑھ لے، روزہ رکھ لے۔ مسجد میں چلا جائے۔ یہ درحقیقت اتفاقات تھے، اس کی زندگی کے بندھے ہوئے، رچے ہوئے، مستقل معمولات نہ تھے۔

لیکن مرسہ سے جب وہ پانی پت کی طرف بڑھا، تو اس نے اپنے خدا سے عہد کیا کہ وہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کی کوشش کرے گا، اور اس عہد کا ثبوت اس نے یوں دیا کہ جام توڑ دیئے، شراب نذھادی اور نماز پابندی سے پڑھنے لگا۔

خدا پر اس کا اعتقاد کبھی کمزور نہ تھا لیکن عملی کمزوریاں اور بشری لغزشیں بدرجہ اتم موجود تھیں، اب اس نے کوشش کی کہ ان کمزوریوں اور لغزشوں سے بھی جہاں تک ہو سکے بچے۔

وہ ایک بہت بڑی مہم سر کرنے چلا تھا، وہ ایک بہت بڑے ملک کی تسخیر کا عزم لے کر اٹھا تھا، وہ ایک بہت بڑے تاجدار سے لڑنے اور اسے شکست دینے کا فیصلہ کرکے پیش قدمی کر رہا تھا، اس معرکہ میں کامیابی کی امید کم تھی، ناکامی، شکست، بلکہ ہلاکت کا امکان زیادہ تھا۔

جب یہ صورت تھی تو وہ اپنے خدا سے شرمسار ہو کر نہیں ملنا چاہتا تھا، وہ چاہتا تھا، اگر مرنا ہی ہے، تو شہید بن کر دربار الٰہی میں حاضر ہو، خونیں کفن شہید، اور اگر خدا اسے فتح دیتا ہے، وہ دشمن پر غالب آتا ہے تو پھر غازی کے خطاب کا اعزاز اسے حاصل ہوگا، یہ خطاب اگر شہید سے زیادہ نہیں تو اس کے قریب قریب بہرحال منزلت اور رفعت کے اعتبار سے ہے۔ اس نے شہید یا غازی بننے کا بہرحال فیصلہ کر لیا تھا اسے ابراہیم لودھی کی

حکومت، اور اس کے انداز و اطوار کا پورے طور پر علم ہو چکا تھا، وہ اچھی طرح محسوس کر رہا تھا، یہ حکومت مسلمانوں کے روشن مستقبل کی ضمانت نہیں بن سکتی، اس کے لیے ایک مضبوط تاجدار کی ضرورت ہے اور بغیر کسی انکسار کے اپنے بارے میں اسے یہ یقین تھا کہ وہ ایسا تاجدار ہے۔

اسے رانا سانگا نے جس مصلحت سے بلایا تھا، اور جس اندیشہ سے اب وہ اس کا ساتھ دینے سے گریز کر رہا تھا یہ بات بھی اس نے اپنی فراست اور دانشمندی سے محسوس کر لی تھی اور اس کا جواب بھی جو کچھ عملی طور پر دینا تھا اپنے دل میں اس کا فیصلہ کر لیا تھا۔

بابر نے جان لیا تھا، رانا سانگا اسے آلۂ کار بنا کر، زر و جواہر سے مالا مال کرکے لودھی کو شکست دلوانے کے بعد پھر کابل واپس کر دینا چاہتا ہے اور وہ بے غل و غش سارے ہندوستان پر حکومت کر سکے، لیکن بابر نے طے کر لیا تھا کہ اس کا یہ خواب اگر وہ زندہ ہے، اگر اسے کامیابی ہوتی ہے شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دے گا۔ ٹھیک ہے، وہ لودھی کو شکست دینا چاہتا تھا لیکن مسلمان قوم کو زک دینا نہیں چاہتا تھا۔ ملت اسلامیہ کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ لودھی سے زیادہ ملت اسلامیہ کی سربلندی اس کے پیش نظر تھی۔

یہی وجہ تھی کہ عملاً مسلمان بن کر وہ اس مہم کو سر کرنے کا متمنی تھا، شیخ کے سامنے بارہا اس نے ان پیش گوئیوں کا ذکر سنا تھا، جو حضرت خواجہ نے اس کی ولادت کے موقعہ پر جوش و خروش کے ساتھ کی تھیں۔

اب تک اتنی شکستوں، ناکامیوں اور طرح طرح کی مصیبتوں، اور ذلتوں کے باوجود جو میدان حیات میں ڈٹا ہوا تھا اور ہر ناکامی اس کے

سمند عزم پہ مہمیز کا کام کرتی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی۔

جیسے دل میں بیٹھا کوئی کہہ رہا ہو، حضرت خواجہ احرار کی پیش گوئی کا کوئی لفظ غلط نہیں ہو سکتا۔ میری زندگی، یہ ڈوبتا ہوا سورج ایک مرتبہ پھر ابھرے گا اور اس کی روشنی سے ساری دنیا کے بام و در جگمگا جائیں گے۔

اب تک جتنی لڑائیاں اس نے لڑی تھیں جتنی جنگیں اس نے کی تھیں جتنے معرکے اس نے سر کیے تھے یہ بہرحال محدود قسم کے تھے، ان میں کامیابی ہو بھی جاتی پھر بھی وہ ان پیش گوئیوں کا مصداق نہ بن سکتا جو حضرت خواجہ احرار نے اس کے لیے اپنی زبان فیض ترجمان سے دعا میں فرمائی تھیں۔

لیکن اب ہندوستان سامنے تھا!

ایک وسیع و عریض ملک، وسعت میں جس کا کوئی ثانی نہیں — جس کی زمین کو حق نے زر کا اثر دیا تھا۔ اب وہ زرخیز سرزمین نظر کے سامنے تھی۔

یہاں اگر کامیابی ہو جائے اسے اگر وہ فتح کر لے تو بلاشبہ وہ حضرت خواجہ احرار کی پیش گوئیوں کا صحیح مصداق بن سکتا ہے۔

اس کے دل میں اس خیال نے گھر کر لیا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ یہ پیش گوئیاں پوری ہوں اور وہ دنیا کے بہت بڑے تاج داروں میں شمار ہونے لگے۔

اسی اعتقاد اور یقین کامل نے اس میں ایک نیا عزم ایک نیا جذبہ، اور ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا تھا۔

اسی اعتماد اور یقین کامل نے اسے زیادہ اچھا مسلمان بننے کی طرف مائل کر دیا تھا۔

اور اب وہ ایک آہنی عزم کے ساتھ اپنا چھوٹا سا لشکر لے کر جسے وہ خود بھی بے حقیقت اور ناکافی اور بے مایہ سمجھ رہا تھا، آندھی اور طوفان کی طرح رواں دواں چلا جا رہا تھا۔

(۵)

شب خون

سرسہ اور پانی پت کا فاصلہ روز بروز کم سے کم تر ہوتا جا رہا تھا۔ آخر پانی پت کا میدان نظر آنے لگا۔ بابر اس میدان میں پہنچا اور جنگی لحاظ سے جو مقام زیادہ مناسب تھا اس پر اپنی فوجوں کو ترتیب دیا۔ دائیں جانب پانی پت کا قصبہ تھا اس لیے بابر کی فوج کا جو حصہ اس رخ پر تھا وہ قصبہ کی وجہ سے محفوظ تھا۔ بائیں جانب کھائیاں کھود کر اس میں درخت گرا کر رکاوٹ پیدا کر دی گئی۔ لشکر کے درمیانی حصہ کے سامنے بندھی ہوئی گاڑیاں اور آڑیں قائم کی گئیں۔ ان گاڑیوں پر آتش بار توپیں رکھی تھیں بندوقچیوں کو ان آڑوں کے پیچھے سے آگ برسانی تھی۔

توپ گاڑیوں اور آڑوں کا یہ سلسلہ تھوڑی تھوڑی دور جا کر ٹوٹ جاتا تھا اور اتنی جگہ خالی رکھی گئی تھی جس میں سے ڈیڑھ دو سو سپاہی بیک وقت باہر نکل کر دشمن پر حملہ کر سکیں۔ دائیں بائیں سواروں کے دستے متعین کیے گئے تاکہ موقع ملنے پر دشمن کے عقب میں پہنچ جائیں اور پیچھے سے حملہ کر سکیں۔

ابراہیم کی فوجیں بھی سیلاب کی طرح پانی پت کے میدان میں آپہنچی تھیں۔

ایک لاکھ انسانوں کا لشکر بابر کے چند ہزار سپاہیوں کے دل دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ بابر کی فوج کا دل بیٹھ گیا لیکن اس لشکر نے کوئی پیش قدمی نہ کی بلکہ ہفتہ بھر اطمینان سے پڑا رہا۔ بابر نے دشمن کی خاموشی سے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنے بندوبست میں لگا رہا۔

بابر اسی انتظار میں رہا کہ دشمن پیش قدمی کرے تو جنگ شروع ہو لیکن جب دشمن کی طرف سے کوئی حرکت نہ ہوئی تو ایک رات بابر نے دشمن پر شبخون مارا جس میں دونوں طرف سے کئی آدمی مارے گئے۔ اس واقعہ کے تیسرے دن ابراہیم کی فوجوں نے آگے بڑھنا شروع کر دیا اور بابر کے دائیں بازو کی فوج پر زبردست یلغار کر دی۔

بابر بہت قابل اور صاحب تدبر سپہ سالار تھا۔ میدانِ جنگ میں فوج کو لڑانا اس پر ختم تھا۔ وہ جنگ سے پہلے فوج کو ترتیب دے کر اس کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لیا کرتا تھا کہ اگر یوں ہوا تو کیا کرنا ہوگا؟ اور یوں ہوا تو پھر کیا صورت کی جائے گی۔ چنانچہ ہر لڑائی میں وہ ایک مضبوط دستہ محض اس لیے محفوظ رکھ لیا کرتا تھا کہ جس پہلو پر فوج میں کمزوری نظر آئے اس دستہ کو فوراً وہاں بھیج دے۔ چنانچہ جب ابراہیم کے لشکر نے دائیں بازو پر دباؤ ڈالا تو بابر نے محفوظ دستے کو فوراً اس مقام پر بھیج دیا اور سخت مقابلہ ہونے لگا۔ اس دستے کی مدد سے دائیں بازو کی فوج نے ابراہیم کے لشکر کی یلغار روک دی۔[1]

ابراہیم درحقیقت بابر سے اور اس کی فوج سے کھیل رہا تھا۔ جب تک وہ میدان جنگ میں پہنچا تھا۔ اس کا خیال تھا گھمسان کا رن پڑے گا ایک بادشاہ اپنے لشکر گراں کے ساتھ مدمقابل ہے۔ اسے شکست دینے میں

---

[1] ظہیر الدین بابر

پورا زور صرف کر دینا پڑے گا۔

لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ خود اس کے ساتھ ایک لاکھ فوج اور بابر کے ساتھ صرف تیرہ ہزار سپاہ ہے تو وہ مطمئن ہو گیا اس نے حقارت کے ساتھ احمد خاں کو مخاطب کر کے کہا:

"بس؟ —— یہی وہ مور و ملخ سا لشکر ہے جسے لے کر وہ ہمیں شکست دینے اور ہمارا تاج خسروی چھیننے آیا ہے؟"

احمد خاں نے جواب دیا:

"سپاہ تو اتنی ہی ہے، لیکن بابر خود بھی تو ایک لشکر گراں سے کم نہیں!"

ابراہیم کو غصہ آ گیا۔

"تم وفادار ہمارے ہو دم اس کا بھرتے ہو؟ تم جاں نثار ہمارے بنتے ہو... لیکن قصیدے اس کی شان میں پڑھ رہے ہو؟ —— کیا مقصد ہے تمہارا اس گفتگو سے؟ کیا تم ہمیں ڈرانا چاہتے ہو؟ کہیں تم دولت خاں، اور بابر کے جاسوس بن کر تو نہیں آئے ہو ہمارے ساتھ؟"

یہ سن کر دفعتہً غضب سے احمد خاں کا چہرہ تمتما اٹھا اس نے عرض کیا:

"جہاں پناہ غلام منافق نہیں ہے، اگر وہ بابر کا دوست ہوتا تو ہرگز واپس نہ آتا، علی الاعلان کھل کر میدان میں آتا اور حق رفاقت ادا کرتا۔ میں ایک سپاہی ہوں اور کوئی سپاہی نہ بزدل ہوتا ہے نہ جاسوس۔"

احمد خاں کی یہ گرم گرم گفتگو سن کر ابراہیم ذرا نرم پڑا، پھر اس نے دریافت کیا۔ "آخر مقصد کیا ہے تمہاری اس گفتگو کا؟"

احمد خاں نے جواب دیا:

اس تعداد پر تمام مورخین متفق ہیں۔

"علام کا فیصلہ صرف یہ ہے کہ ہمیں دشمن کو مہلت نہ دینی چاہیئے۔ نہ ہمیں دشمن کو ہیچ سمجھ کر اپنی طرف سے غافل ہو جانا چاہیئے۔

"کیا کرنا چاہیے پھر ہمیں؟ —— تمہاری رائے؟"

بے تامل احمد خاں کے منہ سے نکلا،

"حملہ" ——

ہمیں فوراً بغیر کسی تاخیر کے دشمن پر حملہ کر دینا چاہیے۔ اس میں ہمارا بھلا ہے، اور اس میں دشمن کی شکست مضمر ہے!

ابراہیم خاموش ہو گیا۔ اس نے احمد خاں کی بات کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی، وہ اس کی رائے سے متفق نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ چھوٹی سی فوج اتنا بڑا لشکر اپنے سامنے دیکھ کر خود ہی دہشت زدہ ہو جائے گی، اور اگر ہماری طرف سے جنگ میں تاخیر ہوتی رہی تو وہ حوصلہ ہار جائے گی۔

اور بات تھی بھی ایسی ہی۔ ابراہیم نے جو خیال بابر کی فوج کے بارے میں قائم کیا تھا وہ بالکل درست تھا، واقعی بابر کی فوج ہاتھیوں کے اس جم غفیر اور سپاہیوں کے اس دل دل کو دیکھ کر ہراساں ہو گئی تھی[1]، لیکن بابر کے بارے میں احمد خاں نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا، اور ابراہیم کی غلطی یہ تھی کہ اس نے اتنی ٹھوس حقیقت کو اہمیت نہیں دی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے ہی بابر نے یہ محسوس کیا کہ اس کی فوج حوصلہ ہارے دے رہی ہے فوراً ہی اس نے شب خون مارنے کا فیصلہ کر لیا اور اس طرح لڑائی کا خود بخود آغاز ہو گیا۔

---

[1] تاریخ فرشتہ اور دیگر کتابوں میں یہ مذکور ہے کہ بابر کی فوج شروع میں گھبرا گئی تھی۔

(۶)

ابراہیم لودھی کا قتل

ابراہیم کے لشکر کی یلغار روک دینا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بظاہر اس معمولی سے نے صورت حال بدل دی،

اور یہ سب کچھ ایسے انداز میں اتنی سرعت سے اور اس درجہ خلاف توقع ہوا کہ اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا،

اب افغانوں (ابراہیم کے لشکر) نے بائیں بازو کی طرف بھی حملہ کر دیا۔ دونوں پہلوؤں پر شدید جنگ شروع ہو گئی۔ چونکہ افغانوں کی تعداد بہت تھی اس لیے ان کے ہر حملہ پر بابر کے سپاہیوں کو سخت مصیبت کا سامنا اور وہ دب کر رہ جاتے۔ بابر نے بائیں بازو پر کھائیوں میں درخت ڈال کر ٹ تیار رکھی تھی دشمن کا لشکر اس رکاوٹ کو عبور کر کے حملہ آور ہو گیا۔ بابر کا ریلے سے سمٹ کر رہ گیا۔ بابر کی تیز نظریں میدانِ جنگ کا پورا مطالعہ تیں اس نے اشارہ کیا، چنانچہ سوار دستوں نے افغانوں کے عقب سے ان پر ۔ لشکر کے درمیان سے توپوں نے آگ برسانی شروع کر دی۔ تیر انداز تیروں کرنے لگے اور افغانوں کو اس طریقہ سے گھیر لیا کہ کثیر التعداد ہونے کے باوجود

قابو میں آ گئے۔ بابر کے لشکر نے چاروں طرف سے ایسا حملہ کیا کہ ان کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ اُن میں بدنظمی پھیل گئی۔ علی اور مصطفیٰ دو ماہر توپچی جو اس لشکر کے ہمراہ تھے۔ اُن کی قیادت میں توپیں موت برسا رہی تھیں، تلواریں چل رہی تھیں، بندوقیں داغی جا رہی تھیں۔ غرض عجیب قیامت کا منظر تھا۔ افغانوں کے کشتوں کے پشتے لگ گئے، ابراہیم سے جنگی ہاتھی جن پر اُسے بہت ناز تھا تیروں کا نشانہ بن کر اندھے ہو رہے تھے۔

دوپہر ہونے سے قبل ابراہیم کی فوج شکست کھا چکی تھی۔ پندرہ سولہ ہزار افغان مارے جا چکے تھے۔ باقی بھاگ نکلے تھے۔ ابراہیم کی فوج کی کثرت اور ہاتھیوں کی بدنظمی اُسے تباہ کرنے کا باعث بنی۔ ابراہیم بڑا بہادر اور جری شخص تھا آخر دم تک بہادری سے لڑتا رہا اور مارا گیا[1]

اتنی مختصر سی مدت میں اتنے بڑے لشکر کا خاتمہ، تاریخ کا عجیب و غریب حادثہ ہے۔

ابراہیم میں لاکھ خامیاں تھیں لیکن وہ نڈر، دلیر، بہادر اور مرد میدان تھا۔ اس جنگ میں جو دفعتہً اس پر مسلط ہو گئی تھی اس نے خود کوئی کمزوری نہیں دکھائی، آخر وقت تک لڑتا رہا، اور داد شجاعت دیتا رہا، آخر لڑتا ہوا مارا گیا۔ ایک بادشاہ کے لیے اس سے بڑھ کر فخر کی کوئی بات نہیں کہ وہ میدان جنگ سے راہ فرار نہ اختیار کرے۔ آخر وقت تک ڈٹا رہے، ابراہیم نے یہی کیا۔

احمد خاں بھی ابراہیم لودھی کے ساتھ اس کے دوش بدوش دلیرانہ اور مردانہ تلوار چلا رہا تھا، زخمی ہو رہا تھا، نڈھال ہو رہا تھا، لیکن بادشاہ کے پاس سے ہٹنا اسے گوارا نہ تھا۔ بادشاہ کو تنہا چھوڑنا اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا۔

---

[1] ظہیر الدین بابر

ابراہیم اسی وقت مارا گیا۔ حبیب احمد خاں زخموں سے چور ہو کر گھوڑے کی پیٹھ سے فرخ زمین پر گر پڑا تھا ——— شاید اپنی جان نثار کر کے!

---

(۷)

ابراہیم کا کٹا ہوا سر

ابراہیم لودھی کی شکست ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔

اور ابراہیم لودھی کا مردانہ وار لڑتے ہوئے قتل ہو جانا، اس سے بھی بڑا سانحہ تھا۔

اس شکست میں بے تدبیری کو بھی دخل تھا اور شومئی قسمت کو بھی۔ بے تدبیری کی انتہا یہ تھی کہ اتنی بڑی فوج ظفر موج کے ہوتے ہوئے بھی اس نے اپنی مقابل فوج پر جو بہت معمولی تعداد میں تھی حملہ نہیں کیا۔ وہ اسے صرف مرعوب کر کے میدان جنگ سے بھگا دینا چاہتا تھا۔ احمد خاں نے بہت صحیح مشورہ دیا تھا کہ دشمن کو فکر و اقدام کی مہلت نہ دی جائے اس پر کاری وار کیا جائے، اس کی قوت ٹوٹ جائے گی۔ اور وہ ختم ہو جائے گا لیکن ابراہیم کی خود سری تکبر اور نخوت نے اس صائب رائے کو نہیں قبول کیا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا اور شومئی تقدیر کی انتہا یہ تھی کہ جب لڑائی شروع ہوئی تو کثرت تعداد کے زعم میں ابراہیم کا لشکر صورت حالات کی پیچیدگی اور نزاکت کو ذرا بھی محسوس نہ کر سکا، وہ ایک ہجوم کی طرح دشمن پر حملہ آور ہوا۔ نہ اسے یہ علم تھا کہ کہاں رکنا چاہیے اور نہ یہ جانتا تھا

کہ حملہ یا پیش قدمی کس وقت کرنی چاہیے۔ اس نے پانی پت پہنچنے کے بعد سات دن مفت میں ضائع کر دیئے۔ اگر وہ آتے ہی حملہ کر دیتا تو شاید کیفیت کچھ اور ہوتی۔[1]

ابراہیم کے مقابلہ میں بابر کا لشکر بہت تھوڑا تھا مگر اس کی جنگی مہارت، لڑائی کی تدبیریں اور تجربہ کاری کام کر گئی۔ بابر نے اپنی آتش بار توپوں کے ذریعہ ابراہیم کے سواروں اور اس کے ہاتھیوں کے سامنے ایک ایسی دیوار کھڑی کر دی کہ وہ کسی طرح اُسے توڑ نہ سکے اور یہی ان کی ہلاکت کا باعث بنی۔ بابر کے لشکریوں کے دل بیٹھ گئے تھے مگر ان کے یکتا سپہ سالار کی جنگی قابلیت اور دانش مندی نے ان کے حوصلے بڑھا دیئے تھے۔

ابراہیم کا سر کاٹ کر بابر کے سامنے لایا گیا۔ ۲۷ اپریل ۱۵۲۶ء کو جمعہ کا دن تھا، اسی روز عام مسجدوں میں بابر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور ہندوستان کا تخت اس کے قدموں تلے آ گیا۔

فتح کے بعد بابر نے ہمایوں کو لشکر دے کر آگرہ بھیجا۔ ایک اور لشکر دہلی کے قلعہ اور خزانہ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا اور ان کے پیچھے خود روانہ ہوا۔ دہلی سے ہوتا ہوا آگرہ کی طرف چلا۔ ۱۰ مئی ۱۵۲۶ء کو عصر کی نماز کے وقت آگرہ میں داخل ہو گیا۔ ہمایوں نے آگے بڑھ کر باپ کا استقبال کیا اور دنیا کا وہ مشہور ہیرا نذر کے طور پر پیش کیا، جو "کوہِ نور" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ہیرا لودھیوں کے خزانے سے برآمد ہوا تھا۔ بابر کچھ زر و جواہرات سے ایسا سیر چشم تھا کہ ہیرا لینے سے انکار کر دیا۔ اس ہیرے کا وزن تین سو بیس رتی تھا اور دنیا کا سب سے قیمتی ہیرا سمجھا جاتا تھا۔ یہ ہیرا ہمایوں کو دے دیا گیا۔

---

[1] بابر نے اپنی کتاب میں اس لڑائی کا ذکر کرتے ہوئے خود بھی لکھا ہے کہ "ابراہیم ناتجربہ کار تھا اس نے مفت میں سات دن ضائع کر دیئے"۔

دہلی اور آگرہ پر قبضہ پانے کے ساتھ ہی وہاں کا تمام مال و خزانہ بابر کے قبضہ میں آگیا۔ خزانے میں اس قدر دولت تھی جس کا اندازہ نہ ہو سکتا تھا مگر بابر انتہا درجے کا دریا دل اور بے نیاز شخص تھا اس نے دولت کو جمع کرنے کا مطلق ارادہ نہ کیا اور اپنے فوجی افسروں، دوستوں، رشتہ داروں اور سپاہیوں میں دل کھول کر روپیہ تقسیم کیا، خراسان، کاشغر، ایران، کابل وغیرہ علاقوں میں اُس کے بہت سے دوست اور عزیز تھے، سب کو بیش بہا اور نادر تحفے بھیجے۔ مکہ اور مدینہ کے عالموں کو بھی بہت سی دولت دی، یہاں تک کہ کوئی ایسا شخص باقی نہ رہا جسے وہ جانتا ہو اور اُسے فتح کی خوشی میں اس نے مالا مال نہ کر دیا ہو۔ لڑائی میں جس قدر مالِ غنیمت ہاتھ آیا سب اپنے لشکر میں تقسیم کر دیا۔ کابل میں ہر مرد، عورت، بوڑھے، جوان کو فتح کی خوشی میں ایک ایک درم دیا گیا۔ اس فیاضی کے بعد جو کچھ باقی رہا وہ سلطنت کے انتظام، فوج کے اخراجات اور رعایا کی ضروریات کے لیے خزانہ میں محفوظ رکھ لیا گیا۔

ابراہیم لودھی کی ماں کو سات لاکھ کی مالیت کا پرگنہ عطا کیا۔ اس کے علاوہ اسے رہنے کے لیے آگرہ کے قریب ایک محل بھی مرحمت کیا۔ اس کی ضروریات کا تمام سامان محل میں فراہم کر دیا۔ اور بڑی عزت سے اسے وہاں رکھا۔ ابراہیم لودھی کے امیروں کو بھی بابر نے بہت سا روپیہ اور جاگیریں دیں اور ہر طرح سے ان کی عزت افزائی کی۔

---

(۸)

احمد خاں کے قتل کا حکم

آگرہ اب بھی ہندوستان کا دارالحکومت تھا۔

ہندوستان پر اب بھی مسلمانوں کی حکومت تھی!

لیکن انقلاب آچکا تھا، تاجدار بدل چکا تھا، پہلے اس حکومت کا وارث اور مالک۔ ابراہیم لودھی تھا۔ اب تاج شہریاری بابر کے زیب سر تھا۔ پہلے یہ خزانہ یہ محلات و قصور، یہ زر و جواہر، یہ فوج کثیر، یہ والیان ریاست، یہ جاہ و حشم ـــــ یہ سب چیزیں ابراہیم کے لیے وقف تھیں۔ اب وہ عدم کو سدھار چکا تھا، بابر تخت خسروی پر بیٹھا نعرہ لگا رہا تھا ـــــ دور مجنوں گذشت نوبت ماست!

نظم و انتظام کی درستی، انعام و اکرام کی تقسیم، اور پورے قبضہ و تسلط کے بعد بابر کے حضور میں وہ قیدی پیش کیے گئے جو میدان جنگ میں گرفتار کیے گئے تھے۔

ان میں سے بہت سے قیدیوں کو بابر نے ازراہ رحم و کرم رہا کر دیا۔ بعض کو کچھ دنوں کے لیے نظر بند کر دیا، کچھ کی جائداد، املاک ضبط کر لی۔ یہ سب کچھ ان کے "جرائم" کے لحاظ سے ہوا، یہ وہ لوگ تھے جو آخر وقت تک۔ ابراہیم کے وفادار رہے تھے

اور اس کی حمایت میں بابری فوج سے لڑتے رہے تھے۔

لیکن ان میں ایک قیدی ایسا تھا —— صرف ایک —— جس کے لیے بابر نے قتل کا حکم صادر کر دیا۔

یہ احمد خاں تھا!

زخموں سے چور چور نڈھال، کمزور، نحیف زخم شمار کیے گئے تو سر و سینہ پر دست و بازو پر —— پیٹھ پر ایک بھی نہیں —— کم سے کم ۲۲ زخم تھے۔ بعض معمولی بعض کاری!

احمد خاں کو کئی سپاہی سہارا دیئے ہوئے کھڑے تھے کیوں کہ اس میں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں تھی!

بابر نے اس پر اور اس کے رستے ہوئے زخموں پر ایک نظر ڈالی اور کہا:

"تم بہادر معلوم ہوتے ہو؟"

اس نے جواب دیا "کوئی سپاہی بزدل نہیں ہوتا۔"

بابر کو اس بیباکانہ جواب پر حیرت ہوئی۔ اس نے کہا:

"تمہارا بدن تو زخموں سے چور ہو رہا ہے!"

اس نے جواب دیا "یہ زخم نہیں ہیں، میری وفاداری، ثابت قدمی اور جاں نثاری کے نہ مٹنے والے نقوش ہیں —— اور مجھے فخر ہے کہ میری پیٹھ پر ایک زخم بھی نہیں ہے۔ نہ تیر کا نہ پیکاں کا، نہ تلوار کا نہ نیزے کا۔"

یہ زخمی، یہ رنجور، یہ گھائل، یہ جراحتوں سے چور چور شخص جو کئی آدمیوں کے سہارے سے کھڑا تھا۔ جب اس کی زبان کھلی تو کتنی گرج تھی اس کی آواز میں، کتنا دبدبہ تھا اس کے لب و لہجہ میں بابر کو اس کی یہ ادا پسند آئی اس نے کہا:

"تم سچے ہو اور واقعی بہادری میں یکتا ہو —— لیکن تمہارے آقا نے حماقت کی

[...]سے موقع تھا کہ ہم پر پل پڑتا، لیکن نہ جانے کیوں وہ وقت ضائع کرتا رہا!

"واقعی یہ اس کی غلطی تھی۔ ورنہ میں نے رائے دی تھی کہ دشمن کو فکر و اقدام کا [مو]قعہ نہ دیا جائے۔ پہلے ہی ہلّے میں وہ دم دبا کر بھاگ کھڑا ہوگا۔

" (خشم آلود لہجہ میں) یہ تم ہماری فوج کے لیے کہہ رہے ہو؟"

"صرف فوج کے لیے نہیں، آپ کے لیے بھی!"

" (غضب ناک ہو کر) مگر تم خوش قسمت تھے کہ بچ گئے۔"

"آپ بھی خوش قسمت تھے کہ میری زد پر نہ آئے، ورنہ میں نے آپ کو خلد برین [کی] سیر کرا دی ہوتی۔

(بے انتہا برہم ہو کر) تم حد درجہ گستاخ ہو، تم اس قابل نہیں کہ زندہ رکھے [ج]اؤ۔ تمہاری سزا یہ ہے کہ قتل کر دیا جائے تمہیں!

"اگر موت مجھے ڈرا سکتی تو میدان جنگ کا رخ نہ کرتا، اور اگر جاتا تو راہ فرار [ا]ختیار کرتا۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ ایک مسلمان کی یہ شان نہیں کہ وہ موت [س]ے خائف ہو۔ حکم دیجئے جلاد کو، میری گردن کٹنے کے لیے بیتاب ہے۔"

" (نرم لہجہ میں) کیوں اتنے مایوس ہو؟"

"میں نے اپنے بادشاہ ذی جاہ سے آخر دم تک جاں نثار رہنے کا عہد کیا تھا [م]جھے شرم آتی ہے کہ اس عہد کو نباہ نہ سکا۔

"جس جاں نثاری کا تم نے اظہار کیا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔"

"کیا فائدہ ایسی جاں نثاری سے۔ آقا قتل ہو گیا اور میں زندہ ہوں" —— کاش [م]جھے اب بھی موقعہ مل جائے کسی طرح۔

"کس طرح کا موقعہ چاہتے ہو تم؟"

"قسمت کا فیصلہ صادر ہو چکا اب کیا ہو سکتا ہے (ٹھنڈی سانس لے کر)

قسمت کے سامنے بے بس ہو ہی جانا پڑتا ہے۔"

"ورنہ کیا کرتے تم؟ —— کیا ہمیں قتل کر ڈالتے؟"

"(ایک جذبہ اور جوش کے ساتھ) بے شک!"

بابر کی برہمی نقطۂ عروج پر پہنچ گئی، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا،

"قتل"

فوراً جلاّد بڑھا، میان سے اس نے چمکتی ہوئی تلوار نکالی فضا میں بلند کی، اور قریب تھا کہ ایک ہی وار میں قیدی کی گردن دھڑ سے جدا ہو کر زمین پر لوٹتی نظر آئے کہ بابر نے کہا:

"ٹھہرو ——"

جلاّد کا ہاتھ رک گیا، لیکن تلوار اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی، اور سر سے بلند تھی۔ بابر نے کہا:

"آج جمعہ کا دن ہے —— اور ہم جمعہ کے روز کسی کو قتل نہیں کرتے، اسے لے جا کر قید کر دو، اور کل دوپہر کو ہمارے سامنے لا کر اس کی گردن اڑا دو!"

جلاّد نے تلوار میان میں رکھ لی اور یہ قیدی اس وقت حوالۂ زنداں کر دیا گیا، اس کے چہرے پر گو نقاہت کے آثار تو تھے۔ لیکن سراسیمگی اور دہشت کے آثار ذرا بھی نہ تھے۔

---

(۹)

"تم نے ہمیں خرید لیا!"

بابر کے کئی بیٹے تھے، لیکن ہمایوں ان سب میں زیادہ لاڈلا اور چہیتا تھا اگر یہ کہا جائے کہ بابر ہمایوں پر جان دیتا تھا تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا۔ ولی عہد مملکت بھی وہی تھا، خود بابر اس کی توقیر، اور عزت افزائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا تھا۔

ہمایوں اس ملک میں نیا نیا پہنچا تھا۔ طبیعت مہم پسند تھی۔ اس نئے ملک کے ہر گوشے اور پہلو کو نگاہ غائر سے دیکھنے کا شوق،

جمعہ کی نماز کے بعد وہ چند دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ شکار کو نکل گیا۔ یہ وہی بیباکانہ ادا تھی جو اس کے دادا عمر شیخ مرزا اور باپ بابر میں موجود تھی۔

شکارگاہ میں پہنچ کر ان سب نے خوب خوب شکار کیا اور اس کام میں اتنے منہمک ہوئے کہ شام ہو گئی، سورج غروب ہو گیا، اور سائے جھلملانے لگے۔ شکار کے جوش میں یہ لوگ بہت آگے نکل گئے تھے، واپسی میں راستہ بھٹک گئے۔ اور تتر بتر ہو گئے۔ ہمایوں تنہا رہ گیا۔ جب ساتھیوں کے ملنے سے مایوس ہو گیا تو وہ تنہا اپنے اسپ سبک رفتار پر شہر کی طرف روانہ ہوا۔

ابھی شہر تک وہ نہیں پہنچا تھا کہ اس کا گزر ایک سنسان جنگل سے ہوا۔ گھوڑا بار بار بھڑکتا اور پیچھے ہٹتا تھا، لیکن وہ مہمیز لگا کر اسے آگے بڑھاتا، اتنے میں چار مسلح آدمی ایک جھاڑی سے نکلے اور اسے گھیر لیا۔

ہمایوں نے بغیر کسی دہشت اور سراسیمگی کے پوچھا:

"تم کون ہو؟ — کیا چاہتے ہو؟"

ان میں سے ایک نے جواب دیا:

"اگر تم مسلمان ہو تو ہم تمہیں قتل کریں گے اور اگر ہندو ہو تو صرف لوٹنے پر اکتفا کریں گے۔ اس کے بعد تم اپنی راہ، ہم اپنے رستے!"

پھر وہ سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے اتنے میں ایک آدمی کہنے لگا:

"ساتھیو! یہ مسلمان ہے، اور باہر سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ غالباً یہ بابر بادشاہ ہی ہے اسے مار لو، انعام بھی ملے گا رانا سانگا کے دربار سے اور یہ گھوڑا اور لباس، اور جو کچھ بھی اس کے پاس ہو وہ یاروں کا!"

رانا سانگا کا نام سن کر ہمایوں چونکا اس نے کہا:

"سپاہی بغیر لڑے ہوئے ہار نہیں مانتا آؤ دو دو ہاتھ ہو جائیں۔"

ان لوگوں نے جواب دیا "بڑے شوق سے — ہم بھی اور کیا چاہتے ہیں؟"

یہ کہتے کہتے ایک آدمی نے گھوڑے کے اگلے پیروں پر تلوار کی ایک کاری ضرب لگائی جس سے وہ گر پڑا اور اس کے ساتھ ہی ہمایوں بھی۔ اس کا پاؤں رکاب میں پھنسا ہوا تھا۔ ہر طرح سے مسلح ہونے کے باوجود وہ بالکل بے بس تھا۔

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان لوگوں نے خوشی کا نعرہ لگایا اور کہا:

"دیکھا مار لیا ہے۔"

لیکن ابھی ان لوگوں کی تلواریں فضا میں بلند نہیں ہوئی تھیں کہ جھاڑی سے ایک

سوار "اللہ اکبر" کا نعرہ بلند کرتا ہوا نکلا، اس نے للکارا،

"خبردار —"

اور پھر جھاڑی کی طرف دیکھ کر پکارا۔

"آؤ دوستو، جلد آؤ، یہ صرف چار ہی آدمی ہیں، اور ہم پورا ایک دستہ، قیمہ قیمہ کر دو ان بدمعاشوں کو!"

یہ کہہ کر وہ تلوار لہراتا ہوا بڑھا، لیکن وہ لوگ ہائے رام کہتے ہوئے بجلی کی سی سرعت سے بھاگ چکے تھے۔

وہ سپاہی ہمایوں کے پاس پہنچا، اس نے رکاب سے اس کا پھنسا ہوا پاؤں نکالا گھوڑے کے دونوں اگلے پاؤں کٹ چکے تھے وہ مر چکا تھا۔

ہمایوں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ممنون اور شکر گزار نظروں سے اس سپاہی کو دیکھا، اور کہا:

"اگر تم نہ آ گئے ہوتے تو واقعی ان لوگوں نے میرا کام تمام کر دیا ہوتا — لیکن تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟"

سپاہی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"خدا کے سوا کوئی ساتھی نہیں ہے!"

"لیکن تم آواز جو دے رہے تھے، وہ پورا دستہ جوان چار بدمعاشوں کو قتل کرنے کے لیے تم نے بلایا تھا کیا ہوا؟"

"یہ صرف ایک دھمکی تھی — اگر ان پر یہ ثابت ہو جاتا کہ میں اکیلا ہوں تو وہ مجھے بھی آپ کے ساتھ قتل کر دیتے، لیکن موقعہ پر سوجھ گئی اور وہ ڈر کر بھاگ گئے۔"

ہمایوں ہنسنے لگا "بڑے ہوشیار ہو بھائی تم تو —"

اتنے میں ایسا معلوم ہوا، جیسے کچھ سوار ادھر آ رہے ہیں، ہمایوں نے کہا شاید

میرے ساتھی آگئے، اتنے میں وہ بھی قریب آگئے ـــــ لیکن یہ ہمایوں کے ساتھی نہیں تھے۔ یہ بابر تھا، جو اپنے لختِ جگر کی تلاش میں خود اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ آگیا تھا۔

ہمایوں کو دیکھتے ہی وہ گھوڑے سے کودا، اور اسے کلیجے سے لگایا اور کہا:

"میرے بچے تم کہاں رہ گئے تھے ـــــ یہ کیا؟

بابر نے مرے ہوئے گھوڑے کی طرف دیکھ کر سخت اضطراب کے عالم میں سوال کیا۔

"یہ کیا ـــــ؟"

ہمایوں نے از اوّل تا آخر ساری داستان سنادی۔ بابر نے دانت پیستے ہوئے کہا

"رانا سانگا!"

پھر وہ خاموش ہوگیا اور یکایک اس نے اس سپاہی کی طرف رُخ کیا جس نے ہمایوں کی جان بچائی تھی، اسے بھینچ کر سینہ سے لگایا اور کہا:

"تم نے ہمیں خرید لیا؟"

وہ بولا "یہ میرا اسلامی اور انسانی فرض تھا!"

بابر نے تحسین آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور کہا:

ہماری نظر میں تمہاری منزلت اور بڑھ گئی کیا تم ابراہیم کے لشکر کے سپاہی ہو؟

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ بابر نے کہا:

"تم ہمارے ساتھ چلو، ہم تمہیں مالا مال کردیں گے، جو مانگو گے وہ پاؤ گے!

ـــــ تم نہیں جانتے ہمیں ہمایوں سے کتنی محبت ہے۔ تم نے اس کی نہیں ہماری جان بچائی ہے۔ ہم زندگی بھر تمہارے ممنون اور شکر گزار رہیں گے۔

---

(۱۰)

شورش

بابر اس سپاہی کو جس نے اپنا نام نعیم بتایا تھا، لے کر قصرِ شاہی میں ہمایوں کے ساتھ پہنچا، اور اسے ایک معزز مہمان کی حیثیت سے اپنے پاس ٹھہرایا۔

دوسرے روز صبح ہی صبح اسے شورشوں، بغاوتوں اور سازشوں کی اطلاعات اس کے مخبروں نے پہنچائیں، اسی اثنا میں وزیر حضوری حاضر ہوا، اور اس نے دست بستہ عرض کیا:

"قیدی احمد خاں کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

بابر نے جواب دیا "وہ قتل ہوگا۔ وہ گستاخ اور دریدہ دہن ہے، اسے ہم اپنے ہاتھ سے قتل کریں گے لیکن واپس آکر۔

بابر نے فیصلہ کرلیا کہ سب سے پہلے ان بغاوتوں اور شورشوں کو فرو کرنا چاہیے۔

نعیم نے جو اس کے پہلو میں بیٹھا تھا، عرض کیا:

"اس مہم میں غلام بھی ہمرکاب چلے گا اور جو خدمت ہوسکے گی بجالائے گا۔ کچھ نہ کرسکا تو جان قربان کردے گا!"

بابر نے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا:

"ضرور ضرور، اب ہمارا اور تمہارا زندگی بھر کا ساتھ ہے!"

بابر اب دہلی ہی کا نہیں بلکہ ہندوستان کا بادشاہ بن گیا تھا۔ خاندان لودھی بالکل تباہ ہوگیا تھا لیکن ہنوز دہلی کی پوری سلطنت پر قبضہ کرنا باقی تھا جو بہت پھیلی ہوئی تھی۔ پنجاب پر بابر کا قبضہ ہوگیا تھا۔ دہلی اور آگرہ بھی اس نے لے لیے تھے اور ان تمام مقامات پر اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی مگر دوسرے علاقوں میں سرکشی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر جگہ بابر کے خلاف لڑنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ راجے، مہاراجے اپنے اپنے قلعے مضبوط کر رہے تھے۔ لشکر جمع کیا جا رہا تھا۔ ہندوستانی رئیس اور حکمران نہیں چاہتے تھے کہ بابر ہندوستان میں قدم جمائے۔ سنبھل کے علاقے میں قاسم اپنی فوج جمع کر رہا تھا۔ بیانہ میں نظام خاں لڑائی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ راجہ حسن خاں میوات میں بابر سے لڑنے کا بندوبست کر رہا تھا۔ یہ شخص بابر کے مخالفوں کا سرغنہ تھا۔ قنوج اور گنگا پار کے علاقوں میں بعض پٹھان سردار برسرِ اقتدار تھے، وہ بھی بابر سے لڑنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

خود دہلی اور آگرہ میں بظاہر امن نظر آتا تھا، مگر لوگوں کو اپنے پرانے حاکموں سے ہمدردی تھی۔ بابر غیر ملک کا باشندہ تھا۔ اس کی زبان اور تھی۔ اس کے طور طریقے اور تھے۔ اس لیے لوگ فطرتاً بابر سے مانوس نہ ہوئے۔ ابراہیم لودھی کا بھائی تخت کا دعویٰ دار بنا بیٹھا تھا۔ آگرہ کے مشرقی اور جنوبی حصے بھی ابھی تک فتح نہ ہوئے تھے، اس لیے وہاں بھی سرکشی زوروں پر تھی۔ ہر چھوٹا بڑا رئیس بابر کے خلاف کارروائی کرنے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ بیانہ، دھول پور، گوالیار، کالپی وغیرہ مقامات پر قلعہ بندیاں شروع تھیں، بعض صوبے بابر سے لڑنے کے لیے کھلم کھلا آمادہ ہوگئے تھے۔

اُدھر بابر کی یہ حالت تھی کہ اس کی فوج تھک گئی تھی، انھیں وطن سے

آئے کافی مدت گزر چکی تھی اس لیے ہر سپاہی واپس جانے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ ہندوستان کے لوگ بابر کے لشکر سے الگ نفرت کا اظہار کرنے لگے تھے۔ جب بابر آگرہ پہنچا تو وہاں فوج کے لیے خوراک تھی نہ جانوروں کے لیے چارہ۔ دیہاتیوں نے چوری اور نقب زنی شروع کر رکھی تھی۔ راستے غیر محفوظ ہوگئے تھے۔ بابر کے سپاہی ترکستان کے سرد علاقوں کے رہنے والے تھے وہ ہندوستان کی گرمی اور لُو کے عادی نہ تھے۔ اب گرمی کا موسم شروع ہو چکا تھا وہ بہت زیادہ گھبرانے لگے۔ بابر کے لشکر کے پاس کافی روپیہ تھا جو بابر نے ان میں تقسیم کیا تھا، خود بابر کے پاس خزانے کی کمی نہ تھی، مگر لشکر کے خوف سے لوگ بھاگنے لگے تھے۔ اور رسد نہ ملتی تھی۔

ان حالات میں بابر نے حوصلے سے کام لیا اور سپاہیوں کے دل بڑھائے۔ اس نے تقریروں کے ذریعہ سے اپنی فوج کو جرات دلائی اور کہا کہ اتنی دور سے آکر ہم نے جو ملک فتح کیا ہے اسے یوں چھوڑ دینا حماقت ہے۔ تم حوصلہ نہ ہارو، خدا نے چاہا تو سارا ہندوستان تمہارے قدموں میں ہوگا۔ غرض اس کے سمجھانے سے بہت سے لوگوں نے کابل جانے کا ارادہ چھوڑ دیا اور لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

بابر کے بارے میں اہلِ ہند کا پہلے پہل یہ خیال تھا وہ مال و دولت لے کر اپنے ملک واپس چلا جائے گا مگر جب یہ معلوم ہوا کہ بابر مستقل طور پر ہندوستان میں رہنے کا ارادہ رکھتا ہے، تو وہ مایوس ہونے لگے۔ سب سے پہلے دوآب کے علاقے سے ایک افغان افسر تین ہزار فوج کے ہمراہ بابر کے پاس آیا اور اس کی اطاعت قبول کر لی۔ اسی طرح دوسرے افغان سردار اور رئیس جو ابراہیم لودھی کی فوج میں تھے اور ابراہیم کی شکست کے بعد مارے مارے پھر رہے تھے، بابر کے پاس جمع ہوگئے۔ بابر نے اُن کی بہت عزت کی، انھیں خلعت اور انعامات سے

مالامال کر دیا۔ بعض کو جاگیریں عطا کیں اور کسی کو نقد انعام دے کر خوش کیا یہ سب لوگ بابر کے مددگار بن گئے۔

بابر کے دشمنوں میں پٹھان اور میواتی سب سے پیش پیش تھے اور ہر ممکن طریقے سے اسے ہندوستان سے نکالنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے، مگر ان سے کہیں زبردست دشمن میواڑ کا راجہ رانا سنگرام سنگھ تھا، جو رانا سانگا کے نام سے مشہور رہے۔ چیتوڑ اس کی راجدھانی تھی۔ ہندوستان کے راجاؤں میں سب سے زیادہ بہادر اور طاقت ور سمجھا جاتا تھا۔ سارے راجپوتانہ میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ مارواڑ، اجمیر، گوالیار وغیرہ کے راجہ اس سے خم کھاتے تھے اور اس کی دوستی کا دم بھرتے تھے۔ اس میں بابر کی طرح جنگی خوبیاں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ بعض اپنی مہارت جنگ کے باعث اس نے بہت سے علاقے اپنی عملداری میں شامل کر رکھے تھے۔ چندیری اور رنتھنبور کے مشہور قلعے بھی اس کے قبضے میں تھے۔ دو دفعہ ابراہیم لودھی سے لڑ چکا تھا اور اس کا جانی دشمن تھا۔ اس کے پاس اسی ہزار شاہسوار، پانچ سو جنگی ہاتھی، ایک سو راجپوت سردار اس کے ساتھ سات بڑے بڑے راجا بھی تھے۔ میدان کا دھنی تھا۔ جنگ جوئی اور بہادری میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ مختلف لڑائیوں میں اس کے جسم پر جو زخم لگے تھے ان کے اسی نشان موجود تھے لڑائی میں ایک آنکھ بھی ضائع کر چکا تھا۔ ابراہیم لودھی کے خلاف لڑائی میں ایک بازو بھی ضایع ہو گیا۔ توپ کا گولہ لگنے سے ایک ٹانگ بھی خراب ہو گئی تھی، مگر ان تمام باتوں کے باوجود ہمیشہ لڑائی کے لیے بے تاب رہتا تھا۔ اس کی بہادری اور اس کے جوش و خروش میں ذرا فرق نہ آیا تھا۔

ابراہیم سے اس کی ہمیشہ ان بن رہی، اسی ان بن کے نتیجہ میں اس سے لڑائیاں بھی کیں مگر اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ چنانچہ جس زمانے میں بابر کابل میں تھا اور ابراہیم

دہلی کے تخت پر متمکن تھا۔ سنگرام سنگھ نے بابر کے پاس آدمی بھیج کر اس سے ساز باز کی تھی کہ اگر تم دہلی پر چڑھائی کرو تو میں آگرہ پر حملہ کر دوں گا۔ تم دہلی کی سلطنت سنبھال لینا اور مجھے اس مدد کے صلہ میں آگرہ، کالپی، بیانہ اور دھولپور کے علاقے دے دینا۔

لیکن جب وقت آیا، اور بابر نے ہند پر چڑھائی کی تو رانا سانگا نے ذرا مدد نہ کی، بلکہ بابر کے مفتوحہ علاقوں پر دست درازی شروع کر دی اور آج اسے اطلاع ملی تھی کہ اس نے بیانہ پر حملہ کر دیا ہے اور کل رات کو معلوم ہو چکا تھا، کہ بابر پر حملہ کرنے والے بھی اس کے آدمی تھے۔

لہٰذا اس نے آخری وار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

---

(۱۱)

جنگ کنواہا

کنواہا کا معرکہ آخری معرکہ تھا، بابر پوری تیاری کے ساتھ اس مہم کو سر کرنے کے لیے نکلا۔

نعیم خاں اس مہم میں اس کے ساتھ تھا۔

سنگرام سنگھ مدت سے بابر کے خلاف منصوبے بنا رہا تھا۔ پانی پت کی لڑائی کے بعد جب سنگرام سنگھ نے دیکھا کہ بابر واپس نہیں جاتا بلکہ ہندوستان میں قدم جمانا چاہتا ہے تو اس وقت سے وہ اسے ہندوستان سے نکالنے کی فکر میں تھا۔ ابراہیم لودھی کے مرنے کے بعد پٹھانوں نے اس کے بھائی سلطان محمود لودھی کو اپنا حاکم بنا لیا تھا۔ سنگرام سنگھ اُسے دہلی کا بادشاہ تسلیم کرتا تھا۔ اور اسے ساتھ ملا لیا تھا پھر حسن خاں میواتی کو بھی اس نے پیغام بھیج دیا تھا کہ مغلوں نے ابراہیم کو قتل کر دیا ہے اور ہمارے ملک پر قابض ہو گئے ہیں۔ میرے اور تمہارے دونوں کے لیے خطرہ ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دیں اور بابر کے خلاف لڑیں۔ ہم دونوں مل کر لڑیں گے تو بابر کو یقیناً شکست ہوگی اور ہم مغلوں کو ملک سے نکال باہر کریں گے۔

حسن خاں کا بیٹا پانی پت کی لڑائی میں بابر کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ بابر کے دشمن کا بیٹا تھا مگر اس کے باوجود بابر نے اسے رہا کر دیا تھا۔ اس احسان کا بدلہ احسان سے دینے کے بجائے حسن خاں نے بابر کے دشمن سے ساز باز کر لی۔ بابر کے لیے یہ باتیں بہت تکلیف دہ تھیں۔ چنانچہ اس نے سنگرام سنگھ اور حسن خاں دونوں کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

آخر بابر نے سنگرام سنگھ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور لشکر لے کر آگرے سے روانہ ہوا۔ سیکری کے میدان میں ڈیرے جمائے اور لڑائی کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔

بابری فوج کے دل بیٹھے ہوئے تھے وہ مایوسی اور بے چینی کا شکار ہو رہی تھی ان میں پہلے جیسا جوش و خروش اور ولولہ باقی نہ رہا تھا اُن کے مقابلہ میں سنگرام کے گرد بہت بڑا لشکر اکٹھا ہو گیا تھا۔ ہر سپاہی جوش سے بھرا ہوا تھا۔ مغلوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے انھوں نے قسمیں کھائی تھیں۔ راجہ سلہری راؤ اور راجہ میدنی راؤ بھی بیالیس ہزار کا لشکر لے کر سنگرام کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ دوسرے راجپوت سردار بھی ہزاروں کا لشکر لے کر ان سے آملے تھے۔ حسن خاں میواتی کے ساتھ بارہ ہزار آدمی تھے، وہ بھی پہنچ گیا تھا۔ محمود لودھی بھی دس ہزار سوار لے کر سنگرام کی مدد کو آگیا۔ غرض بابر کے خلاف دو لاکھ کا ٹڈی دل کیل کانٹے سے لیس کھڑا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بابر کے لشکر کا صفایا ہو جائے گا۔

بابر کے خلاف ایک تو لشکر کی کثرت تھی دوسرے یہ کہ راجپوت بے حد لڑاکا اور جانباز تھے۔ ان کی بہادری اور بے جگری کے قصے بابر کے سپاہیوں نے بھی سُنے تھے، اس لیے قدرتی طور پر بابر کے سپاہی ہراساں نظر آتے تھے۔

بابر کا لشکر کنواہہ کے میدان میں پہنچ گیا۔ دشمن کا ٹڈی دل بھی آ کر جمع ہو گیا۔ بابر نے لشکر کے ایک حصے کو بڑھ کر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ پہلا حملہ نہ صرف ناکام رہا، بلکہ

دشمن نے اُسے بُری طرح شکست دی، جس سے باقی فوج کے حوصلے پست ہو گئے۔ انھیں اپنی شکست کا یقین ہو گیا، چنانچہ دل چھوڑ دیا۔ بابر کی عمر فوجوں کو لڑانے میں گزری تھی۔ بڑا باتدبیر اور باحوصلہ شخص تھا۔ اپنی فوج کی پریشانی دیکھ کر مطلق نہ گھبرایا۔ ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، بہادرو! ہم پر اس وقت جو نحوست طاری ہے اس کا سبب میرے گناہ ہیں۔ گناہوں ہی کی وجہ سے اللہ تعالےٰ کی مدد اور فتح ہم سے دُور ہو گئی ہے۔ اللہ تعالےٰ ہم سے ناراض ہو گیا ہے۔ آؤ ہم اسے راضی کر لیں اس لیے کہ وہی اپنے بندوں کی پناہ گاہ اور ان کا مددگار ہے۔ میرے دوستو! جو کوئی پیدا ہوا ہے اسے ایک نہ ایک دن ناچیز ہونا ہے۔ اس دنیا کی سرائے میں جس نے بھی قدم رکھا ہے، اسے موت کا مزا ضرور چکھنا ہے پھر بے عزتی کی زندگی سے عزت کا مرنا بہتر ہے۔ ہم کس منہ سے اللہ تعالےٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کریں اس نے ہم مسلمانوں کو یہ سعادت بخشی ہے کہ اگر ہم جہاد میں مارے جائیں تو شہید ہوں گے، جنت کے دروازے ہمارے لیے کھول دیے جائیں گے۔ خدا کے فرشتے وہاں ہمارے استقبال کے لیے کھڑے ہوں گے اور اگر ہم جیت گئے اور زندہ بچ رہے تو ھندا کی زمین کے وارث ہوں گے۔ اُس کی نعمتوں سے اپنا دامن بھر لیں گے دنیا میں سرخرو ہو کر جئیں گے اور غازی کہلائیں گے۔ اس لیے آؤ ہم اللہ سے عہد کریں کہ ایسی موت سے کبھی منہ نہ موڑیں گے، لڑائی کی شدت اور دشمن کے دباؤ سے کبھی نہ ڈریں گے۔ یقین رکھو خدائی مدد ہمارے ساتھ ہو گی۔

اس ولولہ انگیز تقریر نے سپاہیوں کے دلوں کو ایک بار پھر گرما دیا۔ جوش جہاد سے سرشار ہو کر دشمن کے خلاف ڈٹ گئے۔

دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلہ پر آئیں۔ بابر کا لشکر سولہ سترہ ہزار سے زیادہ نہ تھا۔ فوج کے آگے آگے گاڑیاں بندھی ہوئی تھیں ان کے پیچھے بندوقچی

اور توپچی تھے۔ بھاری توپیں سب کے آگے تھیں جن کا افسر استاد علی تھا۔

سنگرام بڑے کروفر سے میدان میں آیا۔ وہ اپنے دو لاکھ کے لشکر پر مغرور ہو گیا تھا اور بابر کے سولہ ہزار کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ایک ایک مغل سپاہی کے مقابلہ میں سات آٹھ بہادر اور لڑاکا راجپوت تھے۔ بے شک سنگرام کی قوت زیادہ تھی، مگر بابر کے سپاہی بھی اب سر سے کفن باندھ کر نکلے تھے، اُن کے دلوں میں جہاد اور جوش ایمانی کا ولولہ تھا۔

صبح نو بجے کے قریب میدان کارزار گرم ہوا طرفین میں سے ہر شخص نے خوب دادِ مردانگی دی۔ بابر کے بندوقچیوں اور توپچیوں کی آتش باری نے راجپوتوں کو بھون کر رکھ دیا۔ ان کی آبدار تلواروں نے راجپوتوں کو خون میں نہلانا شروع کر دیا۔ لیکن راجپوتوں کی بے جگری اور لاکھوں کے ریلے کے سامنے مغلوں کی بھی پیش نہ جاتی تھی۔ نہ راجپوت میدان چھوڑنا چاہتے تھے نہ مغل جہاد سے منہ موڑنا چاہتے تھے نہ ایک فوج کو شکست ہوتی تھی نہ دوسری غالب آتی تھی۔ ہر دفعہ فریقین کو یہی احساس ہوتا تھا کہ اب دشمن کو زیر کر لیا مگر جلد ہی زیر ہونے والے کا غلبہ ہو جاتا اور لڑائی اور زیادہ گرم ہو جاتی۔

شام تک لڑائی نے کئی پہلو بدلے۔ دست بدست لڑائی تک نوبت پہنچ گئی، اور چونکہ اب شام قریب آنے کو تھی اس لیے ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ گھمسان کی لڑائی ہو کر جلد فیصلہ ہو۔ ایک طرف سے "اللہ اکبر" کے نعروں کی صدا آ رہی تھی تو دوسری طرف سے "ہر ہر مہادیو" کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

راجپوتوں نے بابر کے دائیں بازو پر زور شور سے حملہ کیا۔ بابر نے اس بازو کے لیے فوراً امدادی لشکر بھیج دیا۔ افسر توپ خانہ نے فوج کے دائیں طرف سے گولہ باری شروع کر دی، مگر راجپوتوں نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور نہایت ثابت قدمی سے

لڑائی میں مشغول رہے، جس کے باعث بابر کو امداد کے لیے اور فوج بھیجنا پڑی۔ بائیں بازو پر بھی راجپوت غضب ڈھانے لگے تھے۔ بابر نے ادھر بھی سپاہی جھونک دیئے اس طرح لڑائی اور شدت اختیار کر گئی۔

جب کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا اور شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو بابر نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ ہر طرف سے سمٹ کر دشمن پر یکبارگی حملہ کر دیا جائے۔ اب سب سے آگے پیدل فوج تھی۔ ان کے پیچھے توپ خانہ اور سوار۔ سب نے یکدم دشمن کے قلب پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اس قدر سخت تھا کہ راجپوت سنبھل نہ سکے۔ ان کے قدم اکھڑنے لگے "ہر ہر مہادیو" کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ راجپوت بُری طرح قتل ہونے لگے ان میں بھاگڑ مچ گئی۔ پسپا ہو کر بھاگ نکلے۔ مغلوں نے تعاقب کیا۔ میدان لاشوں سے بھر گیا۔

حسن خاں میواتی بھی مارا گیا۔ راول اودے سنگھ جیسا جنگجو راجہ بھی فنا کے گھاٹ اترا۔ بہت سے دوسرے راجپوت راجہ اور سردار مارے گئے۔ البتہ سنگرام سنگھ جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

بابر کی یہ نہایت عظیم الشان فتح تھی اس فتح نے اسے ہندوستان کی شہنشاہیت کا تاج پہنا دیا۔ اس موقع پر اس نے غازی کا لقب اختیار کیا۔ اس نے اپنے بڑے بڑے سرکش دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ اب کوئی اس کا مد مقابل باقی نہ رہا تھا۔ سنگرام سنگھ بھاگنے کے بعد ایک قلعے میں جا چھپا تھا، لیکن دہشت سے نیم جاں۔

---

(۱۲)

عائشہ .....

اب ساری دشواریاں ختم ہو چکی تھیں!

اب بابر غازی کا لقب اختیار کر چکا تھا، اور سارا ہندوستان اس کے زیر نگیں تھا۔ اس نے ایک عظیم الشان جشن فتح منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ جشن شروع ہونے سے ایک دن پہلے، اس نے احمد خاں کو وزیر حضوری کی تحریک پر اپنے روبرو طلب کیا، تاکہ حسب اعلان اپنے ہاتھ سے اس کا سر تن سے جدا کر دے۔ نعیم خاں اس کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔

احمد خاں پابجولاں لایا گیا لیکن اس کے دم خم میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا، بابر نے اسے دیکھا اور گرجتی ہوئی آواز میں کہا:

"تیار ہو جاؤ مرنے کے لیے!"

احمد خاں نے بے خوفی کے ساتھ جواب دیا:

"جس طرح موت سے ڈرنا بزدلی ہے، اسی طرح کسی کو بار بار موت سے ڈرانا بھی بزدلی ہے!"

بابر کی برہمی نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ اس نے کہا:

"گستاخ، ــــ تم نے ہمیں بزدل کہا؟ ــــ

احمد خاں نے کڑے تیور کے ساتھ جواب دیا۔

"جو شخص ایک مجبور، بے بس، پابہ جولاں اور زخمی قیدی کو ڈرائے دھمکائے وہ ضرور بزدل ہے ــــ ورنہ بہادری کا فیصلہ تلوار سے اب بھی ہو سکتا ہے۔

بابر تن کر کھڑا ہو گیا، وہ تخت سے اتر پڑا اس نے کہا:

"تم ہم سے لڑنا چاہتے ہو؟"

احمد خاں نے تن کر جواب دیا،

"اگر آپ موقعہ دیں!"

بابر سے ضبط نہ ہو سکا اس نے نعیم خاں کی تلوار چھین کر احمد خاں کی طرف پھینک دی اور خود تلوار سونتتے ہوئے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم بہادر ہو، ہمارے دل میں تمہاری بہادری کی قدر ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم بزدلوں کی طرح مرو، آؤ، حملہ کرو، ہم میں سے جو بھی مرے گا وہ بہادری کی موت مرے گا۔"

حاضرین دم بخود تھے، سارے محل پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر شخص کی اندر کی سانس اندر، باہر کی سانس باہر،

اتنے میں نعیم خاں اٹھا اور بابر اور احمد خاں کے درمیان آ کر حائل ہو گیا۔ اس نے اگر بھائیوں کی جان نہ بچائی ہوتی۔ اگر جنگ کنز اہا میں شجاعت کے لازوال کارنامے نہ انجام دیئے ہوتے تو شاید بابر نے اسے ڈھیر کر دیا ہوتا لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ حیرت آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگا اس نے کہا:

"اسے بخش دیجئے ــــ آپ مجھ سے وعدہ کر چکے ہیں کہ جو مانگوں گا پاؤں گا مجھے مال و زر نہیں چاہئے۔ عزت اور منصب نہیں چاہئے۔ انعام و اکرام نہیں چاہئے جائداد اور جاگیر نہیں چاہئے ــــ مجھے یہ قیدی بخش دیجئے۔"

بابر نے متحیر ہو کر نعیم خاں کی طرف دیکھا اور سوال کیا:

"لیکن تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟"

نعیم خاں نے پگڑی اتار کر ایک طرف پھینک دی،

ایک مجسمۂ حسن و جمال اور پیکر رعنائی و زیبائی اس کے سامنے کھڑا تھا!

بابر نے ہکلاتے ہوئے کہا:

"تم ــــ تم عورت ــــ کون ہو تم؟"

اور قبل اس کے کہ عورت جواب میں کچھ کہے، بے ساختہ احمد خاں کے منہ سے نکلا ــــ

"عائشہ ــــ"

(۱۳)

یومِ مسرّت

حیرت پر حیرت ، اچنبھے پر اچنبھا ، آج یہ کیا ہو رہا تھا ؟
عائشہ اور احمد خاں کی ساری داستان بابر کے علم میں آگئی ، اس نے بڑے غور اور توجہ سے یہ کہانی سنی پھر اس نے تحسین آمیز نظروں سے عائشہ کو دیکھتے ہوئے کہا :

" کمال کر دیا بیٹی تو نے ـــــ اسے کہتے ہیں حق وفا ، تو نے ثابت کر دیا کہ ایک محبت کرنے والی بیوی اپنے شوہر کے لیے ، کیا نہیں کر سکتی ؟ بڑے سے بڑے خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکتی ہے ، بلکہ (مسکراتے ہوئے) مرد بن کر مقابلہ کر سکتی ہے ، تیری خاطر سے میں احمد خاں کو معاف کرتا ہوں ، میرے دل میں اس کے اخلاص ، صداقت ، غیر متزلزل وفاداری کی بے انتہا قدر ہے ، وہ اگر میرے رفیقوں میں شامل ہو جائے تو میں اسے بڑے سے بڑا منصب اور اعزاز دینے کو تیار ہوں !"

اور پھر دفعتہً وہ آگے بڑھا ، اس نے احمد خاں کو گلے سے لگا لیا اور کہنے لگا۔

" تم نہیں ـــ میں دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں تمہاری طرف ، ایک بہادر ،

ایک بہادر سے پیمانِ وفا باندھنا چاہتا ہے ۔ کیا تم اسے ٹھکرا دو گے ؟"

احمد خاں نے کوئی جواب نہیں دیا ، بابر نے کہا ،

" تم بھی مسلمان ہو ، میں بھی مسلمان ہوں ، تم سے ایک سوال کرتا ہوں بتاؤ تمھیں اسلام عزیز ہے یا کوئی فرد ؟ کوئی شخص یا کوئی خاندان ؟"

احمد خاں نے برجستہ جواب میں کہا :-

" اسلام "

بابر نے تحسین آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا :-

" شاباش میرے عزیز شاباش مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی ، اگر اسلام سچّا مذہب ہے ، اور ہم سچّے دل سے اسے مانتے ہیں ، تو ہر چیز اس پر قربان کرنے کو تیار رہنا چاہیئے ۔ حتیٰ کہ اپنی جان بھی ، اپنی محبوب سے محبوب چیز بھی ، کیا میں غلط کہتا ہوں ؟"

احمد خاں نے جواب دیا :-

" آپ نے بجا ارشاد فرمایا !"

بابر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا :-

" پھر تمہاری پہلی اور آخری وفاداری اسلام اور صرف اسلام کے ساتھ ہونی چاہیئے "

احمد خاں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بابر نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا ۔

میں نے کابل میں بیٹھ کر ہندوستان کے حالات کا اندازہ لگا لیا تھا ، لودھی خاندان اپنی عمر ختم کر چکا تھا ، ابراہیم خود غرض تھا ، عیاش تھا ، نہ وہ اُمورِ مملکت سے دلچسپی لیتا تھا ، نہ فنِ سیاست سے واقف

تھا، میواڑ کا رانا سانگا ایک اُبھرتی ہوئی طاقت بن کر میدان میں آیا تھا، ابراہیم میرے ہاتھ سے نہ مارا جاتا، تو ہندوستان کے رجواڑے رانا سانگا کی سربراہی میں اسے قتل کر ڈالتے، اور اس کا قتل ہوتے ہی اس دیس میں اسلام کی حکومت ختم ہو جاتی۔ میں نے ابراہیم کو قتل کر کے ہندوستان میں اسلام کا پرچم ایک مرتبہ پھر بلند کر دیا ہے، میں نے صرف ابراہیم کو ختم نہیں کیا، تمام مطلب پرستوں اور غدّاروں کو ختم کر دیا ہے، میں نے رانا سانگا کی کمر توڑ دی ہے۔

ہندو راجاؤں کو دہشت زدہ کر دیا ہے، میں اس لئے یہاں نہیں آیا ہوں کہ واپس چلا جاؤں، اس لئے آیا ہوں کہ یہاں رہوں، اور اس سرزمین کے چپّے چپّے پر اسلام کا جھنڈا لہرا دوں۔

احمد خاں حیرت سے بابر کی طرف دیکھ رہا تھا،

اور بابر ایک عجیب کیفیت کے عالم میں کہہ رہا تھا:۔

"میرے عزیز!

میں چاہتا ہوں تم مجھے پرکھو، آزماؤ، امتحان لو میرا، اگر کبھی میں نے غلط گوئی سے کام لیا ہے تو پھر میرے دُشمن بن جانا۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہ ہوگی، اور یہ دیکھو کہ قول کا دھنی ہوں،

جو کہا تھا کر رہا ہوں، تو میرے ساتھ

اسلام پر

مر مٹنے کے لئے تیار ہو جاؤ!

احمد خاں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:۔

"آپ نے میری آنکھیں کھول دیں، میں دل و جان سے آپ کے ساتھ ہوں!"

(۱۴)

نیا دَور

بابر نہ تھکنا جانتا تھا، نہ آرام کرنا، خطرات کو دعوت دینا اس کی عادت تھی، وسائل و ذرائع کو اس نے کبھی کوئی اہمیت نہیں دی، اس کی قوتِ ارادی خود ہی اس کے لئے وسائل و ذرائع مہیّا کر دیتی تھی، اس کا عزم محکم مشکلات و موانع کو اس طرح ختم کر دیتا تھا جیسے ان کی حیثیت پرِ کاہ کے برابر بھی نہ تھی۔

بابر نے ہندوستان کی حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بہت ہی مختصر مدت میں اس کی کایا پلٹ دی، اس نے تخریب و تعمیر کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری رکھا۔

ایک طرف اس نے دشمنوں کا قلع قمع کیا، بڑی بڑی فوجوں کو شکست دی، میدان جنگ کو دُشمن کے خون سے لالہ زار بنا دیا، سازش کرنے والوں، غدّاروں، اور مفاد پرستوں کا صفایا کیا، سازش کے مرکزوں پر دھاوا بولا اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

دُوسری طرف، اس نے باغات لگائے، نہریں نکالیں، شان دار عمارتوں کی داغ بیل ڈالی، رعایا کے لئے ضروریات زندگی زیادہ سے زیادہ

ارزاں کر دیں، ظالم کو ہمیشہ کچلا، اور مظلوم کی دادرسی میں ذرا کوتاہی نہ کی ہندوؤں کی دل جوئی کی، جو وفادار تھے، انہیں عہدے دئے، مناصب سے نوازا، نظام حکومت اس درجہ مستحکم اور استوار کر دیا کہ کسی طاقتور سے طاقتور دُشمن کو سر اُٹھانے کا یارا نہ رہا۔

گل خاں جو ابراہیم لودھی کی طرف سے قلعہ کی حفاظت پر مامور تھا مدافعت کرتا ہوا سخت زخمی ہو گیا تھا، احمد خاں کی سفارش پر بابر نے اسے بھی معاف کر دیا، اور دونوں کو نہ صرف جاگیریں دیں بلکہ اعلیٰ فوجی مناصب سے سرفراز کیا۔ بلکہ اپنا مقرب خاص اور مشیر با تدبیر بنا لیا۔ کوئی اہم معاملہ ایسا نہیں تھا، جس پر ان دونوں سے مشورہ لئے بغیر وہ کوئی اقدام کرتا۔

احمد خاں اب ایک بچہ کا باپ بن چکا تھا، آج رسم عقیقہ انجام دی جا رہی تھی، بابر ہمایوں اور اپنے سپہ سالار افواج دولت خاں کو ساتھ لے کر آیا اور بہ نفسِ نفیس اس تقریب میں شرکت کی، بابر کے چلے جانے کے بعد احمد خاں سے گل خاں نے کہا:-

" واقعی ہم لوگوں نے کتنا غلط سمجھا تھا، اس شخص کو، اگر یہ نہ آتا، تو آج ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت کیا ہوتی، کیا وہ بالکل مٹ نہ گئے ہوتے؟

احمد خاں نے جواب دیا،

" اس میں کیا شبہ ہے"۔

اتنے میں، سمیّہ آ گئی، اس نے مُسکراتے ہوئے کہا،

" میں نے سُن لیا "

گل خاں نے سوال کیا،
"کیا سُن لیا؟"
"وہی جو آپ لوگوں میں باتیں ہو رہی تھیں"
"ہم تمہارے خلاف تو کچھ نہیں کہہ رہے تھے!"
مسکراتی ہوئی بولی۔
"میرے خلاف آپ کہہ بھی کیا سکتے ہیں؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ دونوں اور خاص طور پر احمد بھائی ہیں بڑے احسان فراموش، ——!"

احمد خاں یہ سُن کر چونک پڑا،
اس نے کہا،
"سمیّہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"
وہ بولی،
"تو کیا جھوٹ ہے کچھ؟"
"لیکن وہ سچ کیا ہے؟ معلوم بھی تو ہو؟"
سمیّہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا،
"اگر عائشہ نے نعیم کا روپ بھر کر شہزادہ ہمایوں کی جان نہ بچائی ہوتی، اور شہنشاہ بابر کو ممنون کرم نہ کر لیا ہوتا، تو آپ کہاں ہوتے آج —؟"
احمد خاں نے مسکراتے ہوئے کہا،
"قبر میں"
سمیّہ کہنے لگی،

"اور یہ کچھ جھوٹ بھی نہیں ہے کہ یہی حشر ان کا (گل خاں کا) بھی ہوتا"
گل خاں نے کہا،
"بے شک، —— لیکن کون سی احسان فراموشی احمد سے یا مجھ سے ہوئی یہ بھی تو بتاؤ"!
وہ رہی،
"اب اس سے بڑھ کر کیا ہو گا، آپ دونوں میں سے کسی نے جھوٹے منہ اس کا شکریہ بھی تو ادا نہیں کیا، آج تک اتنی مدّت گزرنے کے باوجود"!
گل خاں اور احمد خاں کو ہنسی آگئی، دونوں نے یک زبان ہو کر کہا،
"ہاں یعنی یہ تو بڑی بھاری غلطی ہو گئی، پھر اب تدارک کی کیا تدبیر ہے"؟
"کچھ نہیں، —— آج باتوں باتوں میں یہ بات چل پڑی، تو وہ کہنے لگی بڑے ناشکرے ہیں، یہ دونوں، اب زندگی بھر نہ احمد کی صورت دیکھوں گی نہ گل خاں سے بات کروں گی"
احمد خاں نے کچھ پریشان ہوتے ہوئے کہا۔
"واقعی، —— سچ کہہ رہی ہو تم؟"
وہ بولی،
"چلئے حضور اسی سے پُوچھ لیجئے چل کر"؟
گل خاں اور احمد خاں دونوں سمیّہ کے ساتھ عائشہ کے کمرے میں پہونچے، وہ اپنے بچہ کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اور اس سے کھیل

رہی تھی،

سمیّہ نے کہا،

"دیکھو عائشہ دونوں ناشکرے معافی مانگنے آئے ہیں، مگر خبردار معاف نہ کرنا!"

عائشہ مسکرانے لگی، اس نے کہا،

"بڑی نٹ کھٹ ہو تم بھی معافی کس بات کی منگوا رہی ہو ان سے"

احمد خاں نے ساری داستان سُنائی، تو اس نے سمیّہ کی پیٹھ پر ایک دھتّڑ لگایا، اور

"واہ بی جاؤ خود ہی مجھے بھڑکا رہی ہو کئی دن سے"

سمیّہ نے مُنہ بنا کر کہا،

"اچھا بھائی بجائے اس کے کہ یہ دونوں تم سے معافی مانگیں تم ہی ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو جاتیں ان کے سامنے، ہم نے تو تمہاری عزّت افزائی کی ایک ترکیب سوچی تھی مگر تم ٹھہریں ایک بودم!"

احمد خاں اُٹھ کھڑا ہوا، اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا:

"بھئی ہم تم سے معافی چاہتے ہیں، لیکن خدا کے لئے عائشہ کی عزّت افزائی کا خیال اب دل میں نہ لانا، اگر تم نے کبھی اسے خفا کر دیا تو پھر واقعی میری جگہ گوشۂ قبر کے سوا کہیں نہیں ہوگی"

عائشہ نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

بس،

میں ایسی باتیں سُننے کی طاقت نہیں رکھتی!

YOUSUF LIBRARY
Lal chand Bagh Sir syed
Road Mirpurkhas 69000
PH: 0233 - 872316